سیستان
حصہ دوم
مصنف
جی-پی-ٹیٹ
ترجمہ
پروفیسر ایم انور رومان

سیستان دریائے ہلمند کی کارگاہ ہے جس کی سرسبزی و زرخیزی اسی کی آوردہ ہے۔ اسی کے کناروں پر یہاں کی تہذیب و ثقافت نے آنکھیں کھولیں اور انہی پر یہاں کے عظیم الشان شہر آباد ہوئے۔

لیکن سیستان ہلمند کی جولانگاہ اور آماجگاہ بھی ہے۔ ہلمند اس کے اطراف و اکناف میں کھلے بندوں گھومتا پھرتا رہا ہے اور اس کے قرای و مدائن کو اپنی لپیٹ میں لیتا رہا ہے۔

جب سیستان کا انسان خود متحد و مستحکم ہوتا تھا تو ہلمند اُس کے حکم کا پابند ہوتا تھا لیکن جب یہ انسان سیاسی عدمِ استحکام کا شکار ہوتا، یا باہمی چپقلشوں میں اُلجھ جاتا، یا چنگیز خان، امیر تیمور اور نادر شاہ کے گرداب میں پھنس جاتا تو ہلمند بھی من مانی پر اُتر آتا۔

انسان اور دریا کی یہ کشمکش اس کتاب کا خاص موضوع ہے۔ چونکہ بلوچستان اور سیستان ایک دُوسرے سے ملحق ہیں اور ان کے طبعی خد و خال بھی جُزوی اختلافات کے باوجُود ایک جیسے ہیں لہٰذا ان میں آباد قدیم و موجُودہ اِنسانی جمعیتیں بھی ایک ہی ہیں یعنی تاجیک، بلوچ، جاٹ وغیرہ۔ اسی لئے یہ کتاب بلوچستان اور بلوچوں پر بھی روشنی ڈالتی ہے جو گو ضمنی ہے تاہم انتہائی حقیقت کُشا اور تاریخ نما ہے۔ لہٰذا یہ کتاب بلوچستانیات میں بھی ایک گرانقدر اضافہ ہے!

اسے جی پی ٹیٹ نے تحریر کیا جو ایک مشن کے ساتھ بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں سیستان گیا تھا۔ اسی کا اُردو ترجمہ پروفیسر ایم انور رومان نے کیا ہے۔

عابد بخاری

حصّہ دوم

سیستان

تاریخ، جغرافیائی خدوخال، آثارِ قدیمہ اور باشندوں کا تذکرہ
حصّہ سوم ۔ حصّہ چہارم

مصنّف : مسٹر جی پی ٹیٹ ۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس، ایف۔ آر۔ جی۔ ایس
سروے آف انڈیا۔ اور مصنف قلات۔ احمدزئی خوانین قلات کے
خاندان اور ملک کا تذکرہ۔

ترجمہ : پروفیسر ایم انور رُومان
ڈائرکٹر بیورو آف کریکولم۔
بلوچستان

نساء ٹریڈرز
۷۔ جناح کلاتھ مارکیٹ۔ کوئٹہ
فون :- ۷۴۶۸۱

طابع ـــــــ عابد بخاری
مطبع ـــــــ علی پرنٹرز، پیسہ اخبار، لاہور
طبع اوّل ـــــــ اپریل ۱۹۸۰ء
تعداد ـــــــ ۱۵۰ جلدیں
قیمت ـــــــ دوسو روپے (مکمّل دو جلدوں میں)
کتابت ـــــــ اے ایس ممتاز

اصل کتاب:

"SIESTAN —— A MEMOIR ON THE HISTORY, TOPOGRAPHY, RUINS AND PEOPLE OF THE COUNTRY."

کے نام سے جی پی ٹیٹ نے تحریر کی جس کی اوّل اشاعت ۱۹۱۰ء میں ہُوئی۔ اُردو ترجمہ پروفیسر ایم انور رُومان نے کیا۔

اشاعتی ادارہ :- نساء ٹریڈرز - ۷ جناح کلاتھ مارکیٹ۔ کوئٹہ (پاکستان)
فون : ۷۴۶۸۱
تقسیم کار : میسرز گوشۂ ادب، سرکلر روڈ۔ کوئٹہ (پاکستان)
فون : ۷۵۰۰۲

مندرجات

حصّہ سوم

سیستان کے آثارِ قدیمہ

سیستان کے آثارِ قدیمہ

بابِ اوّل

تعارف

ماخذِ معلومات

اس حصّہ کے موضوع کے لئے ہمارا دارومدار سراسر روایات پر ہے۔ اگرچہ یہ مبہم ہیں تاہم بہ بعض حقائق کی امانتدار ہیں اور دوسری معلومات کے فقدان کے باعث انہیں نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ تاریخ کی دستیاب معلومات کی دُھندلی سی روشنی میں ان سے استفادہ کیا جائے۔

ارباب سیف الدّین:۔

۱۹۰۵ میں سیستان میں صرف دو اصحاب حیات تھے جو ملک کی تاریخ ماضیہ کے سلسلہ میں روایات سے کچھ واقف تھے۔ ان میں سرفہرست ارباب سیف الدّین ہیں جو ایک قدیم خاندان کے چشم وچراغ ہیں جس کے افراد کیانی حکمرانوں کے وزراء اور عمّال معتمد رہے سلطنت افغانستان کے بانی احمد شاہ ابدالی کے دور تک امیر سیف الدّین کے بزرگ یسادل کے عہدہ پر متمکن تھے، ایک ایسا عہدہ جس کی تعریف کرنا آسان نہیں ہے۔ یہ شخص ضلع گرم سیر کی زمینوں کا منتظم تھا جو قلعہ بست یا اس کے پاس سے شروع ہوتی تھیں اور ہلمند کے ڈیلٹا کے دہانہ تک

پھیلی ہوئی تھیں - ایک شاہی فرمان ابتک موجود ہے اور ۱۹۰۴ میں زیر معائنہ آیا - ارباب سیف الدین بھی اپنے والد کے ہمراہ قندھار گئے، جب ہماری فوجوں نے ۱۸۳۹ میں اس پر قبضہ کر لیا - ارباب سے ہی ٹیلچ کو سیستان کے متعلق وہ معلومات حاصل ہوئیں جو اُس نے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کو مہیا کیں اور اس کے جرنل میں چھپیں۔

جب تک کیانی ملوک کا سیستان پر کچھ اختیار باقی رہا یہ ارابیب قلعہ فتح کی زمینوں کے مالک رہے جہاں یہ سولہویں سترھویں صدی میں اچھی خاصی تعداد میں اور ایک اہم جمعیت تھے اور اُن دنوں میں ملک کی علاقائی ملیشیا میں ایک ہزار جنگجو دیتے تھے۔ خاندان ملوک کے بتدریج زوال کے ساتھ ارباب برادری کی حالت بد سے بدتر ہو گئی اور گو وہ ابھی تک زمین سے منسلک ہیں تاہم افغان حکمرانوں نے انہیں سابقہ مراعات اور آبائی جائداد سے کافی حد تک محروم کر دیا ہے لیکن عسرت کے باوجود ارباب سیف الدین میں خاندانی شرافت اور تربیت کی چاشنی ہے جو اُسے اپنے ہمسایوں اور ہم وطنوں سے بلند کر دیتی ہے اور اُسے اچھے دنوں کی ایک دردانگیز یادگار بنا دیتی ہے۔!

محمدؐ دادی :-

دوسرے صاحب محمدؐ دادی ہیں جو سیستان کی سابقہ تاریخ سے کچھ آگاہ ہیں۔ وہ ایک ایسے خاندان کے فرد ہیں جو پیشۂ آبپاشی سے منسلک تھا اور اس کے افراد انجینئر اور آبی نگران ہوتے تھے لہٰذا ان کا ملک کے سابقہ حالات کے متعلق علم قدیم تاریخ سیستان کی بجائے زیادہ تر قدیم نظام ہائے آبی کا ہے۔ پچھلے سالوں میں محمدؐ دادی کے موروثی علم سے چخان سُر کے افغان گورنر، اخوندزادہ نے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہلمند کے دائیں کنارے کی زمینوں کو سیراب کرنے کے منصوبے بناتے - ارباب سیف الدین کی طرح وہ بھی ایک بوڑھا آدمی ہے، اور قانونِ فطرت کے مطابق وہ بھی چند روزہ مہمان ہیں اور انہی کے ساتھ قدیم سیستان کا سارا علم دفن ہو جائے گا - ان بڑے بوڑھوں کے سینوں میں جو روایات محفوظ ہیں ان سے گراں بہا تاریخ

ملے ہیں، جو حالاتِ ماضیہ کی تحقیقات کے سلسلہ میں بہت مفید ثابت ہوئے۔ براہِ راست ثبوت یا تصدیق کے فقدان کے باعث روایات کی عام صداقت پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے اور انہیں ماخذ کی حیثیت سے نظرانداز کرنا یا حقارت سے دیکھنا انتہائی غیر ذمہ دارانہ ہوگا۔ آزادانہ تحقیقات نے بھی ان کی صداقت کی مجموعی تائید کی ہے۔

قدیم دستاویزات :-

ملوکِ سیستان ہمیشہ دُوراندیشی کی بجائے اپنے ولولوں کی وجہ سے ممتاز رہے ہیں اور اپنے ذرائع سے بڑھ کر ولولہ انگیز خارجہ پالیسی نے اکثر اس ملک کو بیرونی حملوں کے گرداب میں اُلجھائے رکھا ہے جن کی وجہ سے سیستان کے میدانوں پر سیستانیوں کے خون سے ہی ہولی کھیلی جاتی رہی ہے۔ صفوی سلطنت کے ایک صوبہ کی حیثیت سے جب اُسے کچھ خوشحالی نصیب ہوئی تو بھی یہ عدم توازن کے بھنوروں میں اُلجھا رہا، اور اندرونی بغاوتوں اور خارجی یلغاروں کی زد میں رہا۔ ان ۳۰۰ سالوں میں دستاویزات کے طومار و انبار لگ جانے چاہئیں تھے اور قدیم قرادوار کی اسناد وغیرہ ہونے چاہئیں جن کی شہادت پر احیاء الملوک کے مصنّف نے اس شاہی خاندان کی تاریخ لکھی جس کا ایک فرد وہ خود بھی تھا۔ اَرباب سیف الدّین اور محمّد دادی (دادی ان کے قبیلے کا نام ہے) کے آبا و اجداد کو ان دستاویزات و اسناد تک رسائی حاصل تھی اور انہی سے انہیں اتنی معلومات حاصل ہوئیں۔ لیکن افسوس کہ یہ سرمایہ پچھلے ۷۵ یا ۸۰ سال میں ضائع ہوگیا۔

دستاویزات کی تباہی :-

دستاویزات کی آخری تباہی ملک بہرام خان کی موت کے بعد ہوئی۔ اُس کے وارث جلال الدّین کو شاہ کامران نے آخری مسوّدات سے محروم کر دیا جن میں کتب، دستاویزات اور باتصویر شجراتِ نسب شامل تھے جو اس کے آبا و اجداد نے پچھلے ۲۰۰ سال میں جمع کئے تھے۔ اس سے حکمران خاندان کا تاریخی سرمایہ جاتا رہا۔ جو کچھ بچ رہا وہ جلال الدّین اور اس کے بھائی حمزہ خان جیسے

عیش کوشوں نے غالباً بیچ ڈالا یا ان کے علم کے بغیر ہی دُوسروں کے تصرف میں چلا گیا۔ کاغذات دستاویزات اور دیگر خاندانوں کے تمسکات وغیرہ مظفر الدولہ (ایرانی حکومت کا نمائندہ) کی نذر ہو گئے، جب اُس نے ۱۸۶۶ کے قریب سیستان پر قبضہ کیا۔ اُس نے تمام معزز خاندانوں کے سربراہوں کو ہر قسم کے دستاویزات پیش کرنے کا حکم دیا تاکہ وہ اُن کے حقوق ومراعاتِ ماضیہ کی چھان بین کر سکے۔ اس دامِ ہمرنگ زمین میں سب خاندان اُلجھ گئے اور خوشی خوشی اصلی اسناد و فرامین کے انبار دں کے انبار مظفر الدولہ کے سپرد کر دیئے۔ اُنہیں اُس نے نہایت بیدردی سے تلف کروا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایرانی خیمہ کا ہوا سے محفوظ حصّہ ان قدیم دستاویزات کے پرخچوں سے بھرا پڑا تھا۔ یوں بلمند کے ارابیب (ارباب سیف الدّین کا خاندان) نے اپنا سارا دفتر کھو دیا۔ ایرانی سے جو کچھ بچ گیا تھا وہ سردار پر جبند، میر عالم خان لے اُڑا۔ جب وہ حاکمِ سیستان بنا۔

مشن کی آمد سے الواح کی تباہی :-

کاچیان کے کیانی معتبر نے کچھ یادگاری تختیاں جمع کر رکھی تھیں جن پر کتبات درج تھے جو اُس کے نکتہ نظر سے بہت اہم تھے۔ گاؤں کے ایک دروازے پر ملک قطب الدّین کی ایک یادگاری تختی کا بڑا ٹکڑا نصب کیا ہُوا تھا۔ فروری ۱۹۰۳ میں سیستان میں مشن کی آمد سے فوراً پہلے والیٔ سیستان نے ایرانی عمّال کے زیر اثر ان تختیوں کو جمع کیا اور پاش پاش کر دیا۔ صرف دو تختیاں بچیں جو زاہدان میں ۴۴ اولیا کی زیارت سے ملیں۔ یہ بھی محض زیارت کے تقدّس کی بدولت بچ گئی تھیں۔ وہ محض یادگاری الواح تھیں اور ان کی اہمیّت موہوم تھی۔ ان کے کتبات کے فوٹو لے لئے گئے اور برٹش میوزم کے جناب اے۔ جی۔ ایلیس نے انکا ترجمہ کیا۔

افغان وایرانی رویہ کی وجہ سے کھدائی کی مشکلات :-

اس طرح ہم اکثر مآخذ معلومات سے محروم رہ گئے اور صرف روایات پر مرکوز ہونے پر مجبور ہو گئے جو ارباب سیف الدّین اور محمدؐ دادی کے سینوں میں محفوظ تھیں۔ اہم جگہوں کے

کھنڈرات کے معائنہ سے مختلف ادوار کے فنِ تعمیر کی دلچسپ جزئیات نظر آئیں لیکن چونکہ افغان
اور ایرانی عمّال حکومت کے حاسدانہ رویّہ کی وجہ سے کھدائی ناممکن تھی لہٰذا ان جگہوں کا معائنہ صرف
سطح تک محدود رہا یا اُن حصّوں تک جنہیں بادآوردہ ریت نے مکمل طور پر چھپا نہیں دیا تھا۔
سیستانی طاس کے اس حصّہ میں جہاں اب ہلمند بہتا ہے۔ زراعت نے قدیم کھنڈرات
کو بہت متاثر کیا ہے سوائے ایک قطعۂ زمین کے جو پانی کی دسترس سے باہر ہے۔
لیکن اس قطعہ کے آثار کو مقامی لوگ پتھروں کی کان کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔
ان سے پختہ اینٹیں نکال لیتے ہیں اور کچّی دیواروں کے ملبے کو اپنے کھیتوں میں بطور کھاد
استعمال کرتے ہیں۔

قدیم سیستان کا ایک مستند اور دلچسپ ترین نشانِ میل (مینار) قائم آباد ہے۔
جس پر کتبات کی دو پٹّیاں ہیں، والد اور بیٹے کے ناموں کی جو یہاں حکومت کرتے
رہے۔ یہ دونو تاریخی شخصیات ہیں لیکن اس کی تعمیر کا فنی کمال ہے جو قرونِ وسطیٰ
کی اس اُداس یادگار کو دلچسپ بنا دیتا ہے۔ یہ شہادت ہے اس درجۂ تہذیب
کی جو کسی وقت سیستان کو فنِ تعمیر اور موادِ تعمیر میں حاصل تھا۔ گو مینار ۷۵ فٹ بلند ہے
تاہم یہ ایک جزو ہے۔ جزوِ اعظم جو اپنی مکمل شکل میں کم از کم ۱۰۰ فٹ تو بلند ہوگا۔

ایک مقامی مسخرے نے مقامی عمّال سے اجازت حاصل کر لی تھی کہ وہ اسے
مسمار کر کے اس کے سنگ و خشت بیچ ڈالے۔ اُس نے یہ اجازت کافی رقم دے کر
حاصل کی تھی لیکن برطانوی کمشنر کی مداخلت نے اس مینار کو انہدام کے خطرے
سے بچا لیا۔

مشرقی اقوام کی اپنی تاریخ سے بے اعتنائی۔

موجودہ مشرقی نسلوں کی اپنے ملک کی تاریخ ماضیہ سے بے نیازی مشرقی کردار کا ایک
عجیب و غریب حصّہ ہے۔ ایشیا کی قدیم تاریخ بیرونی لوگوں کے جوش و خروش کی وجہ سے

گمنامی یا اتلاف سے بچی ہے اور کچھ یادگاریں بھی جو اُنہی لوگوں کے ہاتھوں تباہ ہو گئی ہوتیں جن کا فرض اصل میں انہیں بچانا تھا۔

رُوایاتِ رُستم کا معنی:-

سیستان کی قدیم ترجگہیں رستم کی کہانیوں سے متعلق ہیں جو اُس کی ذات، افرادِ خاندان اور اُس کے مشہور جنگی گھوڑے سے مربوط ہیں۔ یہ رُوایات صرف قدیم مقامات سے ہی منسلک ہیں اور یہاں تجربہ نے ثابت کیا ہے کہ زردشتی آثار کا وجود ایک سرگرم تحقیق و تجسّس کو نتیجہ خیز اور بار آور کر سکتا ہے۔ ایسی جگہ سے منسلک رستم کی روایت کا دُوسرے لفظوں میں یہ معنی ہے کہ یہ جگہ (شاید صدیوں سے) بہت عظیم قدامت کی حامل سمجھی جاتی رہی ہے۔

باب دوم

سیستان کے مختلف نام

سیستان کے پُرانے نام :-

سیستان لفظ ساکستان کی موجودہ تحریف ہے اور موخرالذکر کو ساگستان میں بدل دیا جاتا تھا، کیونکہ 'ک' اور 'گ' کی باہمی تبدیلی آج کل تو بہت عام ہے۔ عرب اسے سجستان لکھتے تھے۔ کیونکہ عربی میں 'گ' اور 'ج' آپس میں بدل سکتے ہیں، لفظ جمل (ایک اُونٹ) مصری عربی کا ہے جو گمل (یا کمل) میں بدل جاتا ہے اور ہمارا لفظ کیمل غالباً صلیبی لائے جو مصری اور فلسطینی تلفّظ سے متاثر ہوئے۔ ان کے علاوہ سیستان کے دو اور نام ہیں جو غالباً قدیم تر ہیں۔ ایک نیمروز ہے اور دوسرا زری ہے۔ موخرالذکر پہلے سے بھی زیادہ پُرانا ہے۔ اسی سے یونانی اور لاطینی مؤرخین نے لفظ ڈرینگیانا اخذ کیا، اور یہ شکل ان مصنّفین نے یوروپ میں جاری کی جن کے دستاویزات سکندر کی مہم کے مفصّل بیانات کی بُنیاد بنے۔ عرب فاتحین بھی لفظ زری سے تسخیر سیستان پر آشنا ہوئے، لیکن انہوں نے اسے زرنج میں بدل دیا جو ان کے ابتدائی روزناموں میں ملتا ہے۔ زری سے ہی اس کی شکل زرہ نکلی جو آج بھی موجود لیکن محدود استعمال ہے۔ گاؤِ زرہ کا معنی ہے نشیبِ زرہ، اور گو اس کا اطلاق سارے سیستان پر ہوگا، تاہم یہ عملاً اسی نشیب تک محدود ہے جو جھیل کے جنوب میں ہے۔ یہ مقامی اطلاق غالباً اِس

لئے ہوا کہ یہ خاص نشیب صدیوں تک محروم آب رہا ہے اور جس کی زمین اتنی شور ہے کہ وہ نباتات کا وجود ہی برداشت نہیں کرسکتی۔ اس کے برعکس شمالی نشیب ہلمند اور دیگر امدادی دریاؤں کا پانی قبول کرتا رہا ہے، لہٰذا اس کے زیرِ آب حصّہ کے سوا یہ ہمیشہ بہبودئی انسان کے کام آتا رہا۔ اسی لئے شمالی طاس کو ہامون جھیل کہتے رہے ہیں۔

زری، زَرہ، اور زرہ :-

لفظ زری کی قدامت کا اظہار داریوش ہسٹاسپس کے مشہور کتبے کی دریافت سے ہوا جس میں سیستان کو زرنکا (جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۰۶) کہا گیا ہے۔ لفظ زرایا (زند) یا دریا (قدیم فارسی) کو جھیل ہامون پر منطبق کیا گیا ہے (ایضاً) مشہور لفظ دریا اسی قدیم لفظ کا جانشین ہے۔ جب ہلمند طغیانی پر ہو تو اسے بحرِ سیستان کہا جا سکتا ہے لیکن بارھویں صدی کے وسط میں یہ لفظ نشیبی علاقوں کے لئے مستعمل رہا۔ علاّمہ ابوالفضل بیہقی نے اسے زرگان (زرہ یا زَرہ کی جمع) لکھا اور اس سے سبزوار کے جنوبی نشیبی علاقے مراد لئے یعنی کئی زرہ، چلتے چلتے اُس نے نیشاپور اور ہرات کے جنوب میں ممالک کی ہیئت پر بھی روشنی ڈالی۔ اُس نے مسعود ابن محمود غزنوی کی ایک شکار مہم بیان کی ہے۔ شہزادہ اور اس کے رفقاء اسفرار (سبزوار) گئے اور دریائے ادرسکان کے جنگلوں سے گذرتے ہوئے وہ فرح اور زرگان کی طرف گئے۔ زرگان میں ایک شیر مارا، اور اپنی کامیاب مہم پر مطمئن ہو کر شاہی طائفہ قلعہ بست روانہ ہوا، اور غزنی واپس آیا۔ ادرسکان کے کناروں اور زرہ یا سیستان جھیل سے ملحق نشیبی علاقہ کے جنگلات مدتوں پہلے غائب ہو چکے ہیں۔ اور سیستان کا جھاڑی بن اب بمشکل جنگلی سؤر اور گیدڑ کا ہی متحمل ہو سکتا ہے۔ لفظ زرہ یا زَرہ اب بھی ملک میں مستعمل ہے۔ گاد زرہ کے علاوہ شیلا کے اوپر کی سطح مرتفع دشتِ زرہ کہلاتی ہے اور موجودہ صدر مقام، نصرت آباد کے جنوب میں حقیر سے کھنڈرات کا ایک مجموعہ ابھی تک زرہ یا زرہ کہلاتا ہے۔

اوستا میں جھیل سیستان کا ذکر :-

اوستا میں جھیل سیستان کو کانسو کہا گیا ہے اور بندا ہشن میں اسے کیانسِ میں بدلا گیا ہے

اور جھیل کو ایک سمندر بتایا گیا ہے۔ آج کل کوہ خواجہ کے مغرب میں جھیل کا حصّہ ابھی تک دریائے سنگی کہلاتا ہے۔ بند اہش میں مذکور جھیل فرزدان آب الیستادہ سے شناخت کی گئی ہے جو غزنی کی جنوب مشرقی جھیل ہے لیکن یہ بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کہ ملک (ریاست کی نہیں) کی حدود کبھی اتنی مشرق تک ہوں۔ اغلباً ناشخیل اور تالاب ہامون قدیم آب وہوا میں فرزدان کے باقیات ہوں۔

موسیٰ خوربنی، ارمنی وقائع نگار:۔

ابوالفضل بیہقی سیستان یا سجستان کے صوبہ یا انتظامی ڈویژن کو نیمروز کا نام دیتا ہے۔ ارمنی راہب، موسیٰ خوربنی ذکر کرتا ہے کہ فارس (اصل ایران) جی اُشتیا نیمروز کہلاتا تھا، اور ایران یا نیمروز کے صوبے گنواتا ہے جن میں ساگستان بھی شامل ہے۔ یہ نام پانچویں صدی عیسوی میں مذکورہ مصنّف کے مطابق سلطنت کے لیے استعمال ہوتا تھا لیکن آہستہ آہستہ صوبہ سگستان تک محدود ہو گیا۔ شاعری میں سیستان نیمروز کہلاتا ہے لیکن اس نام کے دیگر مقاصد بھی تھے۔ خلفا کے ٹکسالوں میں زرنج کا دارالضرب تھا جو اس ملک کا پایۂ تخت تھا لیکن جب مقامی حکمرانوں نے اپنے سکّے جاری کیے تو زرنج کی جگہ نیمروز نے لے لی اور اُن کے سکّوں کے اُلٹے رُخ پر یہ سجع کندہ ہے مضروب دَرقصبہ (یا ملک) نیمروز۔ ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ قدیم تاریخ میں پایۂ تخت کی کوئی تخصیص نہیں کی جاتی۔ اسے شہر سیستان یا صرف سیستان لکھّا جاتا ہے اور اب بھی اس قدیم استعمال کی روایت موجود ہے۔

باب سوم

سکے، مہریں، منقوشات وغیرہ

پرانے سکے، مہروں اور منقوشات وغیرہ کا ماخذ :-

کبھی کبھار کسی کاشتکار کا ہل یا کدال سیستان کے آباد علاقہ میں سکوں کا کوئی چھوٹا سا ذخیرہ روشنی میں لے آتا ہے لیکن سکوں، مہروں اور منقوشات کے ہمارے ذخیرے ہلمند کے موجودہ ڈیلٹا کے مشرق کے کھنڈراتی علاقہ سے ہی حاصل کئے گئے۔ سیستان میں کئی خاندانوں کا ذریعہ معاش ہی دفینہ جوئی ہے۔ وہ موسلا دھار بارشوں کے بعد کھنڈرات میں جاتے ہیں جب آبی عمل ان قدیم یادگاروں کو قدیم ڈھیریوں کی ڈھلانوں اور ملبے کے ڈھیروں پر ظاہر کر دیتا ہے۔ میں نے جو سکے جمع کئے تھے وہ سب برٹش میوزیم کو بھیج دیئے گئے اور وہ جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں بیان کئے گئے ہیں۔ یہ سکے دفینہ جوؤں سے حاصل کئے گئے، دلچسپ ہیں اور مسکوکاتی اہمیت کے مالک ہیں۔ میں ان کے مقامات کو بھی نہایت احتیاط سے متعین کرتا رہا، وہ نہایت ابتدائی قدیم نمونے سے لیکر ساسانی، یونانی باختری اور پارتھوی ٹکسالوں کے بہتر اور مشہور نمونوں پر محیط ہیں۔ مؤخر الذکر میں بہت دلچسپی لی گئی کیونکہ ہندی پارتھوی بادشاہوں نے اپنے چھاپے بھی لگائے یا غالباً دوبارہ جاری کئے۔ اکثر صناعی پر اعتبار کیا جائے تو منقوشات مختلف ادوار کے تھے، کچھ قدیم تر تھے۔ بعض میں شکل انسانی روایتی اور بھدے انداز میں پیش کی گئی ہے، جو

بعد کے ہیں لیکن قدیم ترین یونانی اثرات کے تحت عقیق اور دیگر پتھروں پر منقش سروں، دھڑوں اور شکلوں کی خوشنما تصویریں ہیں۔ ایک پر ایک مرد کی شکل تھی جو حیران کن طور پر جزئیات کے لحاظ سے چینی تھا۔

قدیم دور میں تانبے کا بکثرت استعمال :۔

اُن دنوں میں تانبا بکثرت استعمال ہوتا تھا۔ انسانوں، حیوانوں اور پرندوں کی بے ڈھب شکلیں فراواں تھیں۔ تانبے کی انگوٹھیاں بھی کثرت سے ملی ہیں جن سے زرہ بکتر اور دیگر آلات کے استعمال کا پتہ چلتا ہے۔ سار وتار کے کھنڈرات میں مجھے ایک مہر ملی جس پر دو کوہان دار بیلوں کی مورتی بنی ہوئی تھی اور ایسے الفاظ کندہ تھے جو سنسکرت کی کسی شکل سے ملتے جلتے تھے۔ یہ اس روایت کی ایک عجیب و غریب تصدیق تھی کہ سار وتار کسی وقت ایک ہندو بادشاہ کا مرکز تھا۔ اس مقام کے بیان میں اس روایت کی طرف اشارہ کیا جائیگا۔

بُدھ آثار کا فقدان :۔

کسی قسم کے بُدھ آثار دریافت نہیں ہوئے لیکن سار وتار کے مشرق اور جنوب میں ایک دو فاصلے سے ٹوپ یا سٹوپا معلُوم پڑتے تھے۔ ان کو کھودنا یا ان کا تفصیلی معائنہ کرنا ناممکن تھا کیونکہ یہ دریا سے بہت دور افتادہ تھے۔

زردشت مذہب سیستان میں :۔

جب سیستان میں زردشت مذہب کا دور دورہ تھا تو اُس وقت کے آثار بکثرت ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ عربوں کی فتح کے بعد بہت عرصے تک سیستان میں یہ مذہب جاری رہا اور گبروں (آتش پرستوں، پارسیوں) کی بڑی بڑی برادریاں تھیں جنہیں ابتدائی فاتحین برداشت کرتے تھے۔ بعد میں ان کے خلاف تعصب پیدا ہوا اور مقدس آگ اور اس کی قربانگاہیں ختم کر دی گیئں۔ آتشکدوں کے مقامات کے متعلق روایات ہیں جن میں سے ایک کی تصدیق عرب مؤرخین سے بھی ہو سکتی ہے۔ ان مقامات اور اسلام کے ورود سے پہلے کی سیستانی راجدھانیوں کی شناخت کا انحصار مذکورہ مصنفین پر منحصر ہے اور ان کا علیحدہ ذکر کیا جائیگا کیونکہ شناخت بہت کمیاب تاریخی اور دیگر شہادتوں کی بنا پر کی جا سکتی ہے۔

باب چہارم

پوسٹ گاڈ اور چپو کے کھنڈرات :-

سیستان کے قدیم ترین کھنڈرات دہ ڈھیر یاں یا ٹل ہیں جو پوسٹ گاڈ اور چپو کے ہمسایہ قصبات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ چکانسر کے چھ میل شمال میں واقع ہیں۔ ان کے اور یکساں طور پر قدیم کھنڈر (جسے بلوچی خواجہ سیاہ پوش پکارتے ہیں) کے اردگرد اور شمال کی زمینیں چار پانچ نہروں کے ایک جھنڈ سے سیراب ہوتی تھیں جو ضلع قدح میں خاش رود کے دائیں کنارے سے نکلتی تھیں۔ یہ نہریں خاش رود کے شمالی علاقہ کی آبیاری کرتی تھیں اور اس کا سارا پانی صرف کر لیتی تھیں، کیونکہ آثار کے جنوب میں زور کن اور زرکن نہریں پوسٹ گاڈ اور چپو پہنچنے سے پہلے ہی خشک ہو جاتی تھیں۔

پوسٹ گاڈ :-

یہ مقامات رستم کے وقت کے ہیں جو اغلباً ساتویں یا چھٹی صدی قم سے تعلق رکھتا تھا۔ پوسٹ گاڈ کے کھنڈرات ایک بڑے احاطہ پر مشتمل ہیں جس میں بلند جسیم دیواروں کے آثار ہیں۔ یہ ۵۰۰ مربع گز کا رقبہ گھیرے ہوئے ہیں اور ڈھیریاں اب قریباً تیس فٹ اور کہیں کہیں اس سے بھی زیادہ اونچی ہیں۔ زاویے قطب نما کی چاروں سمتوں کے مقابل ہیں۔ شمالی زاویے کے مقابل ایک قلعہ (؟) تھا جو ایک ٹھوس کرسی پر ایستادہ تھا۔ دیواریں گر گئی ہیں اور قریباً پچاس فٹ اونچی ڈھیری بن گئی ہے۔ احاطہ کے شمال مغربی رخ سے ملحق ایک اچھے خاصے قصبے کے

کھنڈرات معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کھنڈرات ڈیڑھ میل تک اس سمت میں پھیلے ہوئے ہیں جن سے آگے ایک اور قصبے یا گاؤں کے آثار ہیں جو اب قلعہ بائیان (بھائی خان) کہلاتا ہے۔ ان میں پختہ اینٹوں کا کوئی شائبہ نہیں ملتا۔

چچو :-

قلعہ چچو قدیم زمانے میں ایک قصبہ ہوتا تھا۔ قلعہ بے قاعدہ ہے، دیواریں ڈھیر بنے ہوئے ہیں اور صرف دروازہ کھڑا ہے۔ تعمیر میں کچی اینٹیں بہت استعمال ہوئی تھیں۔ پختہ اینٹیں بہت کم تھیں۔ قلعہ کے اندر کا محل احاطہ کے مرکز میں تھا۔ یہ گر چکا ہے اور اس کے ملبہ کی ڈھیری کوئی پچاس فٹ بلند ہے۔ قلعہ کے جنوب میں ایک اور احاطہ ہے جن کے اندر دو خوبصورت عمارات کے کھنڈرات ہیں اور جن کی کرسیاں اور ان کے اوپر پانچ فٹ تک دیواریں پختہ اینٹوں سے بنی ہوئی تھیں۔ بالائی عمارات خشک اینٹوں سے بنی ہوئی تھی۔ یہ احاطہ قریباً ایک سو بیس مربع گز ہے اور اس کے آثار کوئی بیس فٹ اونچے ہیں۔ دروازہ قلعہ کے مقابل ہے جو صرف سو گز کے فاصلے پر ہے۔ قلعہ کے مغرب میں دو اور عمارات کے آثار ہیں جو اب بھی اپنی محتاط ساخت اور بھر پور آرائش کا پتہ دیتی ہیں۔ ارد گرد کا سارا علاقہ کھنڈراتی ہے۔ پوست گاؤ اور چچو کے مقامات میں تسلسل ہے کیوں کہ ان کا چھوٹا سا درمیانی خلا بھی کھنڈرات سے اٹا پڑا ہے۔

پوست گاؤ یا پرشت گاؤ نورا (یا بیل؟) :-

پوست گاؤ دیکھنے میں مہمل معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک قطعہ زمین حاصل کرنے کے لئے قدیم رسوم کی یاد دلاتا ہے جس کے تحت ایک بیل کی کھال کو ٹکڑے ٹکڑے کیا جاتا تھا اور جو دِجل کی تحریر کے مطابق کارتیج کی بنیاد پر زیر عمل آئی تھیں۔ جب یہ نام معلوم ہوا تو حالیہ ہی دکھائی دیتا تھا لیکن کسی بیّن معنی کے فقدان کے باوجود اسے میں نے اس کی شکل میں محفوظ رکھا۔ لیکن مزید وقت اور معلومات ملنے پر اغلب معلوم ہوتا ہے کہ پوستِ گاؤ اوستائی پرشت گاؤ کی جدید

(یا مسخ شدہ) شکل ہے ــــ وہ بادشاہ جوڈِ نگرڈ کے مُطابق سگستان کے آخر میں رہتا تھا اور جس کا لقب تورا یا بیل تھا۔ یہ بادشاہ زردشت کا پیرو بنا مشہُور ہے کہ مُصلح نے ایک چار سالہ بیل کا علاج کیا اور دریائے دائتی ('ایرانی اُردن') کے پانی یا ہوم سے اُس میں قوتِ نسل افزائی پیدا کی۔ اگر زردشت کے دورِ حیات کی مقبولِ عام تاریخ کو صحیح مان لیا جائے تو مقامی روایات اُس کے آغازِ تبلیغ کو سکندر سے ۲۵۸ سال پہلے بتاتی ہیں اس طرح ہم پوست گاؤں کی جگہ کو ایک معقول قدامت کا حامل سمجھ سکتے ہیں۔ یہ غالباً اس بادشاہ کا دارالحکومت تھا، جو انتہائے سیستان پر رہتا تھا اور یہی قصبہ چاپو کی تاریخ ہو سکتی ہے۔ اسے مزید تقویت اس سے بھی مل سکتی ہے کہ اس کھنڈراتی جگہ کے عین مغرب میں ہاموں کے نیزار آج بھی خالص مویشی چرانے والوں کے بڑے بڑے خیموں کی آماجگاہ ہیں۔ ان کا ایک قبیلہ آبل یا آیر ہے۔ جن کا دستورِ زندگی بالکل ویسا ہی ہے جیسا دیگر ہندوستانی لوگوں کا جنھوں نے پہلی صدی عیسوی میں بحیرۂ عرب کے ہندوستانی ساحل کے ایک حصّہ کو اپنا نام دیا، اور جو غالباً سیستان سے ہجرت کر کے آئے تھے۔

انہیں ابتدائی قصبات کی جگہیں سمجھنا یا بہت قدامت کی معلوم جگہیں گردانا غیر معقول نہیں ہے بشرطیکہ قدامت کو مشرقی معنوں میں ہی لیا جائے۔

دَرگ (ہوکاٹ) میں درختانِ سرو منسوب بہ نوشیرواں :-

مصدّقہ زردشتی قدامت کے تین دیگر آثار بھی ہیں۔ ہوکاٹ کے موجودہ گاؤں دَرگ کے دو میل شمال میں سرو کے درخت ہیں جو جُوین سے قریباً سولہ میل دُور ہیں۔ روایت انہیں 'دادِ نوشیرواں' سے منسوب کرتی ہے۔ سرو ایک آہستہ رو درخت ہے اور موجودہ قد و قامت تک پہنچنے کیلئے وہ یقیناً اس دَور کے بعد نہیں لگائے گئے ہوں گے (قریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے) بلکہ شاید پہلے کے ہوں۔ زردشت کی زندگی اور تعلیمات کی طرف پھر رجُوع کریں تو معلُوم ہوتا ہے کہ اس درخت کی ایک مخصوص اہمیت تھی مثلاً کشمار کے سرو کے بونے

کی رَوایت ہے۔ یہ دَرخت زردشت نے خود لگایا تاکہ اس کی تبلیغ سے بادشاہ وِشتاسپ کی تبدیلیٔ مذہب کی حقیقت اور اہمیت کی یاد تازہ رکھی جاسکے۔ سرو کی لازوال مضبوطی اور سَدا بہار برگ و بار کو اس مذہب کی وسعت پذیری اور ثبات کی علامت سمجھا گیا اور اس خصُوصی واقعہ کی شایانِ شان یادگار گردانا گیا۔ یہ درخت نویں صدی عیسوی تک قائم رہا۔ کِشمار خراسان میں وَاقع ہے اور بہ تاریخی درخت بنو عبّاس کے دسویں خلیفہ متوّکل کے حکم پر ۸۴۶ء (۲۳۲ھ) میں کاٹ ڈالا گیا۔ اُسوقت تک یہ دَرخت مقدّس بن چکا تھا۔ اور غالباً اس کی تباہی لوگوں کو بہت جلد حلقۂ اسلام میں لانے میں ممد و معاون ثابت ہوئی۔[۱]

سَرحد میں سنگن کا سرو :۔

مشرقی ایران کے ضلع سرحد کے گاؤں سنگن میں کرنل پی۔ ایم سیائیکس کو ایک مہا سرو ملا۔ اُس دُور افتادہ گاؤں میں شاید دُنیا کا عظیم ترین سرو دیکھ کر ہماری حیرانی کی انتہا نہ رہی زمین سے قریباً پانچ فٹ اُوپر اس کا گھیر ۲۵ فٹ تھا اور اس کے عین اُوپر شاہ بلوط کی مانند اس کے بڑے بڑے ٹہنے پھیلے ہوئے تھے۔ فاصلے سے یہ رنگ کے سوا ایک بڑا درخت چنار معلوم ہوتا تھا اور اسے دیکھنے کے لئے صعوبت سفر گوارا تھی۔"

دَرگ (ہوکاٹ) کے دَرختان سرو کی پیمائش :۔

میں نے درگ کے سَروں کی احتیاط سے پیمائش کی۔ میں نے بھی انہیں درختان چنار

[۱] سروِ زردشت کے متعلق جنرل ہُوٹم شنڈلر کے ایک بیحد دلچسپ شذرہ کیلئے جنوری ۱۹۰۹ء کا جرنل آف دی رآئل ایشیاٹک سوسائٹی دیکھئے کِشمر یا کشمر ترشیز کے قریب بتایا جاتا ہے۔ روایت کے مطابق حکم خلیفہ پر اسے کاٹتے وقت یہ ۱۴۵۰ سال پرانا تھا۔ کاٹ کر اسے سامرا (بغداد کے قریب) لے گئے جہاں یہ جعفریہ محل کی تعمیر میں صرف ہُوا۔ جب یہ دَرخت سامرا سے ایک منزل دُور مقام محل تک پہنچا تو خلیفہ کو اُس کے بیٹے نے قتل کر دیا (۹ر دسمبر ۸۶۱ء) یہ گویا روایت کی تاریخ ہے۔ لیکن ابتدائی عرب وقائع نگاروں سے اس کہانی کی کوئی تصدیق نہیں ہوتی۔
درخت کی طرف اشارے کا فقدان روایت کو مشکوک کر دیتا ہے۔ لیکن یہ لازماً اس کا قاطع بھی نہیں ہے۔
جی۔ پی۔ ٹیٹ

سمجھا، لیکن ان تک پہنچنے سے پہلے ہی ان کے برگ و بار کے اُداس اور گہرے سبز رنگ نے مجھے میری غلطی سمجھا دی۔ ان دونوں میں سے بلند تر ایک نمونہ نہ تھا۔ اس کا سر اٹوٹ گیا ہے۔ پھر بھی یہ ۴۴ فٹ اونچا تھا۔ زمین سے چھ فٹ اوپر اس کا گھیرا ۱۷ فٹ پایا گیا ہے۔ اس کے پتے سبز تھے۔ اس کی جڑوں سے ایک اور پھوٹ پڑا تھا جو اصل درخت کے نصف تک بھی نہ پہنچ سکا تھا۔ زمین سے چھ فٹ اوپر یہ نوزائیدہ ۱۲ فٹ تھا۔ دو سو گز مشرق کی طرف ایک عظیم تر نمونے کا موٹا یا آخری حصہ کھڑا ہے۔ یہ نامکمل درخت زمین سے پانچ فٹ اوپر گھیرے میں ۲۳ فٹ تھا اور یہ صرف ۲۵ فٹ اونچا تھا۔ یہ دوسروں سے بہت زیادہ قدیم ہے جو کسی پرانی آبی گذرگاہ کے کناروں پر کھڑے ہیں اور چونکہ ان کی جڑیں اس کے کناروں اور پاٹ میں پیوست ہیں لہٰذا یہ گذرگاہ بیشمار صدیوں تک رواں رہی ہوگی اور درخت وہیں بوئے گئے ہوں گے جہاں یہ اب بھی کھڑے ہیں۔

کشمار کا سرو:۔

اہل درگ نے مجھے بتایا کہ سرو کی یہ قسم قلموں کے ذریعے بڑھائی جا سکتی ہے اور اگر ایسا ہے تو درگ اور سنگن کے سرو اسی طرح کشمار کے مشہور درخت سے بڑے ہوں گے اور کسی واقعہ کی یادگار کے طور پر سرحد اور سیستان میں لگائے گئے ہوں گے جو زردشت کی تعلیمات کی اشاعت سے متعلق ہو۔ پریون کے مغرب کی طرف ایک چھوٹا اور ادھورا سرو بھی سیستان میں ہے، جو درگ کے درختوں کی ایک قلم تھا۔ سیستانی ان درختوں سے عقیدت نہ رکھتے ہوں تو بھی ان کا احترام ضرور کرتے ہیں جیسے کور اگرتمرس کا۔ ان کا ایک جھنڈ ایک زیارت (اب مسلمان ولی کی) کے پاس ہے جہاں یہ بہت بھی ہیں اور بڑے بھی۔ مشہور ہے کہ جب ملک پر کوئی بلا نازل ہونیوالی ہو تو ایک درخت گر جاتا ہے اور دیہاتی دفع بلا کے لئے زیارت پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ زیارت اور جھنڈ قلعہ کاہ ضلع میں ہیں۔ اگلے باب میں ان زردشتی آثار کا بیان ہوگا جو ماقبل اسلام دور کے قرار نہیں دیئے جا سکتے۔

بابِ پنجم

بعد کے ادوار کے زردشتی آثار

مینار ہائے سکوت کے کھنڈرات :-

دخموں یا مینار ہائے سکوت کے آثار اتنے زیادہ ہیں اور بعض حالتوں میں یہ اتنے محفوظ پائے گئے ہیں کہ ان کا اصل مقصد ظاہر ہو جاتا ہے یعنی یہ اغلب معلوم ہوتا ہے کہ مذہب زردشت عربوں کی فتح اور اسلامی عقائد کے نفاذ کے بعد بھی صدیوں تک سیستان میں جاری و ساری رہا۔ کم از کم ایران میں صورتِ حال ایسی ہی تھی جو سیستان سے دور نہ تھا۔ خوارج ملت کے سوادِ اعظم سے آویزش کی تلخی کی وجہ سے کافر ترکوں یا ہندوستانیوں کو اپنے ہم وطنوں سے چھوٹا دشمن سمجھتے تھے۔ عظیم تفرقات جو حضرت علیؓ کے فرقہ کی صورت میں پیدا ہوئے اور بعد میں اسمٰعیلی بدعت میں بدل گئے۔ خلافت کے مشرقی حصوں میں ہی ظہور پذیر ہوئے اور غالباً اس لئے کہ ان علاقوں کے لوگ پوری طرح مسلمان نہ ہو سکے تھے۔ مذہب زردشت کا خاتمہ غالباً سیستان اور خراسان میں خوارج کے استیصال کا ہم وقت تھا۔ لہٰذا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مینار ہائے سکوت اور آتشکدوں کے موجود آثار کسی طور بھی ماقبل اسلام دور سے تعلق نہیں رکھتے۔ انکی موجودگی انکی نسبت حالیہ ویرانی کو زیادہ قرینِ قیاس بنا دیتی ہے۔

رسمی روایات :-

سیستانی مینار ہائے سکوت کے ان آثار کو آخور یا گھر لیان پکارتے ہیں اور انہیں دورِ رستم

سے منسوب کرتے ہیں جو اُس کے افسانوی گھوڑے کے لئے تعمیر کی گئی تھیں۔ خراسان میں مدور کھُرلیاں بنائی جاتی ہیں جو قطر میں قریباً ۲ فٹ یا ۳۰ انچ ہوتی ہیں جن میں گھوڑوں، اُونٹوں اور مویشیوں کے لئے کٹا ہُوا چارہ رکھا جاتا ہے۔ دخموں کے آثار تباہ شدہ اندرونی یا بیرونی دیواروں پر مشتمل ہیں جو مدور ہیں۔ اسی لئے ان پر لفظ آخور کا اطلاق ہوتا ہے۔ جہاں کہیں بھی لوگ رخش رُستم کی کسی کھُرلی کا بتائیں تو یہ جائز طور پر فرض کیا جا سکتا ہے کہ وہاں کوئی تباہ شدہ دخمہ ہے، یہ آثار ہلمند کے بائیں کنارے کے علاقے میں بہت عام ہیں، ایک تو اُس راستے کے پہلو کی ڈھیری پر ۱۹۰۵ میں ایستادہ تھا جو مشن کے کیمپ سے دار الحکومت نصرت آباد کو جاتا تھا۔ یہ قدیم عمارات عموماً ایسی ہی بلند جگہوں پر واقع ہیں۔ یہ ہندوستانی پارسیوں کی موجودہ رسم کے عین مطابق ہے بشرطیکہ ایسی جگہیں دستیاب ہوں۔ ایک کھنڈر گاؤں قلعۂ نو کے قریب کی نمایاں اونچائی پر تھا۔ دیہاتیوں نے اُسے توڑا، اور چھان بین کی تو ملبے سے ایک بوسیدہ ہڈی ملی، جو انسانی انگلی کی ہڈی تھی اور یُوں ان آثار کا ماخذ یقینی طور پر ثابت ہو گیا۔ اپنے محل وقوع کی وجہ سے ان میں سے بعض کو زمانۂ حال میں دیدبانوں کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جن پر اشاراتی آگ سے دشمن کی آمد کی اطلاع دی جاتی تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ جب مُردوں کو دفن کرنے کا یہ طریقہ ختم کیا گیا تو لوگ دخموں کے اندرونی حلقوں کو مٹی سے بھر دیتے تھے اور اگر عمارت دیدبان کا کام نہ دے رہی ہو تو وہ آہستہ آہستہ کھنڈر بن جاتی تھی۔ کئی جگہوں پر ان دخموں کے قریب ہی قبرستان ہیں جہاں تجہیز و تکفین اسلامی عقائد کے مُطابق کی جاتی ہے۔

بُرج لار :-

چاپو کے کھنڈرات سے قریباً ۸ میل مشرق میں سطح مرتفع کی ایک نمایاں راس پر ایک مینار نصب ہے جسے بُرجِ لار (یا مینار راہ) کہتے ہیں۔ اِسے دریائے خاش کی وادی بہت دُور تک دیکھی جا سکتی ہے اور اوقات خطرات میں یہاں آگ بھی جلائی جاتی تھی کیونکہ افغان یا دیگر حملہ آور اس راستے بھی سیستان میں داخل ہوتے تھے۔ یہ بھی پوست گاہ اور چاپو کی آبادی کے دَور

میں ایک دخمہ تھا جسے آبائی مذہب کے پیرو استعمال کرتے تھے۔

رام شاہرستان کے کھنڈرات :-

سیستان کے قدیم ترین شہر معلوم رام شاہرستان کے آثار کی ڈھیری کے پاس بیشمار کھنڈرات ہیں۔ یہ شہر اسلام سے بہت پہلے آباد تھا لہٰذا اس کے آس پاس کھنڈرات کا ہونا حیران کن نہیں۔ یہ ایک گنجان آباد شہر تھا اور مُردے انسانی رہائش گاہوں سے دُور دخموں میں رکھے جاتے تھے۔ شہر کی تباہی کے بعد دخمے کچھ عرصے تک دیہاتی آبادی کے زیر استعمال رہے۔

رام شاہرستان کے آتشکدہ کے آثار :-

یہاں ایک قدیم اور اب بے شکل عمارت کے کھنڈرات بھی ملے ہیں جو آتشکدہ تھا یہ سیستان میں اپنی قسم کا واحد کھنڈر رہے گو کارکوشاہ اور تراکن میں بھی آگ مندر تھے لیکن وہ بالکل نیست و نابود ہو چکے ہیں۔ یہ آتشکدہ موجودہ گاؤں کمک سے ایک میل مغرب میں ایک قطعۂ دشت کے شمالی سرے پر واقع ہے اور رود سیستان کی سیلابی حدود کے اندر ہونے کی وجہ سے پانی اور دلدل میں گھرا رہتا ہے عمارت کچی تھی۔ گنبدیں چھت کا ایک بڑا کمرہ اب بھی پہچانا جا سکتا ہے یہ کھنڈرات جزیرہ کے جنوبی سرے کی بعد کی گنبدیں عمارتوں سے قدیم ہیں جو مقابرہ ہیں اور ایک میں ناہرولی سردار عالم خان دفن ہے۔ روایات انہیں متفقہ طور پر آتشکدہ کے آثار بتاتی ہیں اور یہ شہر کے قدیم ترین آثار میں سے ہیں۔

راشک :-

آتشکدہ راشک ضلع کی جگہ کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ معلومات ایک قدیم مہال کے لوگوں نے مہیا کیں جسے تیمور نے فتح سیستان پر گلستان کا نام دیا۔ یہ نام اب متروک ہے۔

الاصطخری اور ابن رستہ :-

آئندہ ابواب میں سیستان کے قدیم صدر مقامات اور الاصطخری اور ابن رستہ میں مذکور مقامات کی نشاندہی کی کوشش کی جائے گی۔ کیونکہ ان مصنفین کے فراہم کردہ اشارات ہی واحد معلومات ہیں جو نویں دسویں صدی عیسوی کے سیستان کے متعلق ہمیں معلوم ہیں۔

باب ششم

رام شاہرستان

اگرچہ ایک ہزار سال پہلے بنائے گئے سیستان کا شہر بزرگ تھا تاہم اس سے بھی قدیم تر ایک شہر تھا جو اس کے وجود سے پہلے دارالحکومت تھا۔ اس کا محل وقوع اچھی طرح معلوم ہے۔ اور اس کا نام رام شاہرستان وہی ہے جو مذکورہ بالا مصنفین میں بھی مذکور رہے۔ سیستان کی دیگر جگہوں کی طرح اس کا نام بھی زندہ ہے لیکن اس کے کھنڈرات میں کوئی قابل ذکر چیز موجود نہیں ہے۔

نادعلی سے فاصلہ :-

اس قدیم تر شہر کا نادعلی سے براہِ راست فاصلہ ۱۲ میل ہے جنوب مغربی سمت میں اور قریباً ۸ میل ہے شمال مغربی سمت میں یا گاؤں خوابگاہ سے۔

جگہ کا بیان :-

سطح مرتفع کے انتہائی شمالی نقطہ سے ذرا پہلے جہاں سے ڈیلٹا صاف نظر آتا ہے ایک دُور افتادہ قطعۂ دشت ہے جو دو تین سو گز چوڑی سیلابی مٹی کی پٹی سے باقی کی سطح مرتفع سے الگ ہو جاتا ہے۔ یہ حصہ منفصل کوئی نصف میل لمبا اور دو سو گز چوڑا ہے اور چاروں طرف سے زرخیز مٹی سے محصور ہے۔ اس جزیرۂ دشت کا رُخ شمال مغرب کو ہے اور اس کے جنوبی سرے پر ایک بڑی ڈھیری ہے جو میدان سے کوئی ۱۰۰ فٹ اُونچی ہے۔ یہ جنوبی سرا ایک پرانی خندق کے ذریعے باقی حصہ سے کٹا ہوا ہے اور یہ الگ تھلگ حصہ کسی وقت ایک قلعہ بند محل تھا یا بُرجِ قلعہ تھا جو یہاں بنا ہُوا تھا۔ اس وقت چند قبریں اور ایک بلوچ زیارت ڈھیری کے وَسط کو گھیرے

ہوئے ہیں اور زرخیز میدان کے اُوپر شمال میں ایک نسبتاً بعد کے دَور کی ہوا چکّی کے آثار موجود ہیں۔ ڈھیری کی چوٹی پر تھوڑا سا ملبہ ہے کیونکہ اینٹیں پُختہ ہونے کے باوجود تحلیل ہو کر سُرخی مائل مٹّی بن گئی ہیں۔ عام سُرخ ظروف کی کافی تعداد موجود ہے لیکن وہ سب ٹکڑے ٹکڑے ہیں۔ جنوُبی ڈھیری یا بُرج بے شکل کھنڈرات کا ڈھیر ہے اور زوال کے ایسے مرحلے میں ہے کہ ڈھیری کی قدُرتی سطح سے بالکل ممیّز نہیں ہو سکتا۔ کچّی اینٹوں کے ملبے پر بوسیدہ پُختہ اینٹوں کی سُرخ مٹّی کی دھاریاں پڑی ہوئی ہیں اور صرف شیشہ بنائی ہوئی اینٹوں کے چند ناقابلِ تحلیل ٹکڑے مٹّی کے ڈھیر یا شگافوں میں جمے ہُوئے ہیں جو موسمی عمل نے پیدا کر دیئے ہیں اور ٹوٹے ہوئے ظروف سے بھرے پڑے ہیں۔ کوئی ٹکڑا روغن کے آثار ظاہر نہیں کرتا۔

بُرج اور مینار مدّتوں پہلے شکل اور امتیاز سے محروم ہو چکے ہیں لیکن ڈھیری کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ دفاعی مستعمرات کے حاشیہ کی نشاندہی ہو سکتی ہے۔ مؤخر الذکر اتنے شکستہ ہیں کہ قریب سے ناقابلِ شناخت ہیں لیکن مغربی سطح مرتفع سے اجزائے منتشر (جنہیں گہرے شگافوں اور خلاؤں نے جُدا جُدا کر دیا ہے) جُڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور قدیم قلعہ بندیوں کا ایک عام مجموعی تاثر لیا جا سکتا ہے۔ مشرقی طرف ایک چھوٹے سے قطعۂ کاشتہ میں کوئی بیس گز لمبی ڈھیری نظر آتی ہے اور کوئی ایک میل مغرب کی طرف ایک انحطاط پذیر احاطہ موجود ہے گو گادا اور ریت کے تردد نے اسے ڈھانپ لینے کی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ صرف یہی آثار ہیں جو رام شاہرستان کے موجود ہیں گو اس کا نام ہو بہو مشہُور و معروف ہے۔

شہر کی تباہی کی روایت :-

رام شاہرستان کی تباہی کی مشہُور عام روایت یہ ہے کہ ہلمند کا ایک قدیم بند ٹوٹا تو دریا شہر پر چل پڑا، اور اسے لتاڑتا اور بہاتا ہوا لے گیا، اور اہلِ شہر جانیں بچانے کے لئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے ایک اور شہر بسا لیا اور زاہدان (جو قریب ترین اور بہترین کھنڈرات کا مجموعہ ہے) انہی گریختہ لوگوں نے آباد کیا۔

رام شاہرستان اور اس کی تباہی کا حل مطابق استخری :-

استخری نے رام شاہرستان کا جو حال لکھا ہے اور جس کا ترجمہ سر ایچ رالنسن نے کیا درج ذیل ہے:-
"کہا جاتا ہے کہ اوّلیں ایرانی خاندان کے دور میں صوبے کا دارالحکومت سجستان تا کرمان کی شاہراہ پر واقع تھا۔ جب آپ رَسک کے مقابل دارک کو جائیں، زرنج سے تین منزلوں کے فاصلے پر۔ اس کی بنیادیں اور کئی عمارات آج بھی موجود ہیں۔ شہر کا نام رام شاہرستان تھا اور ہر سجستان اس میں بہتی تھی۔ ہلمند کا بند پھٹنے کی وجہ سے نہر کا پانی کم ہوگیا اور اس سے کٹ گیا اور اس کی خوشحالی گھٹ گئی اور لوگ یہاں سے چلے گئے اور زرنج بسالیا۔"

الاستخری کے بیان کا تجزیہ :-

ہر سجستان یعنی آج کل کی رودِ سیستان قدیم جگہ کے پاس بہتی ہے۔ اور استخری کا بیان ماسوائے سہ منزلہ فاصلہ کے ہر بات میں مقامی روایات سے مطابقت رکھتا ہے اگر راشک کی قدیم جگہ کی روایت صحیح ہے تو رام شاہرستان کی شناخت یقینی ہے لیکن موڑ اور چکروں کو شامل کر کے بھی ۱۲ میل کا سیدھا فاصلہ ۵ ا میل سے زیادہ نہیں بڑھایا جا سکتا۔ خلیج فارس کی بندرگاہوں سے ہرات تک کا تجارتی راستہ جو سیستان سے گذرتا ہے واضح طور پر پہچانا گیا ہے اور رَسک یا راشک اس پر واقع ہے۔ مذکورہ بیان میں نہر سجستان کو غالباً راشک سے زیادہ فاصلے سے عبور نہیں کیا جاتا تھا لیکن دارک نام کی کسی جگہ کا کوئی نشان نہیں ملا۔

قدیم تجارتی راستہ کی دریافت :-

مذکورہ تجارتی راستہ موجودہ قلعہ سہ کوہا کے مشرق کی طرف سے گذرتا تھا اور اسے چند میل مغرب میں چھوڑ دیتا تھا۔ جب یہ راستہ شمالی اور جنوبی ڈیلٹا کو علیحدہ کرنے والے دشت سے گذرتا ہے تو اس پر پختہ اینٹوں اور چونے سے بنے چھوٹے چھوٹے ستون نصب تھے۔ یہ ستون سڑک کی دائیں اور بائیں طرف کے سامنے بنے تھے بستون کھل گئے ہیں۔

لیکن ان کی سُرخ مٹی نے اس زمین کو داغدار کر دیا ہے جہاں یہ گھڑے تھے اور جو آب ناقابل محو پھیکے نارنجی رنگ کی ہوگئی ہے۔ ان دھبّوں میں چونے کے گارے کے ٹکڑے مل سکتے ہیں۔ قدیم تجارتی راستے کا یہ حصّہ اب بھی موجودہ ڈیلٹا کے مشرقی اضلاع سے جنوب کی طرف سیدھا راستہ ہے۔ یہ بام تک کرمان کو بھی جاتا ہے لہٰذا دارک یقیناً اُس راستے پر ہوگا۔ یہ موجودہ سہ کوہا نہیں ہو سکتا۔ تجارتی راستہ اس علاقے سے گزرتا ہے جہاں ماچھی کا دیوان خانہ اور حوضدار کا حالیہ قلعہ پائے جاتے ہیں جو صرف پچھلے سو سال کے لگ بھگ ہی خالی اور متروک ہوئے ہیں۔

دارک کا قصبہ (یا ضلع) :۔

قلعہ حوضدار کے جنوب میں ایک ڈھیری ہے جو کوئی پندرہ یا بیس فٹ اُونچی ہے اور قطر میں کوئی ۳۰۰ فٹ ہے۔ بظاہر یہ مصنوعی نہیں ہے جس کے شمالی سرے پر ایک آخور یا رُستم کے گھوڑے کی کُھرلی ہے۔ اس کے شمال میں اس کے اور حوضدار کے درمیان ایک خاصا پرانا کھنڈر یا کشِ رُستم ہے۔ روایت کے مُطابق یہ وہ میخ تھی جس سے رُستم کے گھوڑے کی پچھاڑی باندھی جاتی تھی۔ آخور ایک پرانے مینارِ سکوت کا خول ہے۔ کھنڈرات اور اس کی روایت سے ظاہر ہے کہ یہ جگہ کسی پرانی بستی کی جگہ تھی۔ یہ بستی بنائے گئے کے کھنڈرات سے پچاس میل سے زیادہ فاصلے پر ہے جو زرنگ سے تین منزلوں کے فاصلے پر ہے بشرطیکہ وہ فاصلہ راشک (یا رام شاہرستان) کی بجائے دارک سے سمجھا جائے۔

رام رود :۔

سر ایچ رالنسن اس قدیم تر دارالحکومت کو رام رود کے کھنڈرات میں ڈھونڈتے تھے۔ یہ جگہ نئی ہے گو ایک قدیم مقام پر ہے۔ رامرود کے قرب و جوار میں کسی بڑے شہر یا قصبہ کا کوئی نشان نہیں اور نہ ہی کوئی ایسی روایت ہے۔ یہاں کا موجودہ قلعہ ایک مختصر شے ہے۔ مزید برآں یہ سیستان طاس کے قریباً جنوبی سرے پر ہے اور اس کے اور شیلا کے درمیان کسی قصبے کے آثار نہیں ہیں۔ موجودہ رامرود کو ملک بہرام خان کی نہر کی ناکامی کی وجہ سے خیر باد کہہ دیا گیا جس کا مناسب جگہ

پر بیان ہوا ہے۔ ایسی ہی اُفتاد سے اسی جگہ پر کوئی اور شہر بھی ماضی میں نہ ٹھہر سکتا۔ موجودہ ہلمند سے رود بیابان کا مقام انفصال کوئی ساٹھ میل مشرق کی طرف ہے اور یہاں کوئی تغیر مغربی علاقے کو غیر آباد کر دیتا۔ صرف اسی اعتبار سے رامرود الاستخری کے بیان در بارہ رام شاہرستان پر منطبق ہو سکتا ہے۔ رامرود نبالے گے سے ۷۵ میل[1] ہے۔ یہ روایت بھی اغلب معلوم ہوتی ہے کہ فراہمیٔ آب بند ہونے کی بجائے رام شاہرستان سیلابوں سے غیر آباد ہوا۔ ایسی صورت میں ایک نئے دارالحکومت کی بجائے بند کو بحال کرنے یا از سرِ نو تعمیر کرنے سے مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔ سیلاب کا خطرہ سیستانی ڈیلٹا کے تمام قدیم و جدید مقامات کو لاحق رہا ہے۔

---

[1] پچھتر میل کا فاصلہ تین منزلوں سے بہت زیادہ ہے۔ مشرقی رسم یہ تھی اور ہے کہ کسی بڑے شہر سے پہلی منزل مختصر ہو۔ مسافر عموماً رات کو شہر کے باہر ٹھہرتے ہیں اور پھر وہاں سے دن کی منزل طے کرتے ہیں۔ ایسی منزلوں میں سرسبز و آباد علاقوں سے گذرتے ہوئے بارہ میل کا فاصلہ اتنا مختصر بھی نہیں ہے۔ بہرکیف پرانے دارالحکومت کے نام کی موجودگی اور مقامی روایات مسلسل کو محض اس لئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ نادعلی اور رام شاہرستان کا فاصلہ مختصر ہے جبکہ دیگر حالات استخری کے عین مطابق ہیں۔ استخری اور ابن رستہ کی بیشتر معلومات شنید تھیں۔ اور عربی ہندسوں ۲ اور ۳ میں بہت معمولی فرق ہے اور ایک خراب یا کم نگاہ کاتب بھی غلطی کر سکتا تھا۔ زرنج سے راسک تک دو منزلیں اصل صورت حال کے عین مطابق ہوں گی۔

باب ہفتم

نباتئے کے شہر کیخسرو

نباتئے کے با زرنج (موجودہ نادعلی) کے کھنڈرات :-

رام شاہرستان کی تباہی کے بعد آباد ہونیوالے اس قدیم شہر کے مقام کی نشاندہی کرنے والے کھنڈرات کے بیان سے پہلے ایک دفعہ پھر ابن رستہ اور الاستخری کے سفر نامہ کی طرف رجوع کرنا ضروری ہوگا اور مشہور مستشرق سر ہنری الُنس مرحوم کے تراجم سے استفادہ کرنا ہوگا۔ ہمیں صرف جوین سے زرنج تک کے سفر سے تعلق ہوگا۔ منزلوں کے نام مختلف ہیں ابن رستہ کے ہاں یہ منزلیں ہیں :-

کُرنگ یا کُرنج، ہسانک، زرنج جبکہ الاتخری کے مطابق یہ پڑاؤ بنشر (پیشاوران) کرکُویہ اور زرنج تھے۔ ابن رستہ کا ہسانک اور سیستان پر ربیع کے حملہ کے بیان کا ہسُن ایک ہی نام کے دو ہجے ہیں۔ اس مؤرخ کے مطابق حملہ آوروں کا راستہ کرکُویہ سے پانچ میل دُور سے گذرتا تھا۔ چونکہ عرب شمال کی طرف بڑھ رہے تھے لہٰذا ہسُن یا ہسانک کرکُویہ کے شمال مغرب میں ہوگا اور تخت شاہ کی بستی کی پرانی ڈھیریاں یا مزید مشرق میں گاوِگز کی ڈھیریاں غالباً قدیم ہسُن کی امین ہیں جن کے اُوپر اب ایران و افغانستان کے سرحدی ستون نصب ہیں۔ لہٰذا ابن رستہ کا راستہ الاستخری کے بیان کردہ راستہ کے مشرق میں تھا جو غالباً ایک متبادل راستہ تھا اور اُس وقت کے ہلمند سے بچ کر زرنج کو

نکل جاتا تھا۔ استخری کے بیان کے مُطابق بشر ادر کرکویہ کے دَرمیان ہلمند کا باقیماندہ پانی ایک پُل کے ذریعے پار کیاجاتا تھا جو میاں کنگی کے جنگل میں دَریافت ہونیوالا دو محرابوں کا پُل ہوگا جو کارکو شاہ ڈھیری کے شمال میں ہے اور اب تخت پُل کہلاتا ہے۔ اس کے اور نادعلی کے کھنڈرات کے دَرمیان استخری کے مُطابق فاصلہ ۴ فرسخ یا قریباً ۱۲ میل تھا جو اب بھی ان دونوں کے مابین سیدھا فاصلہ ہے۔

ہرات کا راستہ :-

ابن رُستہ کے مطابق کُرنگ سے ہسانک جانے کے لئے اگر پانی حائل ہوتا تو ۴ فرسخ (۱۶ میل) کو عبور کرنے کے لئے کشتیاں درکار ہوتیں۔ لیکن اگر مسافر کو سامان پار لے جانے کی ضرورت نہ ہوتی تو وہ متبادل یا صحرائی راستہ اختیار کر لیتا جو بائیں طرف تھا۔ سر ہنری رالنسن کے ترجمہ کے الفاظ میں " آپ کو دریائے نِشک کے سوا اور کوئی دریا وغیرہ عبور نہ کرنا پڑتا، کیونکہ آپ آنبائے یا ہاموں اور دائیں طرف کے ہندمند سے نکلتے اور ہسانک کے درے پہنچتے لیکن دار الحکومت پہنچنے سے دو فرسخ پہلے آپ کو ہندمند اور اس کے بعد ایک اور دریا ' وادی اُبَرس پار کرنے پڑتے اور پھر آپ سجستان پہنچتے"۔ یہ راستہ اب پہچانا جاسکتا ہے کیونکہ نِشک کا ضلع اور قصبہ شناخت کئے گئے ہیں اور نام بھی زندہ ہے۔ جوین سے متبادل راستہ دشت کے اگلے سرے کے ساتھ ساتھ چلتا تھا، اور ہامون پُزہ کے سرے پر تخت رستم ڈھیری سے گذر کر اور خواجہ سیاہ پوش اور پوست گاڈ کے کھنڈرات کے پاس سے ہوتا ہوا چکانسُر کو پار کرکے نادعلی پہنچتا ہے۔

نِشک اور سِینارود، وادی ابرس :-

نِشک خاش رود کے دائیں کنارے پر ایک چھوٹا سا ضلع ہے اور مورّخ کا دَریائے نِشک یقیناً خاش رود ہوگا۔ اس وقت مینو اور نادعلی کے دَرمیان دلدلی قطعہ ہے جس میں نہر جرد کی کا فالتو پانی آتا ہے جو ۱۸۳۰ تا ۱۸۳۹ کے ہلمند کی جگہ پر ہے۔ لہٰذا ابن رُستہ میں

مذکور گذرگاہ ہلمند بلاذری میں مذکور سینا رود ہوگی جسے پہلے پہل عبید بن زیاد نے فتح قندھار کے لئے جاتے ہوئے کِش (خشت یا کشت خاش کے مشرق میں) سے گذر کر عبور کیا۔ وادی اَبَرس غالباً ایک بڑی نہر تھی جو قلعہ کنگ کے شمالی علاقہ کو سیراب کرتی تھی۔ جس کے آثار گریزاں مجھے مزید شمال میں ملے۔

الاستخری اور ابن رُستہ کا دور :-

ان دونوں کی معلومات مرقومہ دو مختلف ادوار سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان دونوں میں سے ابن رُستہ مقدم تھا جو نویں صدی کے اواخر اور دسویں صدی کے اوائل میں ہوا۔ اُس کی تاریخ ۹۰۳ء میں مکمل ہوئی۔ الاستخری نے ۹۵۱ء میں اپنی تصنیف مکمل کی[1]۔ اوّل الذکر کا بیان کردہ راستہ کُرنگ سے ہسانک اور پھر سیستان کے دارالحکومت تک اس وقت زیر استعمال تھا جب مؤخرالذکر کا بیان کردہ پُل ابھی تعمیر نہ ہوا تھا جس کے بعد پہلا راستہ ترک کر دیا گیا۔ پُل بنتے ہی عقب ہلمند کا پار کرنا حذف ہوگیا کیونکہ اسی مشکل سے تو تعمیر پُل کی تحریک ہوئی تھی۔

نادعلی اور زرنج :-

آزادانہ ذرائع سے جو معلومات ہمیں زرنج کے مقام کے متعلق ملی ہیں جو دسویں صدی عیسوی میں سیستان کا دارالحکومت تھا وہ مقامی روایت کی تصدیق کرتی ہیں کہ نادعلی کے کھنڈرات کیخسرو کے بنا کردہ شہر کے ہیں جسے عرب زرنج کہتے ہیں اور جو رام شاہرستان کو خیرباد کہنے کے بعد بسایا گیا تھا۔

کھنڈرات کی حالت ۵-۱۹۰۳ میں :-

ان کھنڈرات کو بیان کرنا مفید ہوگا جیسا کہ ہم نے انہیں ۱۹۰۳ میں پایا۔ ان کا زیادہ

---

[1] "دی لینڈز آف دی ایسٹرن کیلی فیٹ" گائی لاسترانج

حصّہ آبی عمل اور بلمند کی آوردہ گاد سے تباہ ہو گیا ہے۔ صرف اندرُون شہر کے کچھ آثار موجود ہیں۔
بھاری بھر کم دیواریں ڈھیریوں کی ایک مسلسل قطار کی صورت میں موجُود ہیں اور ان میں مخصوص ایک
بے شکل ملبے کا ڈھیر ہے جو شکستہ و ریختہ ظروف اور اینٹوں پر مشتمل ہے۔ صرف ایک مینار
کھڑا ہے۔ یہ کھنڈراتی ملبہ ایک جزیرہ ہے جو سیلاب کی زد سے باہر یا محفوظ ہے جو اکثر
یہاں آتا رہتا ہے اور زرخیز مٹی بچھاتا رہتا ہے۔ اندرون شہر کے آثار بھی مٹ رہے ہیں اور
لوگ اسے مخزن الحجر سمجھتے ہیں جہاں کے سنگ و خشت وہ تعمیر کے لیے لے جاتے ہیں ایک
ٹھیکیدار نے ضلع چکانسر میں بارود سازی کا ٹھیکہ لے رکھا ہے اور وہ اس کی تباہی مکمل کر رہا ہے
کیونکہ اس کے مزدُور اس کے کونوں کھدروں میں سے شورہ ڈھونڈتے ہیں جو ایسی بستیوں
میں بکثرت ہوتا ہے اور نادعلی کے کھنڈرات سے با افراط نکالا جاتا ہے۔

اندرون شہر کی دیواریں :۔

دیواروں کی آسانی سے نشاندہی ہوسکتی ہے۔ البتہ نشانات بے قاعدہ ضرور ہیں۔ موجُودہ
عمارات کا ایک مجموعہ اور رستم خان نامی ایک شخص کا باغ حفاظتی حصّوں کے جنوب مشرقی زاویے
پر ہیں اور یہیں جب زمین صاف کی جا رہی تھی تو دیگر کھنڈرات کی بنیادیں بھی ننگی ہو گئیں جو مدرسہ
یا کالج کی بُنیادیں شناخت کی گئیں۔

قلعہ کی ڈھیری اور ایک چوڑی خندق :۔

کوئی ۱۰۰ فٹ چوڑی خندق (جو اب کافی حد تک گاد سے بھر چکی ہے) کے ذریعے
اندرون شہر کے کھنڈرات سے جُدا ہوتی ہُوئی ایک بڑی ڈھیری ہے جو زمین کی سطح سے
کوئی ۹۰ فٹ اُونچی ہے۔ یہ قدیم قلعہ کی جگہ ہے اور اس کی جنوبی ڈھلان پہ بھاری بھر کم
قلعہ بندیوں کو پہچانا جا سکتا ہے بالخصوص اس مدوّر بُرج کو جو جنوب مغرب کی طرف خندق
سے بننے والے زاویہ کے اوپر ہے۔ خندق کی گاد اب ڈھیری کی ابتدا تک آگئی ہے۔
اور خندق کے اندرون شہر کے کھنڈرات سے دُور پہلوؤں کو پہچانا ہی نہیں جا سکتا۔ اطراف

خندق اینٹوں سے پٹی پڑی ہیں اور انہی سے علی خان سنجرانی نے موجودہ قلعہ بنایا جس کی چوٹی اب ایک باقاعدہ افغان فوجی دستے کی چوکی ہے۔ یہ چوکی نادعلی کہلاتی ہے۔ اور یوں ایک پرانی جگہ کو ایک نام دیدیا گیا ہے۔

نادعلی کی سُرہ دک اور سفید ک ڈھیریاں :-

اندرونی شہر کے شمال مشرق کی طرف دو اونچی ڈھیریاں ہیں جو ایک زرخیز میدان پر کھڑی ہیں اور اُس کی سطح سے ۹۰ فٹ سے زیادہ بلند ہیں۔ یہ بہت سی عمارات کے کھنڈرات ہیں۔ شمالی ڈھیری زیادہ تر یا بالکل پختہ اینٹوں کی عمارت کا ملبہ ہے اسی لئے اس کی ڈھلانیں سُرخی مائل ہیں اور یہ سُرہ دک (سُرخ پہاڑی) کہلاتی ہے۔ اس کے آٹھ میل جنوب میں اتنی ہی ایک اور بلند ڈھیری ہے جو کچی اینٹوں کی عمارات کا ملبہ ہے اور اسی لئے یہ زرد مٹیالے رنگ کی ہے اور سفید ک (سفید پہاڑی) کہلاتی ہے۔ یہ ڈھیریاں پورے ماحول پہ چھائی ہوئی ہیں اور ہر سمت میں دُور تک نظر آتی ہیں بشرطیکہ تمرس جنگل حائل نہ ہو۔ جن عمارات کا یہ ملبہ ہیں وہ قلعے تھے یا قلعہ بند محلّات۔

نادر شاہ کی کہانی :-

سفید ک وسطی یا اندرونی شہر سے پوری ایک میل اور سُرہ دک مزید ۳/۵ میل دُور ہے۔ یہ فاصلے اس بلوچ روایت کو باطل ثابت کر دیتے ہیں کہ یہ ڈھیریاں نادر شاہ نے نادعلی کو تباہ کرنے کے لئے اپنا توپخانہ نصب کرنے کے لئے بنائی تھیں۔ نادر کی کسی توپ کا دہانہ اتنا مؤثر نہ تھا۔ ڈھیریاں نادر شاہ سے منسوب ہونے کی وجہ سے دَمدمہ کہلاتی ہیں جو آخری عظیم ایشیائی فاتح تھا اور جس کے بعد یورپ کے اثر و نفوذ نے اس قسم کے واقعات کو ناممکن بنادیا[1]۔ ان ڈھیریوں اور اندرونی شہر کے درمیانی فاصلہ میں سیلاب آوردہ مٹی کا ایک ذخیرہ ہے جو

---

[1] یہ بیانا تحصیل حاصل ہے کہ نادر شاہ نے کبھی نادعلی کا محاصرہ نہیں کیا اور نہ ہی اس پر قبضہ کیا جو اس کے گذرنے سے پہلے ہی کھنڈر بن چکا تھا۔
جی۔ پی۔ ٹیٹ

اَب بھی کبھی کبھی دریا کی طغیانی سے تازہ ہو تا رہتا ہے لیکن گاد کی اس چادر میں سے بڑی بڑی عمارتوں کے کھنڈرات اب بھی اینٹوں کے ڈھیر یا حصّہ دیوار کی صورت میں جھانکتے ہیں جو آبی عمل اور نمی کی مسلسل یورشوں کے باوجود سلامت رہے ہیں۔

نادعلی کا مدرسہ :-

سُرہ دک کے شمال مشرق میں سفید مٹی کی ایک لمبی اور پست ڈھیری ہے جو یقیناً کسی بیرونی دیوار کا کھنڈر ہے جو اُس پہاڑی سے ۴۰۰ گز پیچھے کو تھی۔ اس ڈھیری کے شمالی سرے پر دروازے کی جگہ ہے جو بیرونی شہر کا شمالی دروازہ تھا۔ دونو ڈھیریوں کے درمیان آب زدہ اور شور زمین ہے اور سُرہ دک کے مقابل سفیدک کی ابتدا میں ایک مدرسہ (کالج) یا دربار کے آثار ہیں۔ عمارت کے سرے شمال مغرب اور جنوب مشرق کی طرف ہیں اور ہر سرے پر ایک ایک دَروازہ تھا۔ مرکز ایک کھُلی مستطیل تھا جس کے دوطرفہ ستونوں کی قطار پر بالائی کمرے بنے ہوئے تھے۔ جنوب مشرقی دروازہ کے دونو طرف تباہ شدہ کمروں کا ایک مجموعہ ہے جن کی بالائی اور زیریں منزل دَروازے یا محرابِ داخلہ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کھنڈرات سے طرز تعمیر خوب واضح ہے۔ بنیادیں اور زمین کے اوپر ۳ یا ۴ فٹ تک کی تعمیر پختہ اینٹوں سے بنائی گئی تھی لیکن بالائی حصّے سکھائی ہوئی اینٹوں سے بنے تھے۔ گارے کی بجائے بھیگی ہوئی مٹی استعمال ہوتی تھی۔

نادعلی کے قریب بُرج اسپ :-

اندرونی شہر کے شمال مغرب کی طرف سفید مٹی کی کئی ڈھیریاں ہیں اور ان میں سے ایک پر کوئی ڈیڑھ میل کھنڈرات سے دُور ایک تباہ شدہ لیکن موجودہ دَور کا بُرج اسپ ایستادہ ہے جو رُستم کے گھوڑے کا اصطبل تھا۔ یہ ڈھیری دیگر ڈھیریوں سے اُونچی ہے۔ ارد گرد پرانی عمارتوں کے نشانات ہیں جو کچی اینٹوں اور ملبے کی ڈھیریاں ہیں۔ کھنڈرات کے مغرب کی زمین سالوں سے زیر کاشت ہے اسی لئے یہاں مشرق کی نسبت ڈھیریاں کم ہیں۔

Scanned by CamScanner

بنالے کے کی وسعت :-

آثار و شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ بیرونِ شہر شمال میں دیہہ گل محمد تک پھیلا ہوا تھا اور پھر بُرج آس سے ہو کر جنوبی سمت میں جان محمد، ٹبہ مری، دیہہ کھوجہ اور عالم خان سے ہو کر مشرقی ڈھیری تک آجاتا تھا جو اُس کی دیوار کا شمال مشرقی رُخ تھا۔ ابھی تک ایسے لوگ زندہ ہیں جنہوں نے نادعلی کے کھنڈرات کو ریت کے تودوں میں نیم ملفوف دیکھا ہے جو بہت دُور دُور تک ہر طرف پھیلے ہوئے تھے لیکن ہلمند کی یورشیں اور نمی کے اثرات اتنے طاقتور تھے کہ کھنڈرات ان کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ۱۹۰۲ کی خشک سالی میں ہلمند کچھ عرصہ خشک رہا تو بُرج آس کی قریبی گذرگاہ میں پختہ عمارتوں کی بنیادیں عُریاں ہو گئیں بلکہ گذرگاہ زیرِ آب ہونے کے بعد بھی دیواریں اور اینٹیں کناروں سے جھانکتی رہیں۔

شمال کی طرف پست ڈھیریوں کا ایک سلسلہ دو میل تک پھیلا ہوا ہے حتیٰ کہ ریگزار اسے چھپا لیتے ہیں۔ یہ ڈھیریاں غالباً شہر کے مضافات و نواحیات ہیں۔

اندرونِ شہر کے کھنڈرات :-

شہر کے اندر اینٹوں، ٹھیکروں اور دیگر ملبوں کے ڈھیر اِدھر اُدھر زمین پر بکھرے ہوئے ہیں اور اُونچی اُونچی ڈھیریوں کی شکل میں بھی ہیں لیکن اندرونی شہر کی دیواروں کے اندر کے سب کھنڈرات عمارتوں کے ہیں جو پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی گنجان عمارات تھیں۔ کچی اینٹوں کی عمارتوں کے آثار نہیں ملتے البتہ دیواروں کے بالائے زمین حصے انہی سے بنتے تھے۔

ہشت پہلو خشک دُختر :-

دیوار ہائے شہر کے اندر کا واحد اہم کھنڈر مینار بلکہ حصہ مینار ہے جو ۲۵ یا ۳۰ فٹ اونچا ہے۔ یہ گری ہوئی اینٹوں کے ڈھیروں میں گھرا ہوا ہے۔ یہ ہشت پہلو ہے جس کا ہر پہلو ملبے کے ڈھیروں کے اُوپر ۱۰ فٹ ہے۔ موجودہ سطح زمین سے کوئی ۲۵ فٹ اُوپر ایک بالکونی کے آثار ہیں جو ہر طرف سے آگے کو نکلی ہوئی تھی۔ بڑی بڑی منقش اینٹیں ابھی تک

اپنی جگہوں پر نصب ہیں اور ان سے اوپر مینار کا بالائی حصّہ ایک سادہ عمود کی صورت میں تھا۔ اور بالکونی سے نچلے حصّے سے قطر میں بہت کم تھا۔ ہر روزن کے وسط میں ایک نیم مدّور پشتہ ہے جو بالکونی تک آتا ہے۔ بالکونی تک آنے کے لئے چکّر دار سیڑھیاں تھیں، جو عمود کے مرکز کو بند کر دیتی تھیں اور زمین کے اوپر کا پہلا چکّر ایک محراب دار کمرہ تھا۔

مینار کا درج ذیل بیان سر الیف گولڈ شمٹ کے ۱۸۷۲ کے مشن کے کاغذات سے ماخوذ ہے۔ یہ موجب دلچسپی ہوگا کیونکہ یہ اس عمارت کی نوعیّت کا مظہر ہے جس کا ایک حصّہ مینار تھا اور جو دستبرد زمانہ کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ "دلچسپ ترین کھنڈر ایک بہت بھاری بھرکم خشتی ہشت پہلو مینار ہے جس میں بہت اچھا مسالہ لگا ہوا ہے اور جو دیوار ہائے شہر کے جنوب مغربی گوشہ میں واقع ہے اور جس کے پاس ہی بڑی بڑی اینٹوں سے بنے ہوئے حوض اور ایک بہت کشادہ دروازے کے آثار موجود ہیں۔ اس مینار کے اندر ایک چکّر دار محراب دار زینہ ہے جس کے ۴۰ قدمچے تھے جن میں سے ہر ایک چار فٹ چوڑا تھا۔ اس سے چوٹی پر جا سکتے تھے۔ یہ غالباً موذّن کے لئے تھا یعنی ماذینہ تھا اور اس کے اندر دو کمرے تھے۔ اس مینار اور سرہ دک اور سفید ک ڈھیریوں کے درمیانی کھنڈرات کو ارکان مشن نے ایک وسیع قطعۂ زمین قرار دیا جس سے ٹھوس خشتی بنیادیں اور کمرے نکلتے رہتے ہیں یا جس پر بڑی بڑی اینٹوں کے ٹکڑے یا سابقہ نسلوں کے ظروف اور منقّش ٹائیلوں کے ٹوٹے پھوٹے نمونے بکھرے ہوتے ہیں۔"

مینار ایک مستطیل کے شمال مشرقی کونے پر ایستادہ تھا جس کے اردگرد کمرے تھے، وسطِ صحن اب ایک گاد آلود نشیب ہے اور اس کے اردگرد دیواروں کے ٹکڑے اور اینٹوں کے ڈھیر ۸ تا ۱۰ فٹ اونچا کنارہ بنے ہوتے ہیں۔ مینار کے عین شمال میں اینٹوں کے ملبے کی اونچی ڈھیریاں ہیں۔ بھاری بھرکم دروازہ اور حوض کا اب کوئی نام و نشان نہیں۔

ظروف آلود ڈھیریاں :۔

ظروف پارے مختلف النوع ہیں ۔ عام روغنی خاکی ظروف میں کھردری چینی مٹی اور عام مٹی کے ظروف پارے ہیں جن پر سفید روغن ہے اور اچھے نیلے رنگ میں پھول یا بیل بوٹے بنے ہوتے ہیں ۔ عام سرخ ظروف بکثرت ہیں اور نفیس چینی کے ظروف پاروں پر ایک یکساں سخت اور پیلے زیتونی رنگ کا روغن ہے جس کے نیچے سفید شیشہ نما بے روغن ظرف ہوتا ہے ۔ ایک بڑے کنوئیں کی کہانی بھی سنی گئی جو کچی اینٹوں کا بنا ہوا تھا اور جو انسانی ہڈیوں سے بھرا ہوا پایا گیا لیکن یہ کھنڈرات میں کہیں نہ مل سکا ۔

استخری کی فہرست ابوابِ زرنج :۔

سر ایچ رالنسن کے نہایت قیمتی تذکرۂ سیستان میں ابواب زرنج کی ایک فہرست دی گئی ہے جو الاستخری سے لی گئی ہے اور متاخرین کے زیرِ استفادہ رہی ہے ۔ اندرونی شہر کے پانچ اور بیرونی کے تیرہ دروازے تھے ۔ موخر الذکر کے نام جنوب سے شروع ہو کر مشرق کا چکر کاٹتے ہوئے شمال کے رخ پر مندرجہ ذیل تھے :۔

(۱) منا (۲) جرجان (۳) سرک (۴) سرک (۵) شعب (۶) نوح کرہ (؟) (۷) علقم (۸) نشک (۹) کرکویہ (۱۰) استرس (۱۱) غنجرہ (۱۲) نسان (۱۳) رودگران ۔ ایک اور جگہ پر مذکور ہے کہ زرنج کا جنوب مشرقی دروازہ جو غلہ آفرین ضلع کو جاتا تھا' بابِ تیمّم کہلاتا تھا ۔ یہ غالباً بابِ شعب تھا جو اب بھی سیستان میں آباد علاقہ کے جنوبی[1] یا زیریں حصہ کے معنی دیتا ہے ۔

ابواب و عمارات کی نشاندہی :۔

اسی ماخذ کے مطابق " شہر کی بڑی عمارتیں یہ تھیں :۔

(۱) اندرونی شہر کے بابِ فارس (یا جنوبی) کے پاس جامع مسجد (۲) ابوابِ فارس اور تیمّم

---

[1] شعب یا زیریں جنوبی کے معنی میں آتا ہے جیسے شعب آب (دریا یا نہر کا جنوب) بالا بمعنی شمال آتا ہے جیسے بالائے آب (دریا یا نہر کا شمال) شمال کے لئے پشت بھی آتا ہے جیسے پشت کوہ (پہاڑیوں یا سلسلہ کا شمال)
جی ۔ پی ۔ ٹی

کے درمیان بیرونی شہر میں دربار گاہ (۳) مسجد کے قریب اندرونی شہر میں قید خانہ (۴) مسجد کی پشت پر قید خانہ کے قریب ایک اور دربار گاہ (۵) ابواب تیم اور فارس کے درمیان لیث کے بیٹوں یعقوب اور عمرو کے محلات اور (۶) شہر کے اندر ابواب کرکویہ اور نشک کے درمیان صندوق نامی مشہور قلعہ جو عمرو بن لیث کا خزانہ تھا" ان کے علاوہ بازاروں، مساجد، بیمارستانوں، منڈیوں اور اندرونی نہروں اور حوضوں وغیرہ کا بھی ذکر ہے۔ اندرونی شہر کی دیواروں کے کھنڈرات میں جو بے ڈھنگے خلا ہیں، غالباً ابواب فارس اور تیم کی نشاندہی کرتے ہیں۔ سرہ دک اور سفیدک کی ڈھیریاں لیث کے بیٹوں، یعقوب اور عمرو کے محلات کے آثار ہیں۔ سیستان کے دار الحکومت اور ان ابناء الصفار کی جائے پیدائش کے سلسلہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ بیان کہ اس جگہ پر رخش رستم کی آخور تھی۔ غالباً دار الحکومت کی طرف اشارہ ہے، جہاں اب بھی لوگ برج آس کو رستم کے رخش کی آخور کی جگہ بتاتے ہیں جو اپنے آقا کی فتوحات کا ذریعہ تھا اور جسے فردوسی کے قلم نے ایسی لازوال شہرت دی جیسی بعد میں صرف سکندر کے گھوڑے کو ہی نصیب ہو سکی۔

اس میں کوئی تعجب نہیں کہ لیث کے ایک بیٹے کا محل سکھائی ہوئی اینٹوں سے بنایا گیا، سیستانی ہمیشہ اس مواد کے استعمال کے لئے مشہور رہے ہیں۔ اسوقت بھی ایسی عمارتیں موجود ہیں جو ۲۰۰ سال سے زیادہ پرانی نہیں ہیں۔ جن میں ۲۵ مربع فٹ کے خوبصورت اور قبہ دار کمرے ہیں اور جو دور زوال میں تعمیر ہونے کے باوجود خوش ساختہ ہیں۔

بابِ ہشتم

ابن رُستہ اور الاصطخری کے سفرناموں میں مذکور دیگر آثار و مقامات کی پہچان:۔

اس مقصد کے لئے ایک دفعہ پھر انہی سفرناموں کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے جن کے ترجمے، اور اقتباس سَر ایچ راؤلنسن نے پیش کئے۔ ایک ہرات سے زرنج کا راستہ ہے جو اصطخری سے ماخوذ ہے اور جو کرُنگ اور بشر کے محلات و قروع کے سلسلہ میں اُوپر مذکور ہُوا۔ دوسرا زرنج تا قلعۂ بست براستہ خاش کو بیان کرتا ہے۔

محراب دار پُل، تخت پُل کا بیان:۔

پہلے کے مُطابق مسافر بشر (پیشاوران) سے گذر کر" ایک پُل سے کرکُویہ کے راستے پر جائیگا جو ہلمند کے بیچ کھچے پانی کے اُوپر ہے۔ چار فرسخ کرکُویہ کو اور تین فرسخ زرنج کو" وہ پُل اب بھی موجُود ہے اور تخت پل کہلاتا ہے۔ یہ لمبے ترس کے خاصے گھنے جنگل میں محصُور ایک زرخیز میدان پر اپنی موجُودہ حالت زار میں کھڑا ہے۔ ٹوٹی ہوئی شاہراہ سطح میدان سے کوئی ۸ فٹ اُونچی ہے۔ سیستان میں بنائے گئے کے باہر صرف دو ہی قدیم خشتی آثار ہیں جن کا اصلی نقشہ و شکل کسی حد تک باقی ہیں۔ ایک میل قاسم آباد ہے اور دُوسرا یہ پل ہے جو دونوں میں قدیم تر ہے۔ یہ بہت مضبُوط بنا ہوا ہے اور اس پر سامان تعمیر اس کے بار آمد ورفت سے کچھ زیادہ ہی استعمال کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ معمار کو اپنی فنی مہارت پر اعتماد نہ تھا بزدلی اور ساز و سامان فراواں تھے لہٰذا مضبُوطی کے لئے اُس نے ظواہر کو قربان کر دیا۔

اس پُل کی بدنما مضبوطی کے علاوہ اس کے پیچ نہیں بٹھائے گئے تھے اور دونو طرف کا راستہ یقیناً سطح مائل تھا اور چڑھائی کو آسان بنانے کے لئے شاید راستے کو ڈھلوان بنایا گیا تھا تاکہ پُل کی ڈھلان تک رسائی ہو سکے۔ اس مقصد کے لئے کچی اینٹوں کے استعمال کا کوئی نشان نہیں ملتا۔

محرابیں :۔

پُل کی دو محرابیں ہیں جو ۱۰ فٹ چوڑے پیلپائے سے جُدا کی گئی ہیں جو اطراف پُل سے چھ فٹ باہر کو نکلی ہوئی ہیں اور پیلپائے کے دونو سرے ایک ہی مقام پر لائے گئے ہیں۔ ہر محراب کا آبی راستہ ۱۳ فٹ ہے اور نہر کے دونو کناروں کے پائے ڈیڑھ تا دو فٹ باہر کو نکلے ہوتے ہیں۔ یہ طول و عرض قدیم گذرگاہ یا دریا کی چوڑائی ہیں اور پُل ۴۰ فٹ تک اس پر محیط تھا۔ اینٹیں حسبِ معمول ایک مرکز سے نکلتی ہیں اور آبی راستے قریباً محفوظ ہیں۔ اُوپر کے راستے کی اینٹیں ٹوٹ پھوٹ گئی ہیں اور صرف اتنی ہی باقی رہ گئی ہیں جتنی محرابوں کے قائم رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔

راستہ یقیناً ۲۲ فٹ چوڑا ہوگا تاکہ لدے ہوئے اُونٹ مخالف سمتوں سے پُل کو پار کرسکیں۔ ایک پست دیوار بھی تھی جو پُل کے سروں تک جاتی تھی جہاں وہ باہر کی طرف جھکاؤ پر ختم ہوتے تھے۔ یہ شاید مٹی کی ڈھلان کو اپنی جگہ پر رکھنے کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ پُل کی دیواروں تک کھدائی سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرش سے محرابوں کی چوٹیوں تک ۱۸½ فٹ کی اُونچائی تھی۔

ایک ہزار سال میں گاد کا ذخیرہ :۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گاد یا ریت کا ذخیرہ سنگ وخشت کے فرش پر کوئی ۱۲ فٹ گہرا تھا۔ جس پانی پر یہ محیط تھا وہ آٹھ نو فٹ سے کم گہرا نہ تھا اور اسے پار کرنا خاصا مشکل تھا۔ سیستان سے تجارتی راستہ اسی پل پر سے گذرتا تھا۔ پُرانے وقتوں میں سامان

تجارت اپنی جسامت کی نسبت بہت قیمتی ہوتا تھا اور اُونٹ کو کوئی حادثہ جو اس کے بار کو نقصان پہنچاتا یا اسے ضائع کر دیتا، اس خطرناک مہم کے پُورے منافع کو خاک میں ملا سکتا تھا۔ لہٰذا پُل ایک اہم اور قیمتی تعمیر تھی اور اسی لئے اس کی مضبوطی پر اتنا زور دیا گیا۔ دو طرفہ ستون سنگ و خشت کے بھاری بھر کم ٹکڑے تھے۔ سیمنٹ کا کام مشہور سروج سے لیا گیا جو اب بھی ایران میں بکثرت استعمال ہوتی ہے اور آبی عمل سے تعمیرات کو بچاتی ہے۔ آج کل بھی اس کی تیاری کا عمل وہی ہے جو ہیڈ رڈ ٹیکیسر انے سولہویں صدی میں بیان کیا۔ تحت پل کی اینٹوں کے درمیان سروج کی تہیں اینٹوں کی طرح ہی سخت ہیں۔ تباہ شدہ پُل سے ظاہر ہوتا ہے کہ گاد سالانہ ۰۱۲ فی فٹ جمتی تھی۔

پُل پر راستے کی سمت :۔

پُل کے اُوپر کا راستہ ۳۲۹ درجے یا ۳۱ درجے شمال سے مغرب کی طرف ہے۔ اس سمت میں زیارت شاہ اسمٰعیل کے ارد گرد پُرانی عمارتوں کی ڈھیریوں کا ایک مجموعہ ہے جو پُل سے ۳ میل دُور ہے اور چونکہ تجارتی راستے کی سمت نے ہی پل کے راستے کی سمت کو متعین کیا ہوگا لہٰذا تجارتی راستہ قدیم قبرستان کے قریب ہی ہاموں میں داخل ہوتا ہوگا، جس کے پاس ہی موجودہ دیہہ سرخ ہے۔ مخالف سمت میں یعنی ۱۴۹ درجوں کی سمت پر منشوری قطب نما کی شست کار کو یا کار کوشاہ کی ڈھیری کو کاٹتی ہوئی گذرتی تھی۔ یہاں سے دیہہ سُرخ تک زمین میں ہلکی سی اُونچائی ہے جس پر موجودہ دیہہ بُرج میر گل واقع ہے۔ تجارتی راستہ اسی سے گذرتا تھا۔ پل سے چند گز مشرق میں پُرانے راستے کے متوازی ایک نظام انہار ہوتا تھا جو میر گل کے مغرب کی طرف جاتی ہیں اور جن کے ٹوٹے پھوٹے کنارے کچھ نظر آتے ہیں ان کے ساتھ ساتھ اینٹوں کے بہت سے بھٹے تھے اور دیواروں کے نشانات بھی ہیں۔

کار کوشاہ :۔

ضلع کنگی میں کار کوشاہ ممتاز ترین جگہ ہے۔ یہ ۳۰ فٹ اُونچی ڈھیری ہے جس کے اُوپر

ایک دیوار کی چھپٹی ۲۵ فٹ تک بلند ہے۔ اس دیوار کا نچلا حصہ بڑی بڑی پختہ اینٹوں کا ہے اور اس کے اُوپر کا حصّہ جو سطح زمین سے ۵ فٹ بلند ہے سکھائی ہوئی اینٹوں کا بنا ہوا ہے۔

ایک قدیم عمارت کے آثار :-

ڈھیری کی چوٹی پر ایک چبوترہ ہے جو ایک قدیم عمارت کی کرسی کا نچلا حصّہ ہے۔ دیوار اسی عمارت کا حصّہ تھی۔ پختہ اینٹوں کے بنے ہوئے کمروں کی دیواروں کی کرسی تین چار فٹ اُونچی ہے اور کمروں کا اندرونی حصّہ بالائی کمروں کے ملبے سے اینٹوں کی سطح تک بھر گیا ہے۔ یہ سب کچھ مل کر چبوترہ بنتا ہے جو کوئی اسّی فٹ مربع ہے اور جو دیوار کے سیدھے ٹکڑے کے جنوب میں ہے۔ کرسی پختہ اینٹوں کی ہے اور نقش و نگار کے لئے اُفقی و متوازی اینٹیں استعمال کی گئی ہیں۔ بڑی بڑی اینٹیں صرف مرکزی حصّہ میں استعمال کی گییں لیکن اس کے آس پاس کھودی جانے والی اینٹیں "۶ × "۱۲ ہیں جو ان کا عام سائز ہوتا ہے۔ بڑی اینٹیں غالباً بہت پہلے دَور کی ہیں اور سیستان میں کسی اور کھنڈر وغیرہ سے نہیں ملیں[1]۔

ڈھیری کا طول و عرض اور رُخ :-

یہ ڈھیری ۷۵۰ فٹ لمبی اور ۳۶۰ فٹ چوڑی ہے اور یہ جنوب مشرق کی طرف ڈھلاؤ ہے۔ ڈھیری کی شمال مغربی بنیاد کے ساتھ ساتھ سکھائی ہوئی اینٹوں سے بنے ہوئے میناروں اور بُرجوں کے نشانات ہیں جو یقیناً اس قلعہ بندی کا حصّہ تھے جو ڈھیری کی اصل عمارات کے اِردگرد بنی تھی۔

ڈھیری کے نواحیات :-

ڈھیری کے اردگرد کا علاقہ سیلاب زدہ رہا ہے۔ ہر طرف پُرانی گذرگاہیں نظر آتی ہیں۔ ۲۵ فٹ سے بھی زیادہ اُونچے تمرس کے گھنے بَن دریا آورد مٹی پر اُگے ہوئے ہیں اور ان میں سے کھنڈرات کو تلاش کرنا آسان نہیں ہے۔ بڑی ڈھیری کے عین شمال میں پست ڈھیریوں

---

[1] سرسری اندازے کے مطابق یہ "۳۰ × "۱۴ تھیں اور قریباً "۴ موٹی تھیں۔

کا ایک مختصر سا سلسلہ ہے جو کسی دیوار کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان پختہ اینٹوں کی کئی اور ڈھیریاں بھی ہیں جو شورہ آلود ہو چکی ہیں۔ یہ بڑی عمارتوں کے کھنڈر ہیں، جو ہنوز گاد کے ذخائر سے دَب نہیں سکے۔ ان مرکزی ڈھیریوں کے مشرق میں دیگر کھنڈرات بھی ہیں جن میں سے ایک صاف مقبرہ معلوم ہوتا ہے۔ ڈھیری کے جنوب کی طرف کے کھنڈرات کسی مقبرہ یا دارِ ابواب کے ہیں جن کے اردگرد کی آب زدہ ڈھیریاں دیوار کے آثار ہیں۔ یہ کھنڈرات مرکزی ڈھیری سے کوئی نصف میل ہیں۔

ڈھیری کے گرد قصبے کے آثار :۔

اینٹوں کی ڈھیریاں دُور جنگل میں بھی چھپی ہوئی ہیں جو شورہ زدہ ہیں اور کسی بڑی عمارت کے باقیات ہیں۔ کارکو کے تین میل مشرق میں ایک چھوٹا سا قلعہ یا حفاظتی چوکی یا ایک جائے پناہ یا کسی اہم شخصیت کی رہائش گاہ دیکھی جا سکتی ہے، اسے قلعہ ٹپّہ یا قلعہ ڈھیری کہتے ہیں اور اس میں بیرونی فصیل اور چھوٹا سا قلعہ واضح ہیں۔ جنگل کے دیگر کھنڈرات کو تلاش کرنے کا موقعہ نہ مل سکا۔

کارکو شاہ ـ کرکُویہ اور القرنینی :۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کارکو شاہ کسی قصبے کا قلعہ تھا جو کسی وقت ایک گنجان آباد ضلع کا مرکز تھا۔ سیستان کی مقبول طرز کے مُطابق بستی الگ الگ ڈیوڑھیوں، کاشتکاروں کی جھونپڑیوں اور کہیں کہیں قلعہ بند جگہوں پر مشتمل تھی، جہاں لڑائی یا حملہ کی صورت میں لوگ پناہ لے سکتے تھے۔ اس کی سابقہ خوشحالی کے آثار بہت کم ہیں اور وہ بھی معرض انہدام میں ہیں۔ کارکو غالباً ہاموں میں بعید ترین جگہ تھی جہاں دائمی رہائش گاہیں تھیں کیونکہ اس کے پرے یعنی شمال اور جنوب مغرب کی طرف صرف دو تین ڈھیریاں ہی مل سکی ہیں گویا آبادی بہت مختصر تھی۔ یہاں کاشتکار اپنے عارضی چھپّر بنا لیتے تھے یا مویشی چرانے والے اپنے ڈیرے لگاتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ کارکو شاہ[1] کے کھنڈرات استخری کے کرکُویہ ہیں

---

[1] لفظ شاہ پارسا لوگوں کیلئے ایک تعظیمی اصطلاح ہے، جیسے یورپ میں ریورینڈ ہے۔ سیستان میں صرف

جہاں مسعودی کے مطابق ماقبل اسلام دَور کے ایران کا تیسرا قدیم ترین آتشکدہ تھا۔ یہ نام صدیوں کے بعد کے باوجود زندہ رہا۔ سر ہنری رالنسن کے تذکرہ میں قز وینی[1] کا مندرجہ ذیل اقتباس بھی ترجمہ میں دیا گیا ہے جو استخری کے بعد کا مصنف تھا"۔ کرکو یہ سیستان کا ایک پُرانا شہر ہے جہاں ایک ایک میل کے فاصلے پر دو گنبد ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پر ایک ایک سینگ ہے جو بیل کے سینگ سے ملتا جلتا ہے یہ دور رستم کے بتاتے جاتے ہیں اور ہمیشہ سے اسیلئے تعمیر رہے ہیں۔ ان دونو گنبدوں کے نیچے مجوسیوں کا ایک آتشکدہ ہے جس کا مطلب ہے کہ بادشاہ نے اپنے محل کے پاس ہی عبادت کیلئے آگ مندر بنوالیا تھا۔ یہ آتشکدہ کبھی نہیں بُجھا کیونکہ خدّام یا جو آگ جلائے رکھنے پر مامور ہیں وہ آگ سے صرف ۲۰ کیوبٹ (۱۸ تا ۲۲ انچ کا ایک قدیم پیمانہ) دور بیٹھتے ہیں اپنا منہ اور سانس لپیٹے رکھتے ہیں اور چاندی کے چمٹوں سے ایک بالشت بھر ترس کی لکڑی اٹھاتے رکھتے ہیں اور جونہی شعلہ مدھم ہوتا ہے اسے فوراً اس پر پھینکتے ہیں۔ یہ مجوسیوں کے مشہور ترین آتشکدوں میں سے ہے"۔ مزید یہ کہ مسعودی نے اس آتشکدہ کی بنیاد بہمن بن اسفندیار سے منسوب کی جس کی بہادری کے کارنامے سیستان میں مشہور و معروف ہیں۔

قدیم عمارت غالباً آتشکدہ ہے :-

کارکو یقیناً وہی آتشکدہ ہے۔ ڈھیری کی چوٹی پر ظاہر ہونیوالی کُرسی اور دیواریں اس مندر کو سہارا دیتی تھیں۔ بہر کیف یہ نام انہی کیلئے مخصوص[2] ہے۔ غالباً اس کی پوتر تا کی کسی قدیم روایت

دو جگہیں ایسی ہیں جن کے ساتھ یہ لاحقہ استعمال ہوا ہے۔ ایک کارکو ہے اور دوسرا تباہ شدہ عرقاب قصبہ ساوری شاہ ہے۔ یہ ساوری شاہ سے منسوب ہے اور اس کو ڈھلنپنے والی چادر آب کے اُوپر ایک زیارت بھی ہے۔

[1] اُس نے اپنی کتاب ۱۲۷۵ء میں تالیف یا مکمل کی (دی لینڈ آف دی ایسٹرن کیلی فینٹ۔ گائی لاسترانج)

[2] کارکو شاہ اور ساوری شاہ کے کھنڈرات کی تعظیم غالباً بوجہ قدامت بھی ہے اور اس لئے بھی کہ یہ ماقبل اسلام دَور میں آتشکدوں کے حامل تھے۔

کی وجہ سے ہی لوگ اس کی عزّت کرتے رہے اور اسے تعظیمی نام سے پکارتے رہے ہیں۔

خارجی پارچہ باف اور موجودہ پارچہ باف :-

سیستان خوارج کی جائے پناہ بنا رہا اور وہ بہت بڑی تعداد میں یہاں آباد ہوگئے، تاریخ اسلام میں سیستانی خارجی شورشوں کا اکثر ذکر آیا ہے جو خلیفتہ المسلمین کے دینی و دُنیوی اقتدار کے خلاف ہوتی تھیں۔ سَر ہنری رالنسن کے مشرقی مصنّفین کے ترجمہ میں ایک عجیب و غریب حوالہ ہے کہ خوارج پارچہ باف تھے، اس میں مقامی رنگ کی چاشنی آج بھی موجود ہے اور اسی سے وہ لوگ بھی متاثر ہوئے جو مشرقی مصنّفین کے راوی بنے۔ سیستانی دیہات میں آج بھی لوگ تنگ کھُردرا کپڑا بُنتے ہوئے دیکھے جاسکتے ہیں، کسی اُونچی دیوار باغ کے پاس ہوا کے مخالف رُخ پر بُنائی کے لئے ایک جگہ مخصوص کر لی جاتی ہے جس کے اُوپر دھوپ سے بچاؤ کے لئے ایک پناہ بنا دی جاتی ہے اور اس کے نیچے گڑھے کھود کر پارچہ باف ان میں بیٹھ جاتے ہیں اور زیر ساخت کپڑے کا بانا ایک میخ سے بندھا ہوا ہوتا ہے جو ان کی کارگاہ سے ساٹھ یا اسّی فٹ دُور گڑی ہوتی ہے۔ ایک ترچھی سلاخ دھاگوں کو جُدا جُدا رکھتی ہے کبھی کبھی ایک ایک درجن آدمی اس کام میں لگے ہوتے ہیں اور وہ اپنی نالیاں چلاتے ہوئے مستقل سرگوشیاں کرتے رہتے ہیں اور جب یہ عمل میکانکی ہو جائے تو کم سے کم توجہ مانگتا ہے۔ کارکنوں کی قربت مکالمات کی محرّک ہے اور یہ نہایت آسانی سے تصوّر کیا جاسکتا ہے کہ قدیم سیستان کے خوارج جب کام پر بیٹھتے ہوں گے تو وہ یقیناً خلفا و سلاطین کے شرعی و سیاسی عیوب پر بحث کرتے ہوں گے۔ کرکویہ خارجی برادری کا مرکز تھا جو پارچہ باف تھی۔

ابن رُستہ :-

کُرنگ اور جوین کے سلسلہ میں ابن رُستہ کے سفرنامے کا ذکر ہو چکا ہے۔ کشتیاں مسافروں کو ہسانک لے آتی تھیں جو ہاموں کے جنوبی سرے پر تھا۔ یہاں سے ایک سڑک کرکویہ سے گذرنے کے بعد سیدھی زرنج کو جاتی تھی۔ لہٰذا ہسانک غالباً چنگِ چہار شہر کے

سرے یا مزید مشرق میں واقع تھا۔ ان دونو مقامات سے زرنج کی سڑک آج کل کارکو کے دائیں طرف سے ہی نکل جاتی ہے۔

استخری کا سفرنامہ زرنج تا قلعۂ بست :۔

زرنج (یا سجستان) سے بست تک کا دُوسرا سفرنامہ استخری کا ہے جو سَر ہنری رالنسن کے ترجمہ کے مُطابق درج ذیل ہے :۔

(۱) "زنبنک (ایک بہت مشکوک نام"۔)

(۲) "سُرُودَر - ایک بڑا شاہی گاؤں"۔

(۳) "حُروری - ایک ترقی یافتہ جگہ۔ اس منزل میں آپ ایک خشتی محراب دار پُل سے دریائے ہلمند پار کرتے ہیں"۔

(۴) "دیہک، رباط پر پڑاؤ - آگے صحرا"۔

(۵ تا ۸) "رباط، چوکیاں یا کاروانسرائیں" مذکور در سفرنامہ جن کی تفصیل یہاں مطلوب نہیں۔

(۹) "بست - رباط دیہک سے بست سے ایک فرسنخ درے تک تمام صحرا"۔

سُرودر اور چکانسُر :۔

چکانسُر کی تعمیر کی کہانی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ڈھیری، دکِ سُرہ نامی پر ایستادہ ہے۔ اس کا معنی ہے سُرہ یا سُرخ ڈھیری۔

لیکن چکانسُر بہت صدیوں سے آباد تھا۔ یہ ایک خاندان کے تصرّف میں تھا جن کا موروثی خطاب میر تھا اور خاندان میر عرب کہلاتا تھا۔ چاغی کے سَردار کا چھوٹا بیٹا جان بیگ سیستان آباد ہوا تو اُس نے میر چکانسُر کی وفاداری کا حلف اٹھایا۔ سنجرانی ریوڑ چرائی کا محصول اس خاندان کو دیتے تھے۔ ایک قرن کے دوران سنجرانی سردار نے میر وقت کی بیٹی سے شادی کر لی اور ارک پر قابض ہو گیا۔ سیستان اپنے خزانے اور خون سے اتنی دفعہ محروم ہوا کہ تمام پرانے خاندان ڈانواں ڈول تھے اور توازن اقتدار قائم رکھنے کے لئے کسی بلوچی سردار سے منسلک ہو جاتے تھے، جو

بصورتِ جنگ کچھ جنگ آزما میدان میں لاسکتا تھا۔ جائیداد سے محروم ہو کر میر عرب خاندان گردشِ ایّام کا شکار ہو گیا۔ اس کا آخری نمائندہ میر عبّاس کیانی کا وظیفہ خوار تھا اور جلال آباد میں رہتا تھا۔ اس کے برباد ہونے پر وہ میاں کنگی کے گاؤں مارگو چلا گیا جہاں وہ سٹھیا ہے کامارا زندہ ہے۔ چکانسر کا ایک گمنام خاندان اس کا جانشین ہونے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن اسے صحیح نہیں سمجھا جاتا۔ ہو سکتا ہے کہ چکانسر سرودر کا شاہی گاؤں ہو۔ اس کے اردگرد زرخیز اور بسیط زمینیں ہیں جو پرانے وقتوں میں نہروں سے سیراب ہوتی تھیں جن کے آثار بکثرت اور واضح موجود ہیں۔ چکانسر جیسی پرانی جگہیں اور بھی ہیں لیکن اتنی زیرِ کاشت زمین اور کسی کو نصیب نہیں۔ اگر آشنک میں پانی نہ ہو تو چکانسر سیدھے راستے سے یا قلعہ کنگ کے راستے سے بھی نادعلی سے ۱۸ میل سے زیادہ دُور نہیں ہے لیکن اگر دو نو جگہیں پر آب ہوں تو طاس کے جنوب کا راستہ کوئی ۲۶ میل پڑتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سرودر چکانسر سے ۶ میل مشرق میں موجودہ ارنداس کے مقام پر ہو۔[1]

دیہک اور حروری :۔

چوتھی منزل دیہک کی چوکی یا کاروانسرائے تھی۔ موجودہ گاؤں خاش چکانسر سے کوئی پچاس میل ہے لہٰذا دو منزلوں میں یہاں تک پہنچا جا سکتا تھا۔[2] درمیانی منزل حروری تھی جو یقیناً موجودہ الیلی ہے کیونکہ 'ل' عموماً 'ر' سے بدل جاتا ہے۔ چکانسر سے بست کا یہ سیدھا راستہ اب بھی چالو ہے اور جلدی سفر کرنے والے یہی راستہ استعمال کرتے ہیں۔ الیلی کے متعلق تنزلی کہتا ہے کہ یہاں سے خاش اور چکانسر کا راستہ دریائے خاش کو عبور کرتا ہے اور یہ گذر خاش کہلاتا ہے۔ نام اور ضرورت عبور آج بھی موجود ہیں۔ تنزلی نے اسی کے قریب پل خاش کی روایت بھی سنی۔

قرنین غالباً قرنیتین کی پہچان :۔

ایک اور جگہ کی شناخت کے بعد ہم اس بات کو ختم کریں گے۔ یہ شہر لیث صفار اور اس کے

---

[1] اندر اس میں ایک اونچی ڈھیری یا ٹل ہے جو کسی قدیم قلعہ کا کھنڈر ہے۔
[2] ضلع خاش میں دیہک نامی ایک گاؤں یا قصبہ ہے۔ جی۔ پی۔ ٹی

بیٹوں کا مولد و مسکن تھا جنہوں نے صفاری خاندان کی بنیاد ڈالی۔ اسے قرنین کہتے تھے۔ سر ہنری راالنسن کے مطابق بلاذری کے مطبوعہ ایڈیشن میں اسے قریتین لکھا گیا۔ متن کے ایڈیٹر مسٹر ایم۔ڈی۔ گوجے کے مطابق قریتین قصبہ قرنین سے مختلف تھا جو صفاریوں کا مولد تھا۔ عربی حروف میں دونوں ناموں کا فرق صرف نقاط 'ت' 'ی اور 'ن' میں ہے۔ قریتین بمعنی دو گاؤں یا قصبے بامعنی بھی ہے جبکہ قرنین بمعنی دو سینگ (یا سنگھ) بے معنی ہے۔ ایک کم نگاہ یا کم محنتی کاتب بہت آسانی سے یہ غلطی کر سکتا تھا یا کسی بدنوشتہ یا مٹے ہوئے اصلی نسخہ کی وجہ سے یہ غلطی ہو سکتی تھی اور ایک دفعہ اس کا ارتکاب بعد کے کاتب پر اسے لازم کر سکتا تھا۔ یہ لوگ لفظ قرنین کو بھی بخوشی قبول کر لیتے کیونکہ اس سے شہر ذوالقرنین یعنی سکندر اعظم سے منسوب ہو سکتا تھا جو مشاہیر قدیم میں سے تھا اور جس کے کارنامے بھی مقدونوی بادشاہ کی مشہور مشرقی مہمات کے افسانوی و روایتی علم پر مبنی ہیں۔ میں نے قریتین کو پہلے نادعلی کے آثار سمجھا، بالخصوص اس لئے کہ یہاں بھی رخش رستم کی ایک مشہور آخور تھی۔ صفاریوں کے مولد کے پاس بھی رخش رستم کی ایک آخور کے آثار بتائے گئے ہیں۔ لہٰذا یہ بعید از قیاس نہ تھا کہ لیث صفاری اور اس کا خاندان ایک ایسے دار الحکومت میں ہوا جس کے اندرونی اور بیرونی شہر کے گرد اپنی اپنی فصیل تھی اور وہ قرینین کہلاتا تھا۔ لیکن ایسے قطعی بیانات موجود ہیں کہ صفاریوں کا مولد یہ پایۂ تخت نہ تھا۔

قریتین کا محلِ وقوع :-

سر ہنری راالنسن کے تذکرۂ سیستان سے قرنین کی طرف مندرجہ ذیل اشارے اس کے محلِ وقوع کا پتہ دیتے ہیں: "یاقوت (۱۲۲۵ء) قرنین کے بارے میں کہتا ہے' یہ صوبہ سیستان کے ضلع نشک میں ایک گاؤں ہے'۔ احمد ابن سہل البلخی لکھتا ہے کہ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس کے مضافات میں گاؤں ہیں اور ضلع ہے، سیستان سے ایک منزل دور، بست کی سڑک کے بائیں طرف، اور سرودر سے دو فرسخ دور ہے"۔ استخری اور ابن حوقل (۹۷۸ء) میں بھی وہی الفاظ

ہیں جو یاقوت کے ہاں البلخی سے ماخوذ و مقتبس ہیں۔

"اسی طرح بلاذری صفحہ ۳۹۴ پر کہتا ہے کہ ربیع نے زرنج سے سنیارود کو عبور کیا اور قرنین آیا جہاں رخش رستم کی آخور کے آثار ہیں۔ پھر استخری محل وقوع کے متعلق کہتا ہے کہ خاش قرنین سے ایک منزل دور ہے اور زرنج سے بست کی سڑک کی بائیں طرف سے ایک فرسخ کے فاصلے پر ہے۔ مزید یہ کہ فرح قرنین سے دو منزل ہے اور درمیانی منزل جزہ کی ہے۔ مسودات میں دیئے گئے فاصلوں میں فرق ہے لہٰذا اعداد پر پورا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔"

پوست گاؤ اور چیچو ۔ قرنین :-

پہلے ذکر ہوا ہے کہ سرودر کی جگہ پر چکانسر ہے یا ارنداس اور ان دونو سے پوست گاؤ اور چیچو ۸ میل دور ہیں اور ان کے کھنڈرات ضلع نشک میں ہیں اور خاش کے موجودہ راستے کے بائیں طرف ہیں جسے پہچانا گیا ہے اور جس کا نام بھی زندہ ہے۔ گھوڑ سوار چکانسر سے مراسلے لیکر دو دن میں فرح پہنچتے ہیں اور ان دونو کے درمیان سیدھے راستہ پر نام جزہ بھی موجود ہے۔ لہٰذا پوست گاؤ اور چیچو منزلوں کے لحاظ سے فرح سے ایک ہی جیسے دور ہیں اور چونکہ سیدھا راستہ ایک چٹیل میدان سے گذرتا ہے لہٰذا کاروان اسے جلدی عبور کریں گے اور دوسرے ہی دن فرح پہنچ جائیں گے لیکن خاش پوست گاؤ یا چیچو سے پورے ۵۰ میل ہے اور اس سمت میں منزلوں کا فاصلہ بہت طویل ہے۔ الّا یہ کہ ضلع خاش کو صرف اس کی سرحد سمجھ لیا جائے جو فرح سے صرف تھوڑی سی اوپر ہے اور فرح چیچو سے ایک مختصر سی منزل پر ہے۔ ربیع کا زرنج سے قرنین جاتے ہوئے سینارود عبور کرنا اس وقت کے ہلمند کے محل وقوع کے عین مطابق ہے اور اس وقت کی جزوی طور پر متروکہ شاخ سے بھی مطابقت رکھتا ہے۔

یہ نشانات پوست گاؤ اور چیچو کے کھنڈرات کو ہی لیث صفار کا مولد یعنی قرنین ہونے کا اشارہ ہو سکتے ہیں۔ اس سے بہتر شہادت کا ملنا غیر متوقع ہے اور ان دونو قصبوں

کی قدامت بھی اسی نام کی مؤید معلوم ہوتی ہے۔

برُج لار رخش رُستم کی آخور ہے :-

چپچو کے کھنڈرات سے تین میل مشرق میں اُونچی راس کا دخمہ رخش رُستم کی آخور ہوسکتا ہے جسے بعد میں دید بان اور آتش گاہ بنالیا گیا۔ اس چٹان پر دخمہ کے آثار پوست گاؤ اور چپچو سے صاف نظر آتے ہیں۔ میں نے اُنہیں نادعلی کی ڈھیریوں سے خالی آنکھ سے دیکھا ہے۔ پوست گاؤ کے قریبی کھنڈرات ظاہر کرتے ہیں کہ اس کے مضافات میں دیہات تھے، جو البلخی کے بیان کے عین مطابق ہیں۔

آخر میں کہا جا سکتا ہے کہ چکانسُر اب بھی نادعلی اور پوست گاؤ کے کھنڈرات سے ایک منزل دُور سمجھا جاتا ہے۔ یہ کھنڈرات چکانسُر سے پانچ میل کے فاصلے سے شروع ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا زرنج سے ایک ہی منزل دُور ہوں گے، بالخصوص جب درمیانی علاقہ دیہات سے بھرا ہُوا، جیسا کہ کھنڈرات سے واقعی ثابت ہوتا ہے۔

بابِ نہم

سیستان اور خلیج فارس اور ممالک شمال و مشرق و مغرب کے درمیان قدیم تجارتی راستے

سیستان خلیج فارس سے ہرات جانیوالے سوداگروں کا مرجع :-

جب زرنج سیستان کا دارالحکومت تھا تو تجارت کی ایک زبردست گہما گہمی دیکھنے میں آتی تھی، اور قافلے خلیج فارس اور ہرات کے درمیان اور قندھار اور یزد کے درمیان مصروف آمد و رفت رہتے تھے۔ اہلِ سیستان کو ان کاروانوں سے جہاں مالی و مادی فوائد میسر ہوتے تھے، وہاں امیر تر اور مہذب تر ممالک سے بالواسطہ رابطہ بھی نصیب ہوتا تھا۔ گو یہ صحراؤں یا نیم غیر آباد علاقوں میں محصور تھا تاہم یہ سوداگروں کے سیدھے راستے پر واقع تھا اور اُس کا پایۂ تخت دُور افتادہ ممالک کے تاجروں کا پڑاؤ تھا۔

غز تباہی کے بعد تجارتی راستوں کی بحالی :-

تیز یا یسراف یا ہرمز کی بندرگاہوں سے تجارتی راستے جرفت اور ریگان سے ہوکر بام پہنچتے تھے جہاں کاروان سستاتے تھے تاکہ ہند کی سیراب کردہ زرخیز زمینوں تک پہنچنے سے پہلے کے نیم غیر آباد علاقے کو پار کرنے کے لئے تیار ہو سکیں۔ اس راستے کی اہمیت یہاں سے ظاہر ہے کہ جب بربریت پسند غز شکروں نے ملک کو تباہ و برباد کر دیا تھا تو بارھویں صدی عیسوی میں کرمان کے پہلے سلجوقی حکمران کاوردشاہ نے اسے بحال کرنے کی جد وجہد کی۔ اس وقت سیستان اور بام کے

راستے پر درہ بعدہٗ موسومہ بہ دربند نادری اس طرف سیستان کی سرحد تھا۔

کاروانوں کے لئے سہولیات :۔

کاوردشاہ نے لدے ہوئے اونٹوں کے کاروانوں کی حفاظت و سہولت کے لئے کارواں سرائیں اور چوکیاں تعمیر کروائیں۔ مسافروں کے آرام کے لئے کنوئیں اور کاریزات کھدوائے۔ اُس نے نشانات راہ کے طور پر اونچے اونچے مینار بنوائے اور اندھیرے یا خراب موسم میں مسافروں کو صحیح راستے پر رکھنے کے لئے سنگ و خشت کے ستون بنوائے جو اتنے فاصلے اور ایسے زاویے پر نصب کئے گئے کہ ایک سے دوسرا نظر آ سکتا تھا۔ مذکورہ درّے میں اُس نے ایک سنگین دروازہ بنوایا جس کی حفاظت کے لئے ایک فوجی دستہ مامور کیا تاکہ قزاق کوئی کارستانی نہ کرسکیں۔ یہ دروازہ دربند سیستان کہلاتا تھا اور اُس کی سلطنت اور سیستانی فرمانرواؤں کے درمیان سرحد کا کام کرتا تھا۔ اس درّے کے شمال مغرب میں بھی زرنج تک ایسی ہی سہولیات فراہم کی گئیں۔

سلاجقہ کرمان کا مورّخ یہ سب کارنامے کاوردشاہ سے منسوب کرتا ہے لیکن یقینی امر ہے کہ اکثر حالات میں اُس نے پرانی عمارتوں، کنوؤں اور کاریزوں کو ہی بحال کیا ہوگا جو اُس وقت تعمیر کئے گئے تھے جب خلفا کی طاقت دور افتادہ صوبوں میں بھی محسوس کی جاتی تھی۔

سیستان و بام کے درمیان ان کے کھنڈرات :۔

بام کے شمال مغرب کے بسیط میدانوں میں سلجوقی حکمران کے تعمیر کردہ یا بحال کردہ کارناموں کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں اور ایک حسرتناک تضاد پیش کرتے ہیں کیونکہ موجودہ حکمران نہ انہیں قائم رکھ سکے اور نہ اسی قبیل کے نئے کارناموں کے خالق ہو سکے۔ جب سیستان اور کرمان کو ملانے والی ٹیلی گراف لائن زیر غور تھی تو بام و سیستان کے راستے کے بہت سے پرانے کنوئیں صاف کروائے گئے تاکہ ان کا پانی انسانی ضروریات پوری کرسکے۔ یہ کنوئیں سنگ و خشت کے بنے ہوئے تھے جو صدیوں کے بعد بھی بدستور قائم تھے۔ کاوردشاہ اور اُس کی دُوررس حکمتِ عملی عوامی

ذہن سے محو ہو چکے ہیں اور اس کی مربّیانہ کارکردگی اب نادر شاہ سے منسوب کی جاتی ہے جو اٹھارھویں صدی میں قندھار جاتے ہوئے یہاں سے گذرا تھا۔ میں نے متذکرہ بالا سنگین ستونوں کے منہدم آثار بھی اس راستے پر پہچانے۔

الاصطخری اور ابن رُستہ کے سفر نامے:۔

ان دونو سفر ناموں میں سیستان و ہرات کے تجارتی راستے کے متعلق بیحد قیمتی معلومات مندرج ہیں جو آج بھی اتنی ہی درست ہیں جتنی اُس وقت تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے مآخذ نہایت موثق و معتبر تھے۔

سیستان (زرنج) سے ہرات تک منزلوں کی تعداد:۔

اصطخری اور ابن رُستہ دونوں کے مُطابق ہرات سے زرنج تک سولہ منزلیں تھیں، گو ان کے نام مختلف دیئے گئے ہیں۔ اوّل الذکر کے مُطابق ہراتی مُسافر چھٹی منزل میں سیستانی علاقہ میں داخل ہوتے تھے اور دونوں کے مطابق جوین ہرات سے تیرھویں منزل تھی۔ لہٰذا ہوکاٹ کا موجودہ صدر مقام (جوین) کافی قدامت کی جگہ ہے۔ دریا کے پار قلعہ لاش ایستادہ ہے جو ماضی میں بہت مضبوط تھا۔ اسے تاریخ میں قلعہ اُک کہا گیا ہے۔ اس کی فوج نے چنگیز خان کے مغل لشکر کا جو بہادرانہ مقابلہ کیا وہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ لیکن پندرھویں صدی میں لاش ایک دفعہ پھر شاہ رُخ ابن تیمور لنگ کے خلاف نبرد آزما ہُوا، اُسوقت یہ سگزیوں کے قبضے میں تھا جنہوں نے مردانگی کے جوہر دکھلائے۔ مقابلہ اتنا سخت تھا کہ محاصرین کو بالآخر اس کی دیواروں کے نیچے سے تنگ راستے کھودنے پڑے۔ حتیٰ کہ سرنگیں کنوؤں تک پہنچ گئیں اور مدافعین کا پانی بند کر دیا گیا۔ مجبوراً انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے۔ فنولی نے ۱۸۳۹ میں چٹانوں کے دہانوں پر جن غاروں کا ذکر کیا ہے وہ غالباً انہی سُرنگوں کے دروازے تھے اور چٹان کے مشرقی رُخ کے شگاف جو فنولی کے مُطابق اس سمت کی دیواروں کو کمزور کر رہے تھے غالباً سرنگوں کی وجہ سے تہوں کے نیچے بیٹھنے کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ چونکہ لاش کی چٹان دریا کے پاٹ سے ۲۰۰ فٹ اُونچی ہے،

قلعے کے کنوئیں بہت گہرے تھے اور ان سے پانی باہر کھینچنا محنت طلب ہوتا تھا لہٰذا امیر نگوں نے کنوؤں کو متاثر کیا اور چٹانی تہیں بھی مرور زمان کے ساتھ نیچے بیٹھتی گئیں۔

بشر۔ پیشاوران :-

زرنج کو جانے کی اگلی منزل، بشر یا کُرنگ بھی پہچانا جاسکتا ہے۔ اوّل الذکر وہ کھنڈراتی مجموعہ ہے جسے اب پیشاوران کہتے ہیں، کسی وقت یہاں ایک قصبہ تھا جس کی بعض جنوبی مغربی دیواریں شناخت کی جاسکتی ہیں لیکن یہ کھنڈرات بہت بعد کے ہیں۔ موجودہ قصبہ کے محیط میں ایک قدیم ڈھیری ہے جو بشر کا ملبہ ہوسکتی ہے۔ اُس کے شمال میں زیارت میر اقبال ہے جنہیں چودھویں صدی کے اواخر میں حاکم ہرات کے حملۂ سیستان پر ملک قطب الدین نے پیغام مزاحمت دیکر بھیجا تھا۔ پیشاوران کے کھنڈرات جو ہوکاٹ میں اتنے نمایاں ہیں غالباً سولھویں یا سترھویں صدی کے ہیں۔ کول ماروُت کے آثار بھی اسی دور کے ہیں۔ ان دونو کا معائنہ بیلیو نے ۱۸۷۲ میں کیا لیکن وہ پیشاورانی کھنڈرات میں ایک خوشنما مسجد نہ دیکھ سکا۔

کُرنگ یا کُرون کی شناخت :-

کُرنگ مزید چار میل جنوب میں تھا اور یہ نام اپنی مسخ شدہ شکل میں اب بھی موجود ہے۔ پانچ بڑی بڑی ڈھیریاں ہیں جن کے نام مسجد اک، ٹپہ شفالک اور خاران ہیں جو قلعے تھے، یہ ڈھیریاں برلب ہاموں واقع ہیں اور نمی کی وجہ سے شورہ آلود ہیں۔ ان کے درمیان نہروں کے آثار اور چھوٹی ڈھیریاں ہیں۔ مقامی لوگوں کے مطابق خاران کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ کسی کے گدھے یہاں ڈوب گئے یا مر گئے یا کسی کی بہنیں یہاں رہا کرتی تھیں۔ ان لوگوں کو کُرنگ یا کُرون کا کوئی علم نہیں اسی لئے اصرار پر مذکورہ طفلانہ جواب دے کر جان چھڑالی۔ ابن رستہ کہتا ہے کہ جوین میں ایک دریا عبور کرنا ہوتا تھا جو یقیناً فرح رود تھا اور کُرنگ میں بھی آب رواں تھا۔ فرح رود کا ہاموں میں ایک دہانہ ان کھنڈروں سے گذرتا تھا اور آج کل بھی اس کا پانی اس پرانی گذرگاہ میں آجاتا ہے۔ مذکورہ نہریں بھی فرح رود سے نکلتی تھیں اور کُرنگ کو بھی پانی اسی سے ملتا تھا۔

یاقوت اسے کُرون کہتا ہے اور یُوں ذکر کرتا ہے کہ یہ ایک خوشگوار اور خوشحال جگہ ہے جہاں کے تمام باشندے خارجی پارچہ باف تھے۔ ابنِ رُستہ کے مطابق کُرنگ ایک خارجی سردار عوف کا مُولد تھا جو مشہور تو تھا لیکن تاریخ میں جگہ نہ پا سکا۔

الاصطخری اور ابنِ رُستہ کے راستے :۔

ہوکاٹ میں ہمیں پکّی اینٹوں کے دو پل ملے جن کے نیچے سے کئی آبی گذرگاہیں تھیں۔ یہ تختِ پُل کے بہت بعد میں تعمیر ہُوئے۔ دو نو فنّی مہارت کا نمونہ تھے اور تختِ پل کی طرح زائد مواد سے پاک تھے اور دو نو کے بیچ بٹھائے گئے تھے تا کہ پُل کی محراب دو نو سروں کی ہم سطح ہو، ان میں سے ایک قدیم تر کول ماروت پر تھا۔ یہ جوین سے کُرنگ کے سیدھے راستے پر ہے جو قدیم تجارتی راستے کے تاجروں کے لئے بنایا گیا ہو گا۔ دُوسرا پُل مشرق کی طرف تھا، اور کُرنگ سے ایک مشرقی راستے پر تھا جو شاید ابنِ رُستہ میں مذکور متبادل راستہ تھا۔ کُرنگ جوین سے ۲۰ میل جنوب میں ہے اور اس کے علاقہ میں ۲۰ مربع میل پر ڈھیریاں پھیلی ہُوئی ہیں۔ بالخصوص کول ماروت کے مقابل کی ڈھیری بہت بڑی ہے۔ یہ برلبِ ہاموں تھی اور اچھا پڑاؤ تھی، جہاں اتنا پانی تھا کہ سامان کشتیوں میں لادا جا سکتا تھا۔ اسی لئے کُرنگ بشر کے برعکس دوبارہ آباد نہ ہو سکا۔ یہ جھیل کی بلند ترین سطح سیلاب سے نیچے تھا اور جھیل پُر آب ہوتی ہے تو پانی اب بھی ڈھیریوں کو گھیر لیتا ہے۔ ہوکاٹ کا ساحل جسے پانی ۱۸۸۵ میں پار نہ کر سکا، ان کھنڈرات سے ایک میل شمال میں ہے جو دسویں صدی عیسوی کی اس خارجی بستی کا پتہ دیتے ہیں۔

ہوکاٹ کے سکزی :۔

ہوکاٹ سکزی افغانوں کے قبضہ میں ہے جنہیں غیر افغان عموماً اسحاق زئی کہتے ہیں۔ اُن کا سردار ضلع کے صدر مقام، جوین میں رہتا ہے۔

جوین سے نیہہ کا تجارتی راستہ :۔

ایک قدیم تجارتی راستہ جُوین اور نیہہ کے قصبات کو ملاتا تھا۔ نیہہ سے کائن اور یزد تک

راستہ صحرا سے گذرتا تھا جو کائن نک کوہستان کی جنوبی وادیوں سے نکلتا تھا جو اسماعیلیوں کے مشرقی اور کم معروف فرقہ کا مرکز تھا۔ یہ سڑک اب صرف خانہ بدوش بلوچ قبائل کے زیرِ استعمال ہے۔ یہ ہامون ساوری کے دہانہ کے پاس سے گذرتی ہے اور کوئی آدھ میل دُور ایک مینار کے مدّھم آثار ہیں جسے اب نادر شاہ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ مینار کسی وقت سڑک پر ایک چوکی یا منزل تھا، جُوین سے کوئی ۲۰ میل اور دیہہ تفتان سے کوئی ۱۶ میل۔ یہ غالباً جوین سے نیہہ کے راستہ پر پہلی منزل تھا جہاں سڑک سطح مرتفع کو عبور کرتی ہے (جو ہاموں کے اُوپر سفید کم راس پر ختم ہوجاتی ہے) وہاں راستہ اب بھی واضح ہے اور بتدریج مشرق کو چڑھتا اور مغرب کو مینار کے پاس جا اترتا ہے۔ یہاں سے راستہ اس سلسلہ کوہ کے شمالی تسلسل کو پار کرتا ہے جس کی مشہور چوٹیاں نر آہو اور مادہ آہو کہلاتی ہیں اور پھر درّہ نبرکن میں داخل ہوجاتا ہے۔ نبرکن کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اسے لدے ہوئے اُونٹوں کے آرام کے لئے ۲۰ یا ۲۵ فٹ گہرا کھودا گیا اس لئے نبر تراشیدہ درّہ کہلایا۔ درّے کے مشرق میں وادی طباسین اور زین آلآباد واقع ہیں اور قدیم راستے کے پہلو میں ایک مصنوعی حوض کے آثار ہیں اور ایک مینار بھی جو منزل یا پڑاؤ تھا۔ یہی وہ راستہ تھا جس پر طبقات ناصری کا مصنّف منہاج السّراج ینالتگین حاکم سیستان کے حکم پر تیرھویں صدی کے آغاز میں اسمٰعیلی فرقہ کے سرداروں سے ملنے کے لئے گامزن ہوا۔

قدح اور خاندان ارابیب :۔

زرنج سے بست کا راستہ بذریعہ خاش اور خشت پہلے کئی دفعہ بتایا جاچکا ہے لہٰذا تکرار کی ضرورت نہیں البتہ خاتمہ باب سے پہلے قدح کا بیان باعثِ دلچسپی ہوگا۔ یہ ضلع خاش کی طرف سیستان کا آخری ضلع ہے۔ یہ حالیہ دور تک ایک ایسے خاندان کے قبضہ میں تھا جو اپنے کو قرونِ اُولیٰ سے ماخوذ بتاتا تھا۔ جس شخص سے شمرِ لعین نے امام حسینؑ کو کربلا میں شہید کیا وہ اسی خاندان میں وراثتاً منتقل ہوتا رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ قدح کے ارابیب، چکانسُر کے میر عرب خاندان اور میران سیستان (اسکل خاندان) کے ۸۰ آدمی جنگ کربلا میں آلِ علیؓ کے خلاف لڑے، پہلے دونوں خاندان معدوم ہو چکے

ہیں اور تیسیر العنت کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ ان کا کوئی مُردہ مُسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں ہو سکتا کیونکہ زمین بھی اُن کے انجر پنجر قبول نہیں کرتی لہٰذا وہ اپنے مُردے کہیں اور دفناتے ہیں۔ اُن کی مستورات جسمانی عوارض میں مُبتلا رہتی ہیں۔

مُتبادل جگہیں :-

بنائے کے یا نادعلی کی جگہ سفر ناموں کی تمام شرائط پوری کرتی ہے۔ نشک کی قدیم جگہ کی دریافت نے تصدیق مزید کر دی ہے کہ نادعلی ملک کا پرانا پایۂ تخت تھا۔

البتہ زاہدان اور نادعلی کا فنِ تعمیر بیشتر ایک جیسا ہے لیکن زاہدان بہت بعد کے دور کا ہے۔ سیستان جیسے عمارتی لکڑی سے محروم ملک میں طرز تعمیر میں زیادہ فرق ممکن ہی نہیں۔ قدیم ترین کھنڈرات سے موجودہ عمارات تک نقشہ و تعمیر میں کوئی خاص تبدیلی نہیں بلکہ موجودہ عمارات میں لااُبالی اور غیر ذمہ دار کاریگری زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

سیستان پر مختلف مصنفین کے ہاں مذکور دُوسری جگہیں اور جغرافیائی تفصیلات زیادہ تر نادعلی کے سیاق و سباق میں ہی آجاتی ہیں۔

باب دہم

زاہدان کا بیان

زاہدان کا محلّ وقوع اور اُس کے کھنڈرات :-

زاہدان کے کھنڈرات مشہور و معروف ہیں۔ گو اُن کی وسعت اتنی بھی نہیں ہے جتنی بعض لوگ بتاتے ہیں تاہم یہ کافی رقبے پر ہیں۔ یہ شہر سیستان کا پایۂ تخت بتایا جاتا ہے جس کا محاصرہ تیمور نے کیا اور جسے اس نے تباہ کر دیا۔ کھنڈرات ایک لرگ پر واقع ہونے کی وجہ سے محفوظ رہے جو سفید کہگل کی بنی ہوئی ہے ورنہ ان کا حشر بھی بنائے کَے کے آثار کا ہی ہوتا جو بلمند کی یورش کو نہ سہہ سکے۔ ریت نے اس عظمتِ رفتہ پر احسان کیا ہے اور اسے ہوا کی دستبرد سے بچالیا ہے۔ زاہدان کی فصیل کی حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوا کے اثرات اُن اشیاء کے محل وقوع سے نرم پڑ سکتے ہیں جو اُس کے فرّاٹوں کی زد میں آتی ہیں۔ زاہدان کی شمالی اور جنوبی دیواریں قریباً ناپید ہو چکی ہیں اور صرف ڈھیریوں کی ایک قطار ہی ان کی جگہ اور سمت کا پتہ دیتی ہے لیکن مشرقی اور مغربی دیواریں کچھ بہتر حالت میں ہیں اور ان کا تسلسل قائم ہے۔ شہر تقریباً ایک مستطیل ہے اور اس کا طول عرض سے قریباً دوگنا ہے اور یہ ہوا کے رُخ پر ہے۔ مستطیل کے جنوب مشرقی اور جنوب مغربی زاویے کچھ دبے ہوئے ہیں اور نقشے کا تناسب بگاڑنے کی کوئی وجہ بظاہر نظر نہیں آتی۔ سہ قطارہ مورچوں کا عظیم قلعہ شہر کو دو برابر حصّوں میں تقسیم کرنیوالے خط سے ذرا اُوپر ہے۔ بازار اور قصبہ قلعہ سے آگے تھے اور ایک بیرونی خندق انہیں قلعہ سے جُدا کرتی تھی۔

شہر کے باقی رقبہ پر باغات اور کشت زار تھے جن میں امراء وزراء کی شہری حویلیاں تھیں ۔ یہ خالی جگہ اہلِ ملک کو بیرونی دیواروں کے اندر پناہ دینے کے لئے ضروری تھی جیسے نوجوانان ملک حملے سے بچا سکتے تھے ۔ چار دروازے تھے اور ہر دروازہ ایک رُخ پر تھا ۔ قلعہ کے دو دَروازے تھے اور ہر دَروازے کے پہلو میں ایک بُرج تھا جس کے اُوپر کشادہ دارالابواب یا محافظ خانہ تھا ۔ بُرج اور محافظ خانہ میں دو سو سے تین سو سپاہیوں تک ٹھہرنے کا انتظام تھا جن کا فرض صرف اس دروازے کی حفاظت تھا ۔

شہر اور محل کی قلعہ بندیاں :-

دَروازے کی اندرونی طرف چھت کی کڑیاں عرضاً گذاری گئی تھیں تاکہ اگر دشمن محافظوں کو مغلوب کر لے تو کم از کم زیادہ سے زیادہ عرصہ کے لئے گولہ باری کی زد میں رہ سکے ۔ قلعہ کے شمال مغربی کونہ میں شاہی محل تھا ۔ قلعہ کے دو بیرونی خطوط دفاعی کے اندر کے مکانات محل کے نواحیات تھے ۔ شہر کی شمال مغربی دیوار سے پرے اس سے قریباً ایک چوتھائی میل دُور ایک بیرونجاتی محل کے آثار ہیں جو ایک باغ میں واقع تھا اور جس کی حفاظت کیلئے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بُرج تھے ۔ یہ احاطہ قریباً ایک مربع تھا اور اس کا عرض شرقاً غرباً قریباً ایک ہزار فٹ اور طول ذرا کم تھا ۔ اس احاطہ کے اندر محلات کے آثار ہنوز ایستادہ ہیں ۔ باغ کے ہر رُخ پر ایک دَروازہ تھا لیکن باب عالی مشرقی دیوار میں معلوم ہوتا ہے جہاں ایک خوشنما دو منزلہ محافظ خانہ تھا ۔ اس کے اندر متعدد خوبصورت کمرے تھے جو محلاتی کمروں کا مقابلہ تو نہ کر سکتے تھے تاہم کافی کشادہ اور خوشگوار آرام گاہوں کا کام دے سکتے تھے ۔

بیرونجاتی محل :-

اس محل بلکہ ان محلات کی اندرونی ترتیب سے آرام و آرائش کا موجودہ معیار ظاہر ہوتا ہے ۔ اس کے وسط میں ایک بلند دیوان عام تھا جو گنبدیں چھت تک پہنچتا تھا اور فرش کے ساتھ ساتھ بغلی کمرے تھے ۔ دونوں میں سے بڑے محل میں دیوان عام کا مغربی سرا ایک کھاڑی تک جاتا ہے ۔

یہ غالباً اس لئے کیا گیا کہ حکمران اور موجود ارکان دولت نماز کے اوقات میں قبلہ رُو ہو سکیں۔ بڑے محل کے باہر ایک زینہ بالائی منزل تک جاتا تھا۔ اس کے عقب میں خدام کے مکانات تھے جیسے ہندوستان میں وہ ایک یوروپی بنگلہ کے پیچھے بنائے جاتے ہیں تاکہ نظروں سے اوجھل رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ محل کے سارے انتظام میں آسائش و انضباط کا موجودہ معیار ملحوظ رکھا گیا ہے۔

قلعۂ زاہدان :-

شہر کے قلعہ میں آسائش کو دفاع کے مقابلہ میں ثانوی حیثیت حاصل تھی۔ اب وہ کھنڈر بن چکا ہے اور صرف دو اُونچے بُرجوں پر دو گنبدیں کرے سلامت ہیں۔ یہ ہشت پہلو ہیں۔ قطر میں آٹھ فٹ ہیں اور ہر رُخ پر ایک دریچہ ہے جہاں سے باہر کا منظر دیکھا جا سکتا ہے اور ہر دریچہ پر ایک محرابی طاق ہے۔ اندر گچکاری کی گئی تھی اور ایک پہلو میں دریچہ کی بجائے ایک چھوٹا سا آتشدان تھا جس کی چمنی دیوار سے گذر کر گنبد کی طرف باہر نکلتی تھی۔ یہ کمرے سطح زمین سے ۵۰ فٹ بلند ہوں گے بلکہ اب اس خستہ حالت میں اتنے بلند ہیں۔ قلعہ بہت مضبوط بنا ہوا تھا۔ اس کے بیرونی مورچوں کے بُرج اینٹوں سے بنائے گئے تھے۔ پختہ اینٹیں دیواروں کے نچلے حصّوں میں استعمال کی گئی تھیں۔ محرابوں کا اندرونی حصّہ بھی اینٹوں سے بنا تھا۔ شہر کی دیواریں بھی اسی اصُول پر بنی تھیں لیکن ان میں قلعہ کی مضبوطی نہ تھی اسی لئے وہ دیرپا ثابت نہیں ہوئیں۔

نہریں :-

زاہدان نہروں سے سیراب ہوتا تھا کیونکہ دریا بہت دُور تھا۔ تین بڑی نہروں کے آثار کئی میلوں تک موجُود ہیں اور ان کا پانی نالیوں کے ذریعے شہر، باغات اور فصلوں میں آتا تھا۔ شہر کا قرب و جوار دیوار بند باغات پر مشتمل تھا جو دونوطرف آدھ آدھ میل پھیلے ہوئے تھے۔ شہر کے مشرقی طرف باغات کے آثار ہنوز موجُود ہیں جہاں ریت نے انہیں کاشتکاری سے محو نہیں ہونے دیا۔ یہ زمین موجُودہ آبی نالیوں سے ذرا اُونچی ہے۔ کچھ بھی ہو یہاں نہروں، مکانوں

اور باغوں کے آثار غائب نہیں ہوئے۔ مغربی طرف ٹیلوں نے سب کچھ برابر کر دیا ہے، اور سب آثار مٹ گئے ہیں۔ کھنڈرات بھی قطعات کی صورت میں زیر کاشت لائے جا رہے ہیں۔ اور ان کی اینٹیں نئی تعمیرات کے کام میں لائی جا رہی ہیں۔ شمال کی طرف بیر ونجاتی محل ہے اور اس کے مشرق اور شمال مشرق میں دیگر کھنڈرات ہیں جو کسی وقت دیوار بند باغات اور خوشگوار آرام کدے ہوں گے۔

مسجد، تالاب اور میدانِ جنگ :-

محل کے شمال مغرب کی طرف دیواروں سے پرے ایک مسجد کے آثار سب سے نمایاں ہیں اور انہی کے پاس ایک تالاب کے آثار بھی ہیں جس کی گنبدیں چھت گر چکی ہے۔ ان کے مغرب سے ایک نہر گذرتی تھی جس کا رُخ شمال مغرب کو تھا۔ اس نہر کے آس پاس اینٹوں کے ڈھیر اور ڈھیریاں ہیں، جہاں کسی وقت مکانات ہوتے تھے۔

بیر ونجاتی محل کے عین شمال میں ایک میدان ہے جو ایک چوتھائی مربع میل پر پھیلا ہوا ہے اور مسجد تک آجاتا ہے۔ یہ میدان خزفریزوں سے بھرا ہوا ہے اور کبھی زیر تعمیر نہیں آیا۔ نہریں اس کے مشرق و مغرب سے گذرتی ہیں۔ یقیناً یہ میدان زاہدان عید گاہ تھا اور بڑی بڑی تقریبات کا مرکز تھا۔ اس کے شمال مغرب میں مکانات تھے جو پختہ اینٹوں کے ڈھیروں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ معمولی مکانوں کی کرسیاں بھی پختہ اینٹوں کی ہیں اور یہی اب ان کا پتہ دیتی ہیں۔ یہ مکانات میلوں تک ہیں۔ مینار تک اور اس کے گرد جھونپڑیوں اور عالی شان مکانات کے آثار ہیں جو قدیم نہروں کی گذرگاہ کے ساتھ ساتھ ہیں، حتےٰ کہ یہ سیلابی علاقہ تک پہنچ جاتے ہیں

بولائی کے موجودہ خوش حال گاؤں کے مغرب میں ایک پرانے مربع قلعہ کے آثار ہیں، جو اینٹوں کا بنا ہوا تھا اور پرانے گاؤں بولائی کا مظہر ہے، جسے تیموری لشکر نے تباہ کر دیا۔ زاہدان کے جنوب اور جنوب مشرق میں زمین ہواؤں کی زد میں ہے اور تمام قدیم آثار محو ہو گئے ہیں۔

صرف نہروں کے ٹوٹے پھوٹے نشانات ہیں اور وہ بھی بسا اوقات دریدہ سطح زمین سے ممیز نہیں ہو سکتے۔

مزید برآں یہاں ریت کے ٹیلے ہیں اور اُن سے پرے وہ مثلث ہے جس کے اندر ہلمند کی گذرگاہ کی تمام تبدیلیاں شروع ہوئی ہیں اور نتیجۃً تمام آثار قدیمہ نیست و نابود ہوگئے ہیں۔ ریگزاروں کے لہردار نشیب و فراز سے اُوپر صرف زاہدان کا مشرقی دروازہ نظر آتا ہے۔ البتہ مزید جنوب کی ہوا چکیاں اس سے مستثنیٰ ہیں جہاں کسی وقت محصولاتی غلّہ پیسا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مشرقی دروازہ سردار بختیاری کا جنگی مستقر تھا جو خود یہاں رہتا تھا اور اس کے قبیلہ کا ایک حصّہ بھی۔ اس کے آدمی اپنے سردار کے اردگرد دروازہ کے دونوطرف مسلح ایستادہ ہوتے تھے۔ اسے دروازۂ بختیاری بھی کہتے ہیں۔ دفاع کے لئے دُوسرے سیستانی سرداروں کی جگہیں بھی مقرر تھیں۔

قدرتی ڈھیری :-

زاہدان کے جنوب مغرب میں شہر کی دیواروں کے جنوب مغربی زاویے سے آگے ایک پست، الگ تھلگ کنکریلی ڈھیری ہے، جہاں کچھ ایرانی قبریں اور ایک زیارت ہیں۔ یہ دیواروں کے کھنڈرات سے نصف میل دُور ہے۔ لیکن حملۂ تیموری کے وقت اس ٹیلہ کے چند سوگز کے اندر باغات اور بیرونجات ہوں گے۔ شہر کی دیواروں کے اندر ایک چھوٹی سی زیارت ہے جو زاہدان کے ۴۴ پیروں سے منسوب ہے۔ یہ ایک مقبرہ ہے جس کی دیوار حالیہ دَور میں پُختہ اینٹوں کی بنوائی گئی ہے اور مقبرے کے اِردگرد اس کے جُدا جُدا پیلپاتے ہیں۔ اِردگرد کی زمین لوگوں کا قبرستان ہے۔

زیارت کی الواحِ کندہ :-

زیارت پر جو چیزیں بطیب خاطر پیش کی گئی ہیں ان میں دو کندہ تختیاں بھی شامل ہیں۔ کتبے وسط نویں صدی ہجری کے ہیں اور خوش کندہ ہیں۔ برٹش میوزیم کے جناب اے۔ جی۔ ایلس

کے ترجمہ کے مطابق ان میں سے ایک انتسابی تختی تھی جو سیستان کے شاہی خاندان کے ایک فرد شاہ علی کے کارنامہ تعمیر مسجد کی یاد دلاتی تھی، اور دوسری اسی خاندان کی شاخ صغیر کے سربراہ امیر غیاث الدین محمد کیانی کی وفات کی یادگار تھی۔ اسی خاندان کے بعض افراد یا ان کے نمکخواروں نے شاہی خاندان کے مرتبۂ ماضی کے یہ آثار زیارت میں ایک محفوظ جگہ پر منتقل کر کے تباہی سے بچا لیے تھے۔

سیستان کے تین قدیم پایہ ہائے تخت کی قربت:-

زاہدان رام شاہرستان کی ڈھیری کے شمال میں ٦ میل سیدھے فاصلے پر ہے اور بنائے کے کے جنوب مغرب میں ١٢ میل ہے۔ یہاں ایک مختصر سے رقبے میں تین پرانے دار الحکومتوں کے آثار ہیں جن میں سے ہر ایک تاریخ کا ایک مخصوص دور ہے۔ مؤخر الذکر اور زاہدان کے درمیان تقدم کا مسئلہ ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ زاہدان بعد کا شہر ہے۔

ایک روایت کے مطابق یہ تباہی تیمور سے ٤٢٠ سال پہلے سے موجود تھا گویا یہ ٣٦٥ ھ میں مکمل ہوا یعنی خلف ابن احمد کے دور میں جو سات سال محصور رہنے کے بعد سلطان محمود غزنوی کا مطیع ہوا۔

حاکم سیستان، خلف بن احمد:-

تعمیر زاہدان کا سہرا خلف بن احمد کے سر باندھنا بعید از قیاس نہیں۔ میجر راورٹی کے ترجمہ طبقات ناصری سے تواریخ اور دیگر معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ خلف کا دار الحکومت زرنج (یا بنائے کے) سے مختلف تھا جو یہاں آنے سے پہلے صدر مقام رہا تھا۔ یہ یقینی ہے کہ زاہدان اسطخری کا بیان کردہ دار الحکومت نہیں۔ کیونکہ زاہدان اس کی تفصیلات کا متحمل نہیں، البتہ طبقات ناصری میں بیان کردہ خصوصیات اس پر پوری اترتی ہیں۔ سرلتے سیاسنی یقیناً بیرونجاتی محل ہے جو اب قلعہ تیموری کہلاتا ہے۔

حوض کے پاس کی مسجد بھی موجود ہے اور وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ متواتر محاصروں اور بغاوتوں کی وجہ سے قدیم زراجدھانی کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ سامانی زوال پر خلف

نے اپنی آزاد حکومت کا تصوّر باندھا۔ وقت تبدیلیٔ دارالحکومت کے لئے سازگار تھا اور یُوں زاہدان ظہُور پذیر ہُوا۔ جگہ موزوں تھی سخت مٹّی کی چٹان قلعہ اور شہر کی دیواروں کی بُنیاد بنی اور اُس کی بلندی سیلاب کا سدّ باب بنی۔

روایات کے مُطابق حملۂ تیمُوری کے وقت زاہدان کے مشرق میں کچھ فاصلے پر ایک شیلا (بڑی نہر) تھی اور اُسی کے کناروں پر تیمُوری لشکر نے پڑاؤ ڈالا۔

باب یازدہم

سار و تار یا طاق کے کھنڈرات

قلعۂ طاق:۔ سیستان کے تمام قدیم قلعوں میں سے صرف طاق ہی تاریخ میں مذکور ہے۔

۹۹۹ - ۱۰۰۰ء:۔ تاریخ میں قلعۂ طاق کا اوّلین ذکر ۳۹۰ھ میں محمود غزنوی کے محاصرہ پر آتا ہے۔ اُس وقت خلف بن احمد حاکم سیستان تھا۔ محمود نے حملہ کیا تو خلف نے طاق میں محصور ہو کر مقابلہ کرنا پسند کیا۔ اُس کے وفادار پیرو کار ہی اتنے کم تھے کہ دار الحکومت میں رہ کر وہ حملہ کی مدافعت نہ کر سکتا تھا۔ طاق نسبتاً چھوٹی جگہ تھی اور وہ اپنے تھوڑے سے جان نثاروں کے ساتھ اس کا دفاع کر سکتا تھا۔ مزید برآں طاق ایک قدیم حصن حصین تھا اور وہ دشمن کو تھکا سکتا تھا یا صلح کے لئے بہتر شرائط منوا سکتا تھا۔

طاق کا تذکرہ:۔

سر ہنری رالنسن نے لکھا کہ "الطاق کا معیاری ذکر جو اصطخری اور ابن حوقل وغیرہ میں ملتا ہے صرف یہ ہے کہ یہ سجستان کا ایک چھوٹا سا شہر ہے جو زرنج سے خراسان کے مسافر کی پشت پر ہوتا ہے۔ اس کا ایک حصّہ پورے صوبہ کو انگور مہیا کرتا ہے۔ ایک جگہ اسے زرنج سے ایک منزل دور اور دوسری جگہ زرنج سے کش کی سڑک پر واقع اور زرنج سے پانچ فرسخ دور بتایا گیا ہے۔"

روضۃ الجنت فی الاوصاف مدینۃ الہرات کا مصنف طاق کے ذکر میں کچھ اضافہ

کرتا ہے جو قلعہ کی جگہ پہچاننے میں ممد و معاون ہے۔ "قلعۂ طاق بھی ہے جو دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہ ایک بڑی جسامت کا قلعہ تھا۔ اس کے تین دفاعی خطوط تھے۔ بیرونی جگہ زیر کاشت اور پُر از باغات تھی۔ دُوسرے اور تیسرے خطوط کی درمیانی جگہ میں لوگ رہتے تھے اور آخری احاطہ کے اندر ایک جن کی رہائش گاہ تھی جسے مجوسیوں نے بنایا تھا اور یہ بداندیش جن تمام لوگوں کی موت چاہتا تھا......۔ اور خلف بن احمد اس قلعہ کا آقا تھا جو قرآن حکیم کی تفسیر سے متعلق بے شمار کتب کا مصنف تھا۔ اور یہیں وہ محصُور ہُوا اور سُلطان محمُودِ سبکتگین نے اُسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا۔"

طاق کی تباہی اور تیمور :۔

مذکورہ مصنف کی تحریر سے سَو یا سوا سَو سال پہلے طاق، تیمور نے دار الحکومت کی تباہی کے بعد سیستان سے مراجعت کے وقت تباہ نہیں تو مسمار ضرور کر دیا تھا۔ جب تیمور ہلمند کی طرف رَوانہ ہوا تو اس وادی سے گذرا ہوگا جہاں ہلمند اس وقت ہے یعنی بند رکے نیچے لہٰذا طاق زاہدان کے جنوب کی طرف کوئی قلعہ ہوگا۔

سار وتار اور طاق :۔

زاہدان یا بنائے کے سے پانچ فرسخ یا بیس پچیس میل کے دائرے کے اندر کسی ایسے قلعہ کے آثار نہیں ہیں لہٰذا مذکورہ فاصلہ غلط ہوگا۔ نہ ہی یہ کنش کی سڑک پر ہو سکتا تھا کیونکہ یہ تو نخلستانِ خاش میں واقع کشت کا دُوسرا نام تھا، اصطخری نے اُس کا جو رُخ بتایا ہے کہ یہ زرنج سے خراسان جانیوالے مسافر کی پشت پر تھا وہی درست ہے۔ ایسا مُسافر اُن دنوں شمال یا شمال کے کچھ مغرب کی طرف سفر کرتا۔ گویا قلعۂ طاق دار الحکومت کے جنوب یا جنوب مشرق میں تھا۔ مزید براں تیمور شہرت گیر ہونے سے بہت پہلے سیستان کے متعلق بہت کچھ جانتا تھا۔ لہٰذا وہ قلعۂ طاق کو ہی قلعۂ طاق سمجھ سکتا تھا۔ قرین قیاس یہ ہے کہ سار وتار کی جگہ ہی یہ قلعہ تھی — بنائے کے اور رام شاہرستان کے بعد سار وتار ہی قدیم ترین جگہ ہے۔

سار و تار کا بیان :-

سار و تار کو ہم نے دیکھا ہے اور گو پُورے علاقہ اور کھنڈرات کی چھان بین ناممکن تھی۔ تاہم اس علاقے کا معائنہ کیا گیا ہے اور اس کی اہم جزئیات اور آثار کو سمجھا گیا ہے۔ سار و تار کا ایک قیاساتی نقشہ بھی تیار کیا گیا ہے۔ مندرجہ ذیل جزئیات اسی ذاتی معائنہ کا ثمرہ ہیں۔

سار و تار کھنڈرات کا محل وقوع :-

اس قدیم قلعہ سے چودہ میل شمال مشرق میں ضلع غلغلہ کے مجمع الآثار کے مقابلہ میں یہ قلعہ کسی وقت کے زرخیز میدان میں ایک الگ تھلگ جگہ پر واقع ہے۔ یہ جگہ وہاں ہے جہاں دشت مرگو کی مغربی ڈھلانوں سے میسکی سطح مرتفع ملتی ہے۔ اس کے آس پاس زیادہ کھنڈرات نہیں ہیں۔ مشرق کی طرف مغرب سے آنیوالی آبی نالیاں تھیں جو زمین کو سیراب کرتی تھیں اور دشت مرگو کے دامن کی کنکریلی زمین میں منتشر ہو جاتی تھیں۔

ہلمند سے سار و تار کے راستے :-

دو قدیم راستے دشت میسکی کو عبور کرتے ہیں۔ ایک ہلمند کی راس پُزِ ماشی کے نیچے سے چلتا ہے اور میسکی کی سطح مرتفع کو پار کرتا ہے، پھر ہوا کے خطّہ سے گذرتا ہے اور اس نشیب کے سرے سے ہوتا ہوا سار و تار پہنچتا ہے۔ یہاں ایک مینار کے کھنڈرات ہیں جو اتنا لمبا اور تنگ تھا کہ دخمہ یا مینار سکوت نہ ہو سکتا تھا بلکہ غالباً ایک دیدبان تھا جہاں سے کسی حملہ آور کی اطلاع دی جاتی تھی۔ جنوبی راستہ پہلے سے مختصر ہے۔ یہ ہلمند پر چہار برجک سے شروع ہوتا ہے۔ اور میسکی سطح مرتفع پار کر کے ایک وادی کے ذریعے میدان میں اترتا ہے اور سار و تار پہنچتا ہے۔

نادعلی اور زاہدان سے سار و تار کا فاصلہ :-

جب نہریں رواں تھیں اور قلعہ آباد تھا تو علاقہ خوب سرسبز اور گنجان آباد تھا۔ یہ بنگ کے سے کوئی ۲۴ میل اور زاہدان سے بھی قریباً اتنا ہی ہے۔ سیدھے راستے سے یہ موجودہ ہلمند سے ۱۷ یا ۱۸ میل ہے لیکن ریت کے غلاف نے زرخیز میدان اور کھنڈرات کو ڈھانپ لیا ہے۔ لہٰذا کوئی

۲۲ میل فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ سارو تار اُس پُرانی نہر کی دُم پر واقع ہے جو سرگاہ کھنڈرات کے نیچے اس علاقہ میں داخل ہوتی تھی جن سے چھ سات میل جنوب میں ایک اور پُرانے دریائی پاٹ کی نشان دہی ہو سکتی ہے۔ یہ ایک ٹھیٹ قلعہ تھا جو قدیم الایّام سے بنا ہوا بتایا جاتا ہے۔

سارو تار کی قلعہ بندیاں :۔

سارو تار کے دفاع کے لئے دیواروں کی ایک دوہری قطار تھی اور اگر قلعہ بند محل یا قلعہ کو ایک علیحدہ حیثیت دی جائے جیسا کہ دستور ہے تو پھر تین خطوط دفاعی تھے جو ابھی تک اتنے محفوظ ہیں کہ انہی کے مواد سے اس قلعہ کو از سر نو تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ آثار بیان کے منہ بولتے ثبوت ہیں :۔

دیواریں اور خندقیں :۔

تیسرا اور بیرونی خط دفاعی بہت شکستہ حالت میں ہے اور دیواروں کے ہنوز قائم ٹکڑوں کے درمیان ریت کے تودے جم گئے ہیں تاہم دو نو دروازے اور کہیں کہیں برج (محض خول) اب بھی پہچانے جا سکتے ہیں۔ یہ بیرونی دیوار ایک بے ڈھب معیّن نما ہے۔ یہ ہوا کے رُخ پر ہے اور اس کی شمال مشرقی دیوار ۳۰۰ر۴ فٹ شمال مغربی ۵۰۰ر۳ فٹ اور جنوب مغربی ۰۰۰ر۳ فٹ ہے۔ دیواروں کی اس قطار اور دُوسرے خط کے درمیان کھنڈرات برائے نام ہیں۔ دُوسرا خط دفاعی بہتر حالت میں ہے۔ یہ پختہ اینٹوں اور گندھی ہوئی مٹّی کے اُونچے اور ٹھوس ڈھیر ہیں جو ایک بے ڈھنگے دائرہ کی شکل میں ہیں جس کا قطر تقریباً ۱۸۰۰ فٹ ہے۔ ان دیواروں کے حلقہ کے وسط میں ایک اُونچی ڈھیری ہے جس کے اُوپر ایک قلعہ بند محل کے آثار ہیں جہاں حکمران ٹھہرتا تھا۔ دیواروں کی تینوں قطاروں کے گرد خندقیں تھیں۔ پہلی خندق جو بیرونی دیوار سے پرے تھی ابتداءً ۱۵۰ فٹ، دوسری قریباً ۱۲۰ فٹ اور تیسری (قلعہ کے گرد) کوئی ۸۰ یا ۱۰۰ فٹ چوڑی ہوگی۔ اب تینوں کی تینوں انحطاط پذیر دیواروں کے گرنے اور بہتے ہوئے مواد سے بھر گئی ہیں اور صرف پایاب نشیب بن کر رہ گئی ہیں جو ایک سرسری معلنے میں نظر سے

بچ بھی سکتی ہیں۔ تیسری خندق سے کوئی بیس فٹ اُوپر عمودی بلندی میں ایک بیرونی دیوار کے کھنڈرات ہیں جس کے پیچھے قلعہ کے اِردگرد ایک چھتا ہوا گول راستہ تھا۔ یہ قلعہ کے مورچوں اور خندق کی حفاظت کے لئے بنایا گیا تھا۔ گو دیوار تقریباً ناپید ہو چکی ہے تاہم اس بیرونی محافظ خانہ کے وجود کا صاف پتہ چلتا ہے۔ محل سے اس چھتے ہوئے راستے تک ایک سیدھی ڈھلان تھی جو ڈھیری کی چوٹی کی تعمیرات کے ملبہ، اینٹوں اور گلتی ہوئی مٹی سے بھر گئی ہے۔

قلعہ کی بیرونی فصیل کا دروازہ :-

چھتے ہوئے راستے کے تنگ دروازے کی حفاظت کے لئے ایک بہت مضبوط دارالباب تھا اور یہ قلعہ بند دروازہ قلعہ سے دو متوازی دیواروں کے ذریعے ملایا گیا تھا جنہیں کڑیاں جُدا کرتی تھیں اور راستے تک رسائی میں حائل تھیں صرف دائیں اور بائیں طرف سوراخ تھے۔ بلاشک وشبہ قلعہ کے اندر ایک دریچہ تھا جہاں سے کمک فوراً بیرونی دروازے کے مورچوں کی حفاظت کے لئے پہنچ سکتی تھی۔ دروازے کی اتنی حفاظت کے باوجود دیواروں میں روزن نہ تھے لہٰذا ان کی بنیاد کے پاس کی کافی زمین بیکار پڑی رہتی تھی۔

قلعہ کا دروازہ :-

بیرونی دروازے سے ایک ڈھلوان سڑک قلعہ کی دیواروں کے نیچے سے گزرتی ہوئی اس کے دروازے تک اُٹھتی تھی۔ اُوپر کی دیواریں بھی بے روزن ہیں لہٰذا محصورین بھی اپنے تیر وغیرہ دیواروں کی چوٹیوں سے ہی پھینکتے ہوں گے۔ سارو تار کی ہر چیز سے عیاں ہوتا ہے کہ اُسوقت فنِ جنگ بہت سادہ تھا، نشانے کے فاصلے کم تھے اور انفرادی قوت وتیز ایک معرکے کی کامیابی کا فیصلہ کرتی تھی اور لڑائی دست بدست یا دُو بدو ہوتی تھی۔

قلعہ کا نقشہ :-

محل کی عمارات کے بالائی کمرے تو اب قریباً بے ڈھب کھنڈرات ہیں اور ان کا ملبہ زیریں کمروں کے دروازوں میں اَٹا ہوا ہے۔ ایک دیوار کے سوراخ سے ایک گنبد بن کمرے میں داخل

ہو سکتے ہیں جس میں بڑی پختہ اینٹوں کا فرش ہے اور اس روایت میں صداقت ہو سکتی ہے کہ ڈھیری کی سطح کے نیچے زیریں کمروں کی تہیں ہیں۔ بیرونی دیواریں بھی بُری طرح موسم زدہ ہیں اور ان کی چوٹیوں کے روزن ناپید ہو چکے ہیں۔ قلعہ کا نقشہ چھ بے ڈھب پہلوؤں کا کثیر الاضلاع ہے۔ بیرونی دیواریں پختہ اینٹوں یا مٹی سے بنی ہیں لیکن اُوپری حصّہ کے نیچے ایک آرائشی حاشیہ بھی تھا اور کہیں کہیں پختہ اینٹوں کے ردّے ہنوز موجود ہیں۔

سامان تعمیر اور کھنڈرات کی نوعیت :۔

ہو سکتا ہے مٹی یا کچّی اینٹوں کے اُوپر پختہ اینٹوں کی تہہ ہو لیکن اب یہ غائب ہو چکی ہیں۔ اور ان کا مواد گل کر ڈھیری کی سیدھی ڈھلان بلکہ مسقّف راستے تک پہنچ گیا ہے۔ اینٹوں اور ظروف کے اس کوڑا کرکٹ میں بہت سے آب زدہ سنگپارے ہیں جو مختلف جسامتوں کے ہیں اور کچھ وزن میں ۲ پاؤنڈ اور کچھ ۴ پاؤنڈ ہیں۔ یہ قرب وجوار میں بھی ملتے ہیں لیکن یہ تعمیر میں استعمال نہ ہوتے تھے۔ اندرونی دیواروں کے اندر پختہ اینٹوں اور دیوار پاروں کا ڈھیر ہے۔ ٹوٹی ہوئی محرابوں اور چھتّہ نما کھنڈرات کا انبار ہے جن کی اصل شکل کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ اس پرمستزادیہ کہ ریت کے تودوں نے اکثر تباہ شدہ حصّوں کو چھپا اور دبا دیا ہے۔ کچھ کھنڈرات دیگر عمارتوں کی نسبت بڑی عمارات کے مظہر ہیں۔ پختہ اینٹیں زیادہ تر عمارات کے ان حصّوں میں استعمال ہوتی تھیں جن پر موسمی دباؤ زیادہ ہوتا یا نمی کا حملہ بار بار ہوتا۔ ان کا ایک مقصد آرائش بھی تھا۔

دُوسرے خطِ دفاعی کے اندر کا محل :۔

تیسرے خطِ دفاعی کے زاویے کے اُوپر اور دیواروں سے ملحق اندرونی قلعہ میں ایک بہت بڑی خوبصورت عمارت کے کھنڈرات ہیں۔ یہ ایک اہم عمارت تھی اور اسی لئے اچھی بنائی اور سجائی گئی تھی اور اس پر خوب پلستر کیا گیا تھا۔ یہ بلندی میں دو تین منزلہ تھی۔ شمال مشرقی رُخ پہ دیوار کی چوٹی یا اس سے ذرا نیچے پختہ اینٹوں کے ردّے تھے۔ چھت سے کھلی نالیاں نیچے آتی تھیں جو دیوار میں پکّی اینٹوں اور چُونے کے گارے سے بنائی گئی تھیں اور موخر الذکر

سے ہی لیپی گئی تھیں۔ جگہ کی قلت کے باعث غسلخانے اور مطبخ چھت کے اُوپر تھے اور وہاں سے نالیاں نیچے آتی تھیں جن سے آب باراں بھی نیچے بہتا تھا کیونکہ چھتیں مسطح تھیں۔ پختہ اینٹوں کے ردّوں کے نیچے پلستر میں چھوٹے چھوٹے دیواری ستونوں کی ایک قطار تھی جو روزن معلوم ہوتے تھے۔ سارہ دتار کی دیواروں کی تمام محفوظ چوٹیوں پر ایسی ہی آرائش کی گئی ہے یہ بہت قدیم انداز آرائش ہے اور عمارات کی قدامت کا مظہر ہے۔ یہ انداز قلعہ کی محفوظ دیواروں اور تخت پل کے پاس مورچوں کی اندرونی قطار کی چوٹی کے ساتھ ساتھ بھی پہچانا جا سکتا ہے۔

تعمیراتی جزئیات، محرابیں :-

بیرونی محل میں دو مختلف نمونوں کی محرابیں ہیں جو راستے کا کام دیتی تھیں۔ نچلی منزل میں محرابیں سراسر پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی ہیں جو ایک مرکزی مقام سے چلتی ہیں۔ بالائی منزل کی محرابیں یکسر چکنی مٹی کے قطعوں کی ہیں جو صرف ایک یا دو انچ موٹے ہیں اور ایک خم دیکر دھوپ میں سکھائے گئے ہیں۔ یہ پہلو بہ پہلو گارے میں نصب کئے گئے ہیں اور یوں محراب بنی ہے۔ ان قطعوں کی نچلی سطح پر بھی خوب پلستر کیا گیا ہے۔ یہ پلستر اب اُتر چکا ہے اور خمدار سطح ننگی ہو گئی ہے جہاں سے پتلے قطعوں کے سرے نظر آتے ہیں اور اس عجیب طرز تعمیر کو ظاہر کرتے ہیں۔ بالائی منزل کی محرابیں کشادہ اور خوشنما راستے ہیں اور سیستانی معمار ہمیشہ انہیں مٹی یا ٹائیلوں سے بنانے کے شائق رہے ہیں۔

اندرونی قلعے کی دیواروں کے ساتھ ساتھ گنبدیں کمرے تھے اور ایک تنگ برآمدہ دیواروں کے محیط کے ساتھ ساتھ تھا جس سے ہر کمرے سے بغلی رابطہ ہو سکتا تھا۔ ان دیواروں کے اندر سوراخ تھے جو باہر سے ایک روزن اور اندر سے ایک پست دروازہ تھے۔

کمروں کے روزن :-

گول میناروں کے کمروں میں تین چھید تھے۔ ایک سامنے اور ایک ایک دائیں اور بائیں۔ پانہ شکل میناروں کے کمروں میں صرف دو سوراخ تھے دائیں اور بائیں۔ یہ گول میناروں کے

ساتھ باری باری بدل جاتے تھے جیسا کہ چہل برج کے آثار میں بیان ہوگا۔

کمزور دفاعی میمنہ اور میسرہ :۔

مینار بجائے خود کمزور تھے اور کوئی سہارا نہ دے سکتے تھے اور پہلوؤں پر بھی اُن کی دفاعی امداد ناکافی تھی۔ دیواروں کی بہت اُونچائی (جو اب بھی کوئی ۵۰ فٹ ہیں) کی وجہ سے ان کے دامن کی بیشتر زمین بیکار تھی۔ فصیلوں کے ساتھ ساتھ اندر اور باہر ریت کے تودے ہیں۔ لہٰذا ان دیواروں کے دفاع کے متعلق مزید جزئیات کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن بیرونی خندق کے سرے اور دیواروں کی ہر قطار کے دامن کے درمیان یقیناً ایک مسقّف راستہ ہوگا۔ بیرونی فصیل اب عرصے سے گر چکی ہے اور ریت کے نیچے دب گئی ہے۔

قلعہ کی محروم برج دیواریں :۔

قلعہ پر مینار یا برج نہ تھے اور صرف مسطح اُونچی دیواریں ہی حفاظت کا کام دیتی تھیں جن کے اُوپر پختہ اینٹوں کا حاشیہ تھا اور جن میں دو تین فٹ نیچے روزن تھے۔ دیواروں میں روزن نہ تھے، البتّہ کچھ سوراخ ضرور تھے جن سے اندرونی قلعہ کو دیکھا جا سکتا تھا۔ قلعہ کی دیوار کے علاوہ صرف بیرونی دیوار ہی سامانِ تحفّظ تھی۔

قلعہ کا دروازہ :۔

باب عالی ایک آگے کو بڑھا ہوا لیکن بے روزن مینار تھا اور یہ خوش ساختہ تھا۔ راستہ دس یا بارہ فٹ چوڑا تھا۔ ایک گنبدیں راستے سے چڑھ کر یہ محافظ خانہ پہنچتا تھا جو دائیں طرف کے صحن کو راہ دیتا تھا۔ محل کا دروازہ دار الباب سے ایک طرف ہٹا ہوا تھا اور اُس کو محل کی شمالی اور مغربی دیواروں کے بیچے سے پگڈنڈی جاتی تھی۔ محل دو تین منزلہ تھا اور مربّع شکل کا تھا۔ اس کے علاوہ بنیادی منزل پر یکے بالائے دیگرے تین کمرے تھے۔ باب عالی کی محراب پختہ اینٹوں سے بنی تھی اور راستے کا گنبد بھی۔ راستے کے اُوپر محافظ خانہ تھا اور دار الباب دو منزلہ تھا۔ صعودی راستے کی گنبدیں چھت گر گئی ہے اور راستہ اور کمرے عُریاں ہو

گئے ہیں۔ کہیں کہیں کھڑی ہوئی اینٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ راستہ اور دروازہ پختہ اینٹوں سے بنے تھے۔ راستہ دوہرے خم کا تھا اور محافظ خانے کے دروازے پست اور تنگ تھے جن کی مورچہ بندی ہوسکتی تھی اور دشمن کو روکا جاسکتا تھا۔

محل بجائے خود سیستانی فن تعمیر کے عام نمونے کا ہے اور بعد میں غالباً اس کی تجدید بھی کی گئی، گو پرانی قلعہ بندیاں جوں کی توں رہیں۔ محل کی محرابیں سکھائی ہوئی اینٹوں سے بنی ہیں، جو ایک مرکز سے پھیلتی ہیں۔

بیّن طور پر ایک بالائی ترین بُرج یا کمرہ تھا جس کی ایک دیوار ہنوز سلامت ہے۔ یہ بلاشک وشبہ زمانۂ امن میں ایک خوشگوار تفریح گاہ تھا جہاں سے گردوپیش کا وسیع منظر دیکھا جاسکتا تھا اور زمانۂ امن میں یہ ایک دیدبان کا کام کرتا تھا جہاں سے پہرہ دار دشمن کی آمد دیکھ سکتا تھا' یا قلعہ کا کمانڈر دفاعی کاروائیوں کی نگرانی و رہنمائی کرتا تھا۔ قلعہ کی دیواروں کے ساتھ کمروں کی قطاریں تھیں جو ایک صحن میں کھلتے تھے۔ اس صحن میں فوج اور محل کو پانی کی فراہمی کے لئے ایک کنواں تھا۔

ماورائے قلعہ شہر کا دروازہ :-

اندرونی قلعہ کا کوئی دروازہ دریافت نہیں ہوا۔ ریت کے تودوں نے اسے دبا دیا ہے لیکن دیواروں کے گھیر کے جنوب مشرقی حصّہ میں ایک بہت بڑے مربّع مینار کے آثار ہیں جس کا صرف مشرقی رُخ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ یہ مینار دیواروں سے ۳۰ فٹ آگے کو نکلا ہُوا تھا اور اسی کے اندر بڑا دروازہ اور اس کے بغلی دروازے ہوں گے جو مینار کے دائیں اور بائیں مسقّف راستے سے رابطہ کا کام دیتے ہوں گے۔

لیکن اندرونی دیواروں کے شمال مغربی اور جنوب مشرقی حصّوں میں دو جگہیں ایسی ہیں جہاں اندرونی دیواروں کو کم از کم ۲۵ فٹ گھٹا کر ایک چبوترہ یا شگاف بنایا گیا جو زمین سے اتنا ہی بلند تھا اور اس کی پیمائش کوئی ۱۲ فٹ مربّع تھی۔

اُٹھاؤ پُل کی روایت :-

روایت بتاتی ہے کہ ان شگافوں میں اٹھاؤ پل یا دیگر عارضی پُل موجود تھے۔ مغربی شگاف کھنڈر بن چکا ہے لیکن اس کے مقابل کا بہتر حالت میں ہے۔ سنگ وخشت کے تختوں کی موجودگی ظاہر نہیں ہوتی جن سے اٹھاؤ پل کی چرخیاں باندھی جاسکتی تھیں اور نہ ہی ایسی چرخیاں معلوم ہوتی ہیں جو پُل کو اُوپر اٹھاتی اور نیچے لاتی تھیں۔ خندق کی چوڑائی ایسے پُل کے مانع تھی۔ ایک بڑا نیم مدّور مینار چبوترے کے جنوب میں شگاف کا محافظ ہے۔ اس مینار کے اندر چھ باہم پیوست کمرے ہیں جو باہر کی اطراف پر روزن دار ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں پانچ چھ آدمی سما سکتے تھے۔ ان میں بھی مینار کو دیکھنے کیلئے سوراخ تھے اور مینار میں ایک صعودی نیم مدّور ڈھال تھی جو ۱۲ فٹ مربّع محافظ خانہ تک جاتی تھی۔ یہاں سے پانچ کمروں میں داخل ہوسکتے تھے اور ایک پست خشتی محراب کے نیچے سے دیواروں کے شگاف کے چبوترے پر جاسکتے تھے۔ ایک خوشنما محرابی کھڑکی سے ڈھال کا منظر دیکھا جاسکتا تھا۔ شگاف کی بیرونی طرف ریت کے تودے ہیں لہٰذا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہاں عارضی پل کے لئے کوئی شہتیر یا تختہ تھا یا نہیں لیکن مقابل شگاف میں ریت کے تودے نہیں ہیں اور یہاں ایسے پُشتے کے آثار ہیں لہٰذا ان شگافوں کا مقصد سمجھ میں نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ ہوا کے رُخ پر واقع ہونے کی وجہ سے یہ اُونچی دیواروں میں محصُور گنجان عمارتوں کے لئے روشندانوں اور ہوادانوں کا کام دیتے ہوں یا یہ کوڑا کرکٹ کو باہر لے جانے کے لئے ہوں تاکہ باغات وکشت زار کو کھاد مل سکے۔ محافظ خانہ بھی زمانۂ جنگ میں فوجی افسروں کا مرکز ہوسکتا تھا جو دیواروں کے مشرقی اور مغربی نصف کی حفاظت پر مامور ہوتے تھے۔

قبریں :-

تخت پل کے پاس اور خندق سے پرے قبروں کے آثار ہیں جن کی بنیادیں اور زیریں دیواریں پکّی اینٹوں کی ہیں۔ دو تباہ شدہ مقابر کے بالائی حصے جن کی دیواریں کچھ ایستادہ ہیں سکھائی ہوئی اینٹوں یا مٹی سے بنے تھے۔ ان میں غالباً خلف ابن احمد نے اپنے مقتول بیٹوں طاہر اور عمرو کو دفن کیا اور انہیں

ان کے بعض اور اخلاف بھی دفن ہوئے ۔ یہ دیواروں کے جنوب میں ہیں ۔

اندرونی قلعہ کا بڑا محل جس کے بالائی فرش پر اونچے اور متناسب تالار ہیں یقیناً مختلف وزرائے سلطنت کے انتظامی عملہ کا مرکز تھا ۔ بالائی تالار صرف اس وقت استعمال ہوتے تھے جب حکمرانِ بنفسِ نفیس دربار کرتا اور نیچے مختلف سرکاری شعبے تھے جہاں کتّاب مسوّدات تیار کرتے اور وزیر اعظم کی نگرانی میں دفتری کام بھگتایا جاتا ۔ اس کی ملحقہ عمارتیں زیادہ تر پکّی اینٹوں سے بنی تھیں جیسا کہ ریت سے محفوظ ملبہ سے پتہ چلتا ہے ۔ پکّی اینٹوں کی بنیادیں اور کرسیاں خندق کے سرے تک ہیں ۔ قرب و جوار میں پکّی اینٹوں سے بنی ہوئی زیریں دیواریں یا ان سے آراستہ دیوار پارے بیشمار ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ عمارات دومنزلہ یا یکے بالائے دیگرے تھیں ۔

چہل برج :-

گول اور مثلّثی میناروں کا نوبت دار سلسلہ چہل برج کی مورچہ بندیوں سے بخوبی آشکار ہے ۔ یہ سار وتار سے چھوٹا ایک مربّع قلعہ ہے ۔ دیواروں کے اندر ایک ۵۰۰ فٹ مربّع کھلا صحن ہے ۔ دیواروں کے گرد دومنزلہ عمارتیں تھیں جن کے آثار ۵۰ فٹ چوڑے ہیں اور جو پورے کھلے صحن کے اردگرد تھیں ۔ چاروں دیواروں کی لمبائی سے ایک راستہ گذرتا تھا جو بالائی کمروں کو دو حصّوں میں بانٹ دیتا تھا ۔ راستے کے دہنی یا بیرونی طرف کے کمروں کا میناروں کے اندرونی کمروں سے رابطہ تھا بمقابل یا بائیں طرف کے کمرے بڑے تھے اور رہائش کے لئے مستعمل تھے ۔ ان کی چھتیں ایک وسیع چبوترہ تھیں جہاں مدافعین روزنوں کے پاس کھڑے ہوکر حملہ کا مقابلہ کرتے تھے ۔

سار وتار سے مقابلہ :-

سار وتار کے قلعہ میں بھی یہی انتظامات وسیع پیمانے پر تھے ۔ اندرونی عمارتوں اور قلعہ کی خندق کے بیرونی سرے کے درمیان بڑی عمارتیں تھیں جن میں کچھ کھلی جگہیں اور گلی کوچے تھے ۔ چہل برج میں قلعہ سار وتار کے آئینہ دار ایک محلانچہ، ایک مندر اور والی کی رہائش گاہ تھے ۔ چہل برج کی طرح سار وتار بھی ایک ٹھیٹ قلعہ تھا ۔ سار وتار میں کچھ دائمی باشندے بھی تھے لہٰذا اسے ایک قصبہ

بھی کہا جا سکتا ہے۔

سار وتار اور چہل بُرج کے معمار :۔

سار وتار اور چہل بُرج کی صناعی غالباً پارتھوی یا ہند پارتھوی نسل کی ہے اور ان کی حکومت سیستان کا مرکز یہی جگہیں تھیں۔ انہی کے قرب وجوار سے لوگ ساسانی اور پارتھوی سکے بیچنے کے لئے لاتے تھے۔ خواجہ امیران کی روایت کے مطابق یہاں اشگ کے پتر (بیٹے) رہتے تھے یہ قابل یقین ہے اس لئے کہ ایک قبیلہ اب بھی اس قدیم حکمران نسل کا وارث ہونے کا دعویٰ کرتا ہے جو پارتھوی اور صرف پارتھوی ہی ہو سکتی تھی۔

کشن پال کی روایت :۔

سار وتار سے ایک عجیب روایت وابستہ ہے کشن پال کی کہانی سے پتہ چلتا ہے کہ قلعہ کیوں چھوڑا گیا۔ ۱۷۰۲ سال[1] پہلے یکایک اور بلا وجہ ایک لومڑی کے قد کا جانور اس علاقے میں نمودار ہوا، اُس کی دُم کئی گز لمبی تھی اور یہ جہاں سے گذرتا تھا فصلیں تباہ ہو جاتی تھیں اور لوگ مَر جاتے تھے۔ اس تباہ کن بد رُوح نے سار وتار کو اپنا مسکن بنا لیا اور ۴۰ سال کے لئے یہ جگہ غیر آباد ہو گئی۔ آخر کار بچے کھچے لوگوں نے ایک نیک اور پارسا تارک الدنیا کو تلاش کر لیا۔ وہ اسے ساتھ لیکر آئے اور اس نے بد رُوح کو نکال باہر کیا اور قلعہ اور علاقہ دوبارہ انسانی سکونت کے قابل ہوئے۔ یہ تمثیل کسی وبا یا خارجی حملہ کی طرف اشارہ ہے جس نے ملک کو اُجاڑ دیا — ۱۷۰۲ سال سے اس واقعہ کی تاریخ ۲۰۳ء نکلتی ہے۔ اس سے چند ہی سال قبل ساسانی خاندان کے بانی اردشیر بابک نے آخری پارتھوی بادشاہ اردوان کو شکست دیکر اس خاندان کی عظمت وحکومت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ اس وقت ساسانی خاندان کا بانی ان سرداروں کو مطیع کرتا پھر رہا تھا جو پارتھوی دور کے اواخر میں بے لگام ہو گئے تھے۔

---

[1] یعنی ۱۹۰۵ سے اتنے سال پہلے۔

پارتھوی یا ہند پارتھوی سرداروں نے اس دَور میں سیستان پر بھی حکومت کی اور اس دُور افتادہ علاقے میں ان قصبوں اور قلعوں کے آثار موجود ہیں جو کسی وقت انکے ماتحت تھے۔ سار و تار کا قلعہ اپنی مضبوطی اور دَریا سے فاصلہ کی وجہ سے ہمیشہ حکومتوں کا ایک اہم قلعہ رہا۔ اس کی فصیلیں یقیناً وہی ہیں جو اس کی اوّلین تعمیر پر بنی تھیں، اسی لیے محل اور اندرونی قلعہ کے اندر کی عمارتوں میں اتنا فرق ہے جو زاہدان کے اندرونی آثار کی طرز اور وضع کی ہیں۔

سار و تار کی نالیاں :۔

ایک اور عجیب بات نالیوں کی موجودگی ہے جن میں سے چار کھُلی نالیاں ابھی تک قابلِ شناخت ہیں۔ یہ پکّی اینٹوں اور گارے کی بنی ہوئی ہیں جو اب قریباً تباہ ہو چکی ہیں۔ یہ نالیاں مسقّف راستے اور خندق تک جاتی تھیں۔

سار و تار اور زاہدان کا نظامِ مورچہ بندی :۔

نمی کا نفوذ، سردی اور گرمی کا یکے بعد دیگرے تواتر اور ہوا کا عمل ہمیشہ سے سیستان پر حاوی و طاری ہیں۔ لہٰذا آب و ہوا کے مُطابق ایک مخصوص نمونے کی عمارت مناسب سمجھی جاتی تھی اور ان عناصر کے تخریبی عمل سے بچنے کے لیے ایک مخصوص طرزِ تعمیر وضع کی گئی۔ سیستان کے تمام آثارِ قدیمہ میں عمارت کا نمونہ، رُخ اور طرزِ تعمیر اہمیات میں بہت کم بدلا۔ لہٰذا مقابلہ صرف قلعہ بندی کے نظام میں ہی ہو سکتا ہے بشرطیکہ قلعہ بندی کافی حد تک دستبرد سے محفوظ رہی ہو۔ زاہدان کے بُرجوں کا سہارا اور پردوں اور مسقّف راستوں کی جو حفاظت وہ کرتے ہیں وہ موجودہ سائنسی تعمیرات کا پیش خیمہ ہے جو سار و تار کی تعمیرات میں سرے سے غائب ہے۔ سار و تار کی بھاری بھر کم دیوار ایک ایسے دَور کی مظہر ہے جب فنِ جنگ ابھی غیر ترقی یافتہ تھا اور اس جاہلانہ بہادری اور وحشیانہ قوّت کے مقابلہ کے لیے ٹھوس سنگ و خشت کی دیواروں کو کافی سمجھا جاتا تھا۔ تباہ شدہ حالت میں بھی قلعہ کی چوٹی سطحِ زمین سے ۸۰ فٹ بلند ہے اور ریت کے مہیب ٹیلوں کے باوجود دُور سے نظر آتی ہے۔ دیہہ ارباب دوست محمدؐ کے پاس کی کسی ڈھیری سے بھی سار و تار

دیکھا جا سکتا ہے۔

سار و تار کی تباہی۔ دسمبر ۱۳۸۴ء۔

۷۸۵ھ میں زاہدان تباہ کرنے اور شاہی خزانہ لوٹنے کے بعد امیر تیمور گورگانی ہلمند کو روانہ ہوا، اور اس کا لشکر موجودہ دیہہ ارباب دوست محمدؒ کے پاس سے گذرا۔ ان دنوں یہ علاقہ سیراب و شاداب تھا اور سار و تار یا طاق کے گرد ریت کے موجودہ ٹیلے نہ تھے۔ لہٰذا یہ عظیم قلعہ فوراً نظر آگیا۔ تیمور کو پہلے سے بھی اس کا علم ہوگا یا اس کے جاسوسوں نے اسے بتایا ہوگا۔ لہٰذا فاتح اس کی طرف مڑا اور قلعہ دار کو ہتھیار ڈالنے کے لئے کہا۔ دارالحکومت کی تباہی اور حکمران کی حراست کے بعد ایک دُور افتادہ قلعہ کی مزاحمت کی کوئی عملی وقعت نہ تھی۔ لہٰذا یہ مشہور قلعہ جو بیشمار دشمنوں کا مزاحم رہا تھا تیمور کی تحویل میں دے دیا گیا جس نے اسے حکماً منہدم کروا دیا۔

باب دوازدہم

زاہدان کے ہم عصر کھنڈرات

شمالی زاہدان کے کھنڈرات :-

مشرقی زاہدان کی تشیلا شمال مغرب کو چلی جاتی تھی اور اُس کے اُوپر یا اُس کے قریب کھنڈرات کی وہ قطار تھی جسے کرسٹی نے دُوشک کے کھنڈرات سمجھا اور جو اچھا خاصا مخمصہ بن گیا کیونکہ اُس وقت سے دُوشک نامی قصبے کو ہی ان کھنڈرات کی اصلی جگہ سمجھا جانے لگا۔ یہ کھنڈرات اوچہار دری، موجُودہ گاؤں بُرج افغان، قدیم بولائی اور مزید شمال مغرب میں پٹہ کو ہلک کے کھنڈرات سب کے سب دور زاہدان کے ہیں اور اُس شہر کی تباہی کے ساتھ ہی معرض ظہور میں آئے۔

رِندان :-

بڑے کھنڈرات حویلیوں کے ہیں اور ان کے وَسط میں ایک سخت قلعہ بند چوکی تھی جہاں لوگ پناہ لے سکتے تھے۔ یہ چوکی رِندا یا رندان نامی ڈھیری کے ارد گرد کے کھنڈرات کی صُورت میں موجُود ہے جبکہ ڈھیری خود قلعہ کا پُرانا بُرج تھی۔ قلعہ چوکور تھا اور اُس کے ارد گرد ٹھوس دیواریں تھیں جو اب ڈھیریاں بن چکی ہیں۔ چاروں کونوں میں سے ہر ایک پر بڑے بڑے بُرج تھے۔ اندرونی حصّہ کو ایک دیوار جُدا کرتی تھی جو مربّع احاطہ کے مشرقی رُخ پر ٹھیٹ قلعہ کرد و غیر مساوی حصّوں میں تقسیم کرتی تھی اور اُس کی کھنڈراتی ڈھیریاں پکّی اینٹوں اور شکستہ ظروف سے بھری پڑی ہیں۔ اینٹیں چونے کے گارے سے بنی تھیں نہ کہ سُرخ یا چکنی مٹی سے۔ مربّع کا شمالی اور

بڑا حصّہ بے ڈھنگی ڈھیریوں کا مجموعہ ہے جو الگ تھلگ عمارتوں کے باقیات ہیں لیکن جنوبی اور چھوٹا حصّہ تین متوازی گلیوں میں تقسیم تھا جو بالکل سیدھی اور شکل دار تھیں اور جن کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی۔ قلعہ بھی زاہدان کے رُخ پر تھا یعنی ۲۹ درجے شمال مغرب میں اور گلیاں بھی اسی سمت میں ہیں اور قلعہ کے ہر حصّہ میں شمال مغربی رُخ پہ ایک ایک دروازہ تھا۔ ان گلیوں کے درمیان گھروندے تھے جن کے نشانات واضح ہیں جو قلعہ کی دیواروں کے ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ یہاں فوج ٹھہرتی تھی اور ان کی چھتوں پر کھڑے ہو کر مدافعت کرتی تھی۔ یہ قلعہ مربّع تھا جس کا ہر ضلع ۶۰۰ فٹ تھا اور اس کے نشانات موجود ہیں گو دیواریں، عمارتیں اور برج ملبے کے ڈھیر بن چکے ہیں جن کے اوپر شور کی ایک موٹی تہہ جم گئی ہے۔ قلعہ کے جنوب میں بڑی دیواروں سے کوئی ۱۰۰ گز ورے بیرونی خط دفاعی کے کھنڈرات ہیں۔ شمال کی طرف بھی ایک قلعہ بند جگہ کے آثار ہیں جو قلعہ زندان سے چھوٹی تھی۔ لیکن اس علاقے میں اتنے سالانہ سیلاب آتے رہے ہیں کہ صرف قلعہ کی وسعت کا پتہ چل سکتا ہے۔ قلعہ کے آس پاس ہوا کے وسیع اور گہرے رخنے ہیں لیکن یہ اتنا ٹھوس تھا کہ وقت اور آبی عمل اس پر اثر انداز نہ ہو سکے۔

زاہدان کی مشرقی دیوار کے عین نیچے سے جو بڑی نہر بہتی تھی وہ اس قلعہ کے مشرق سے گذرتی تھی۔ زاہدان کی ایک اور نہر اس کے مغرب سے گذرتی تھی۔ اب یہ دو تو آب پریوں سے بھری رہتی ہیں اور قلعہ جزوی طور پر ایک جزیرہ ہے اور جزوی طور پر ڈھیریوں کا ایک سلسلہ جس کے گرد مختلف گہرائی کا پانی ہوتا ہے یا دلدلی زمین۔

زندان کے شمال کے کھنڈرات :۔

زندان کے مشرق کے کھنڈرات، زاہدان کے ذرا مشرق سے نکلنے والی شیلا کی ایک شاخ کے ساتھ ساتھ ہیں۔ یہ ایک ٹرگ کی شاخ پہ واقع ہیں جس پر شہر ایستادہ ہے۔ لہٰذا یہ سیلاب کی زد سے باہر ہیں اور اسی لئے مکمل تباہی سے بچ گئے ہیں۔ زندان سے کوئی تین میل شمال مغرب میں یہ ختم ہو جاتے ہیں کیونکہ اس کے بعد یہ ٹرگ زرخیز میدان کی سطح پہ آجاتی ہے۔ جہاں سالانہ

طغیانیوں نے تمام عمارات کے نشانات مٹا دیئے ہیں جو کوہلک ڈھیری کے ارد گرد تھیں۔ یہ ایک اندرونی تالار کے گرد گنبدیں کمروں کے ایک بڑے کھنڈر میں ختم ہو جاتے ہیں یہ ایک بڑی عمارت تھی کیونکہ کھنڈرات اونچے ہیں اور منظر پر حاوی ہیں۔ اسے چہل خانہ کہتے ہیں کیونکہ یہ ۴۰ کمرے تھے اور غالباً مسجد بمعہ مدرسہ تھے۔

کوہلک :-

کوہلک ایک اور چھوٹا سا قلعہ تھا اور اب صرف اس کے برج کی ڈھیری یا بیرونی دیوار کی چند آب زدہ ڈھیریاں باقی ہیں۔ یہ جگہ قلعہ رندان سے نصف ہو گی لیکن چونکہ یہ پیشاوران کی طرف آخری قلعہ تھا اور راموں کے رقبہ کے جنوبی سرے پر تھا لہٰذا یہ رندان سے زیادہ پناہ گزینوں کو سنبھال سکتا تھا۔

ساوری شاہ کی بڑی نہر :-

بڑی نہر جس کے آثار موجود ہیں اور جو کوہلک کے دو میل مشرق سے گذرتی تھی اور ساوری شاہ تک جاتی تھی اور ان زمینوں کو سیراب کرتی تھی جو غرقاب ہو چکی ہیں۔ غالباً شیلا تھی جو زاہدان کے ذرا مشرق میں بہتی تھی۔

رندان کے مغرب کے کھنڈرات :-

پرانے قلعہ رندان کے مغرب اور جنوب مغرب میں بھی بہت سے کھنڈرات ہیں لیکن یہ علاقہ چونکہ ۲۰۰ سال سے زیر کاشت رہا ہے لہٰذا تہذیب کے آثار جسے تیمور نے تباہ کیا، بالکل غائب ہو گئے۔ کہیں کہیں کوئی پرانا مجسمہ ڈھیری کی شکل میں موجود ہے اور کاشتکار ہل چلاتے وقت اس سے پکی اینٹیں نکالتے ہیں۔ اینٹیں ایک جگہ جمع ہوتی ہیں اور انہیں نکالنے والا پہلا شخص انہیں ایک دو گدھوں پر لاد کر لے جاتا ہے۔ لہٰذا زاہدان کے مشرق میں اتنی ہی قدامت کے کھنڈرات غائب ہو گئے ہیں، مزید مغرب میں زمین کا نشیبی قطعہ ہے، جو مدتوں سے ہلمند کی جولانگاہ رہا ہے اور جہاں گاد کے ذخیرے خوب جمع ہیں۔ جن آثار کو گاد نہ چھپا

سکی، انہیں ریت کے ٹیلوں نے دبا دیا ہے۔ یہ ٹیلے زیادہ تر قطاروں میں ہیں اور غالباً کھنڈرات پر جم گئے ہیں کیونکہ ان کا سلسلہ ہوا کے عام رُخ پر ہے۔ ان ٹیلوں پر تمرس اُگے ہوئے ہیں جن کی جڑیں ریت کے نیچے دبے ہوئے کھنڈرات تک پہنچ گئی ہیں اور یوں یہ ٹیلے دائمی ہو گئے ہیں اور اپنی ہی پر وردہ نباتات سے مستحکم ہو گئے ہیں۔ زاہدان سے مشرق کی طرف دیکھیں تو اُونچے ٹیلوں کی ایک قطار شمال مغربی سمت میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور چونکہ یہ زاہدان کے نظام انہار کا محور رہے لہٰذا یہ زیادہ اغلب ہے کہ یہ پرانی نہروں پر گسترده ہیں جنکی گذرگاہوں اور کناروں نے ریت کو اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔

قلعۂ زرو :-

آج کل کے سیستان کے شہر کے جنوب میں ایک پرانا کھنڈر موسومہ بہ قلعۂ زرو ہے جو دور زاہدان کا آخری کھنڈر ہے۔ مزید جنوب کی طرف ڈھیری موسومہ بہ "چُنگ مرغُن" کے گرد کے کھنڈرات جو کرنل یاٹ کے سفرنامہ سیستان میں مذکور ہیں، اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ سیستان میں موجود کیانی خاندان کے موجودہ نمائندہ نے بتایا کہ ڈھیری کے پاس چاندی کے سکوں کا ایک چھوٹا سا دفینہ ملا جو ملک قطب الدین کے عہدِ حکومت میں مضروب ہوئے تھے اور مشن کے سیستان پہنچنے سے چند سال پہلے ایک کھیت سے برآمد ہوئے۔

زاہدان کے قریب قدیم گلستان :-

موجودہ دار الحکومت سے قریباً ساڑھے سات میل عین جنوب میں ایک چھوٹا سا قطعۂ زمین ہے جو ہواؤں کا تختۂ مشق ہے اور مکانات وانہار کے کھنڈرات سے پٹا پڑا ہے۔ نمایاں ترین سفید مٹی کی ایک ڈھیری ہے جو ایک تباہ شدہ عمارت کے ملبہ سے بنی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ملک قطب الدین کے زمانہ میں یہاں ایک تفریح گاہ تھی کیونکہ یہاں کی زمینوں پر باغات بہت تھے اور اسی لئے یہ محال گلستان کہلاتی تھی۔ ان باغات سے محل کو ۷۰ من گلاب کے پتے مہیا ہوتے تھے جن سے عرق کشید کیا جاتا تھا۔ اس قطعۂ مینو اساس کی ہیئت کذائی

دیکھ کر شاید ہی کسی اور جگہ کا تصوّر ہو سکے جسے ادبار و انحطاط نے اتنا پامال کیا ہو۔ اس میں مغرب کی طرف کے موجودہ دیہات بہرام آباد اور باغاک، شمال کی طرف جوتیغ، مشرق کی طرف جز نیک، اور جنوب کی طرف دیہہ بگی کے علاقے شامل تھے۔ اب جنوب کی طرف اس پر بار کھان غالب آگئے ہیں جو رود سیستان کے شمالی کنارہ پر ہیں۔ کندارک اور آس غازی کے کھنڈرات اسی قدیم بہال گلستان میں واقع ہیں لیکن یہ موجودہ ہیں۔ ملبے کی مذکورہ بالا سفید ڈھیری پٹہ سفید کہلاتی ہے اور اس کوئی دو میل مغرب میں ایک پرانے قصبے کے آثار ہیں جس کے گرد باغات ہیں جن میں سے بعض کی دیواریں ہنوز قابل شناخت ہیں، گو ہوا کی عریاں کاری نے انہیں کافی کمزور اور بودی کر دیا ہے۔ ان کے جنوب میں ایک گنبدیں عمارت کے کھنڈرات ریت کے تودوں میں نیم مدفون ہیں جن کے قریب محرابوں کے ٹکڑے ہنوز نظر آتے ہیں، یہ مدرسہ تھا، جو ان عمارات کی تعمیر سے ظاہر ہوتا ہے۔ ۱۹۰۲ میں بہرام آباد کے جنوب مغرب کی کچھ ڈھیریوں میں ایک مزدور کو اینٹیں تلاش کرتے کرتے خوش قسمتی سے سونے کے کچھ سکے مل گئے جن پر کیانی سردار ملک عظیم خان کے مطابق قطب الدین کا نام کندہ تھا اور جن میں سے ہر ایک کا وزن ۲½ مثقال یا قریباً ۷ اگرین تھا۔ ریت میں دبے ہوئے کالج (مدرسہ) کے کھنڈرات نسبتاً موجودہ دور کے ہیں۔

قلعۂ سام کا بیان :-

ضلع شعب آب میں جائے پناہ بلاشک و شبہ قلعۂ راسکک تھی، جس پر سہ کوہا کا موجودہ قصبہ و قلعہ واقع ہے۔ سہ کوہا کے قریباً ڈھائی میل شمال مغرب میں ایک بہت پرانا قلعہ بند احاطہ ہے جو قریباً ۹۰۰ فٹ طویل اور ۵۰۰ فٹ عریض ہے۔ اس کی مشرقی طرف ایک دروازہ ہنوز قابل شناخت ہے لیکن دوسری طرف صرف دیوار وں میں ایک شگاف ہے جس کے ذریعے اندر جا سکتے ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ابتداءً ایک دروازہ تھا یا محض ہواؤں اور موسموں کا پیدا کردہ ایک شگاف۔ یہ قلعہ دشت کے ایک سرے پر بنا ہوا ہے لیکن جس قلعہ

دشت پر یہ ایستادہ ہے، وہ اب مشرقی ڈھلان سے ایک تنگ زرخیز پٹی کے ذریعے جدا ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کے شروع میں جب ہلمند کوہ خواجہ کے نیچے ہاموں میں بہتا تھا تو اس کا ایک نالہ اس قلعہ کے پاس سے گذرتا ہوا دیہہ وُرمل کی طرف چلا جاتا تھا۔ قدیم دیواروں کا رُخ شمالی ڈیلٹا کے دیگر کھنڈرات سے بالکل مختلف ہے۔ چاروں اطراف قطب نما کی چاروں سمتوں کے مقابل ہیں۔ دیواریں بہت موٹی ہوں گی جیسا کہ ان کی بڑی ڈھیریوں سے ظاہر ہے اور یہ سراسر چکنی مٹی کی بنی ہوئی تھیں۔ اس کا رُخ وہی ہے جو رودبیابان کے جنوب میں دشت کے کھنڈرات کا ہے۔ مشرقی اور مغربی دیواریں ان مقامات کے مقابل ہیں جہاں آفتاب گرما کا طلوع اور غروب ہوتا ہے۔ جنوبی دیوار کی حفاظت کے لئے دشت میں ایک خندق کھودی گئی اور جگہ اُس وقت بنائی ہوئی معلوم ہوتی ہے جب دیگر اطراف کے نیچے پانی تھا خواہ نیزار تھا یا دریا جو ان اطراف کو حملے سے بچاتا تھا۔ بظاہر یہ کھنڈرات رام شاہرستان کے کھنڈرات سے ذرا ہی بعد کے معلوم ہوتے ہیں اور یہ اغلب ہے کہ قلعہ سام کی جگہ ماقبل تاریخ دور کی ہو۔ صرف ایک دو جگہ عمارتوں کے آثار ہیں اور قلعہ محض ایک قلعہ بند احاطہ معلوم ہوتا ہے جہاں لوگ حفاظت کے لئے آجاتے ہیں اور اُس کی دیواروں کے اندر کوئی قصبہ نہ تھا۔

زرکن اور زورکن کا علاقہ سیرابی

ہلمند کے مشرق میں بھی ایسی پناہ گاہیں تھیں لیکن چونکہ اس علاقے کا جائزہ جلدی میں لیا گیا لہٰذا اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ زرکن اور زورکن نہریں یہاں بہت عرصے تک قائم رہیں اور غُلغُلہ اور سار و تار کے اضلاع خوب آباد تھے۔ قلعہ چہل برج اچھی حالت میں تھا اور قرب و جوار کی آبادی کو تحفظ فراہم کرتا تھا۔

نوکیں قلات :

قلعہ چہل برج کے کھنڈر سے چھ سات میل مشرق میں ایک الگ تھلگ قلعہ ہے جو کافی

حد تک صحیح سالم ہے اور اسی لئے نوکیں قلات یا نیا قلعہ کہلاتا ہے۔ یہ ایک چوکور ہے جو ۱۲۰ فٹ چوڑی اور ۳۰۰ فٹ لمبی ہے۔ زاویوں پر چار گول مینار کھڑے ہیں اور ایک ایک ہر پردے کے وسط میں سوائے مشرقی پردے کے جہاں مینار کی بجائے دروازہ ہے جس پر پکی اینٹوں کی محراب ہے۔ چار دیواری کے اندر جُزوی طور پر گری ہوئی عمارتیں ہیں۔ دیواروں کے کنگر یا چھجے نہیں ہیں اور وہ صرف ایک احاطہ بناتی ہیں۔ دروازے پر مینار نہیں ہیں لیکن ایک الگ تھلگ تعمیر شدہ جگہ جو ۶۰ فٹ مربع تھی اور دروازے سے کوئی ۵۰ فٹ آگے کو تھی، اس دروازے کی حفاظت گاہ تھی۔ ایک دیوار اس بیرونی تعمیر کو قلعہ کے پردے سے ملاتی ہے۔ الگ تھلگ مینار ۷۰ فٹ اُونچا ہے اور قلعہ کی دیواریں اس سے کوئی ۱۰ فٹ نیچی ہیں۔ مینار کو خوب آراستہ و پیراستہ کیا گیا تھا۔

سہریں قلات :-

نوکیں قلات سے کوئی دو میل دُور مشرق میں ایک کھنڈر سہریں قلات ہے یعنی ایسا قلعہ جس کے آثار سُرخی مائل ہیں۔ یہ کسی وقت ایک ۱۰۰ فٹ مربع قلعہ تھا جس کی دیواروں کی حفاظت آٹھ مینار کرتے تھے اور اندر کی طرف دو منزلہ کمرے تھے اور ان کی چھتیں دیواروں کی حفاظت کے لئے فوج کے استعمال میں آتی تھیں۔ دروازہ مشرقی رُخ پر ہے اور ایک بیرونی قلعہ بندی اس کی محافظ ہے۔

غلغلہ :-

غلغلہ ایک ضلع کا نام بھی ہے اور اس کے مجمع الاثار کا بھی۔ مؤخر اللہ کر ایک اُونچے مینار پر مشتمل ہے جس کے جنوب میں اور آس پاس ایک گنبد میں عمارت ہے جو پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی ہے لیکن جس کی چھت اب گر چکی ہے۔ باغات کے بہت سے نشانات ہیں اور سڑکیں آبی گذر گاہوں کو خمدار پُلوں سے عبور کرتی تھیں۔ پُلوں کی نالیاں اب بھی محفوظ ہیں۔ بڑا کھنڈر شہر کلاں کہلاتا ہے اور دو اُونچی غیر مساوی ڈھیریاں اس کی مظہر ہیں۔ اس کے اردگرد باغات اور آبی گذر گاہوں کے

نشانات ہیں۔ ایک ڈھیری تو ایک قلعہ تھا جس کی کرسی موجودہ تباہ شدہ حالت میں بھی کوئی ۲۰ فٹ موٹی ہے اور اندر کی طرف بلاشک وشبہ رہائش گاہیں تھیں۔ تباہ شدہ دیواروں کی چوٹی بیرونی سطح زمین سے ۵۰ یا ۶۰ فٹ اونچی ہے۔ تعمیر سکھائی ہوئی اینٹوں اور مٹی کی تھی اور احاطہ کے اندر سے جو پختہ اینٹیں ملیں اُن میں سے ایک ۳۰" × ۲۴" × ۴" تھی۔ یہ قلعہ ضلع کی زرخیز زمین پر ایستادہ ہے اور اُس کے آس پاس کی زمین کسی وقت بیحد سیراب وشاداب معلوم ہوتی ہے۔ بہت سی جگہوں پر کھیتوں اور آبی نالیوں کے درمیان تقسیم اب بھی واضح ہے۔ اس کے دو میل شمال اور مغرب میں ایک مسجد کے آثار ہیں جو پختہ اینٹوں سے بنی تھی۔ اس مسجد کے شمال میں اور شہر کلاں اور قلعہ گردو کے درمیان ایک اور ویران جگہ ہے جہاں برف خانہ تھا جس کا گنبد گر چکا ہے، اور گڑھے میں ریت بھر گئی ہے۔

گردو :-

گردو بہت مشہور قدیم جگہ ہے۔ یہ غلغلہ کے قریب ویران علاقوں کے مغربی سرے پر واقع ہے۔ یہ ایک قلعہ ہے جو زمین سے ۱۵ فٹ اونچی کرسی پر بنا ہے اور یہ ایک مربع ہے جس کا ہر ضلع ۲۰۰ فٹ ہے۔ یہ کچی اینٹوں سے بنا ہے۔ دیواریں زمین سے ۴۰ فٹ اونچی ہیں اور بنیاد پر کئی فٹ موٹی ہیں۔ دروازہ جنوبی پر دے میں تھا۔ یہ موجودہ ڈیلٹا اور رسار وتار اور نواحیات کے درمیان حائل رقبہ کی ڈھلانوں پر واقع ہونے کی وجہ سے ایک اہم اور نمایاں مقام ہے۔

جنوبی ڈیلٹا کے سات قلعے دور تیموری میں :-

شمالی ڈیلٹا کی خوشحالی کے علاوہ جنوبی ڈیلٹا بھی رود بیابان کے سرے پر خوب آباد اور سیراب تھا۔ یہ تیمور کی شہادت پر مبنی ہے جو ملک کے اتحادی کی حیثیت سے سیستان میں داخل ہوا۔ ملک کو وہ جلال الدین محمود پکارتا ہے۔ ۷۶۴ھ میں سیستان میں ایک بغاوت ہوئی اور باغیوں نے کئی قلعوں پر قبضہ کرکے ملک کو کسی حد تک دبا لیا۔ ملک نے تیمور سے مدد مانگی جس کے تحت بے حد جنگجو قسمت آزماؤں کا ایک گروہ تھا جو ترکستان میں لڑتا بھڑتا رہا تھا۔ اس مہم اور اس کے

ناخوشگوار انجام کا ذکر تفصیل سے حصۂ تاریخ میں کیا جا چکا ہے۔ تیمور بتاتا ہے کہ باغیوں کے قبضہ میں سات قلعے تھے۔ یہ ساتوں قلعے بلاشک وشبہ دادئی ہلمند اور جنوبی ڈیلٹا میں واقع تھے۔ یہ علاقہ ہمیشہ نیم آزاد رؤسا کے ماتحت رہا تھا اور انہوں نے ہی آخری ملک کے خلاف بغاوت کی جو تیمور سے مدد لینے پر مجبور ہوا اور تیمور ۱۲ سال بعد اس کے خاندان کی آزادی اور اُس کی سلطنت کو ہی ہڑپ کر گیا۔

نزاکن بلاشبہ سات میں سے ایک تھا، رامرود کا پرانا قلعہ بھی جس کے بعض حصے موجودہ عمارت میں ضم ہو گئے ہیں، تباہ شدہ قلعہ جیسے بلرجی اب گردی قلات کہتے ہیں اور شیلا پر قلعہ مقصود جو گاڈزرہ سے کوئی ۲۰ میل مغرب میں ہے۔ غالباً یہ قلعے وہ تھے جن کے باشندوں اور فوجیوں نے دشمنوں کو ملک بدر کرنے میں ملک کا ساتھ دیا۔ تین قلعے جن پر تیمور اور امیر حسین نے قبضہ کیا، کوئی خاص بڑے یا مضبوط قلعے نہ تھے کیونکہ ان پر صرف ... ۱ گھوڑسواروں کے ساتھ ہی قبضہ جما لیا گیا۔ ان قلعوں میں امیر حسین نے فوج تعینات کی اور ان کو تباہ نہیں کیا گیا گو ۱۲ سال بعد تسخیر سیستان کے موقعہ پر انہیں منہدم کرا دیا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ اتحادیوں نے جن تین قلعوں پر قبضہ کیا ان میں سے دو چہل مرز اور قلعہ خاران ہوں چہل مرز تو چہار برجک سے کوئی تین میل اُوپر ایک کھنڈر ہے اور مؤخر الذکر بندر کمال خان سے کوئی چار یا پانچ میل مغرب میں ایک اور کھنڈر ہے۔ مؤخر الذکر رود بیابان کے پرانے پاٹ سے کچھ ۳۰ فٹ اوپر پست ڈھلان پر ایستادہ ہے۔ قلعۂ مقصود، رامرود اور گردی قلات بلاشک وشبہ تین قدیم مقامات ہیں جن کا جنوبی ڈیلٹا کی آبادی سے وہی تعلق تھا جو کوہِ ملک اور زندان ڈھیریوں کے قلعوں کو اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے حاصل تھا۔ رامرود کے معدودے چند پرانے حصے طرز تعمیر میں زاہدان کے کھنڈرات جیسے ہیں۔ گردی قلات کے کھنڈرات بھی ایک چھوٹے پیمانہ پر دار الحکومت کے آثار سے مشابہ ہیں اور قریباً اسی طرح انحطاط پذیر ہیں۔ اس جگہ کو دورِ حاضر میں دوبارہ تعمیر نہیں کیا گیا کیونکہ رامرود ساڑھے تین میل دُور ہے اور غالباً اسے ہی بحال کرنا کافی سمجھا گیا تاکہ ضلع کی گھٹی ہوئی آبادی اُس میں پناہ لے سکے۔!

بابِ سیزدہم

تراکن اور اس کے آس پاس کے کھنڈرات

تراکن :-

اب صرف قلعۂ تراکن پر غور باقی ہے۔ یہ بلاشک و شبہ ایک بہت قدیم جگہ ہے، اسے عموماً رستم کا مولد سمجھا جاتا ہے۔ شاہنامہ کے مطابق اسے اُس کی ماں کے رحم سے کاٹ کر علیحدہ کر دیا گیا تھا اور جس جگہ یہ ظہور پذیر ہوا اسے اسی واقعہ سے موسوم کر دیا گیا۔ ملک بھر میں یہ جزو ایمان ہے کہ تراکُن (یا صحیح طور پر تراکَن) ہی وہ جگہ ہے۔

یہ جگہ بہت بعد میں ویران ہوئی ورنہ یہ ہمیشہ آباد رہی اور قلعہ کی حیثیت سے اہم رہی کیونکہ اس کا قدرتی محل وقوع ساز گار تھا بالخصوص ان ادوار ماضیہ میں جب ابھی فن جنگ نے زیادہ ترقی نہ کی تھی۔ قصبہ کِم کے ایک الگ تھلگ قطعہ پر واقع ہے جس کی سمت شمالاً جنوباً ہے اور جو رودِ بیابان کی وادی کی شمالی ڈھلان سے بہت آگے ہے جن سے آگے اس کا پہلا چکر ہے اور پھر مغرب کی طرف یہ چکر جاری رہتے ہیں۔ ایک آدھ میل چوڑا میدان کِم کے اس قطعہ کو دشت کی شمالی ڈھلان سے جدا کرتا ہے اور مغرب کی طرف کوئی ۴۰۰ گز زرخیز ٹکڑا تراکن کو دشت کے ایک پست ڈھیر سے جدا کرتا ہے جو دوسرا اور بڑا جزیرہ ہے۔ تراکن کی مغربی حد اس جزیرہ سے کوئی ایک میل مغرب میں ہے۔ جزیرے کا مشرقی پہلو نچلے میدان کی طرف ڈھلان ہے لیکن مقابل ڈھلانیں گھستے گھستے گھاٹیاں بن گئی ہیں جو مغربی میدان کی طرف ڈھلاؤ ہیں۔ تراکن کے جزیرہ اور شمالی ڈھلان

کے درمیان پرانے رود بیابان کی ایک شاخ بہتی تھی جس کے آثار موجود ہیں۔ یہ شاخ دشت کے دوسرے الگ تھلگ قلعہ کا شمال مشرقی سرا تھا اور اس کے مغرب سے گذر کر بڑھی وادی سے مل جاتی تھی۔ یہ سنگھم اس مقام کے مشرق میں تھا جہاں دشت کی دو آگے کو بڑھی ہوئی راسیں زرخیز میدان کو دبوچ لیتی ہیں اور یوں تراکن ضلع کو گنا سے علیحدہ کر دیتی ہیں۔ گنا اوّل الذکر کے مغرب کی طرف ہے۔

کھنڈرات :-

کم کے جس قطعہ پر تراکن بنا ہوا ہے وہ موٹے حساب سے ۱۰۰۰ فٹ لمبا اور ۵۰۰ فٹ چوڑا ہے اور یہ مشرق کی طرف ڈھلاؤ ہے۔ دوطرفہ میدان سے اس کی بلندی ۱۵۰ فٹ ہے اور اطراف میں یہ سیدھی ڈھلان ہے۔ کم کی افقی تہیں اِدھر اُدھر تنگ چھجے بناتی ہیں جن میں سے آخری ۸۰ یا ۱۰۰ فٹ بلند ہے۔ قطعۂ کم کا مشرقی حصّہ ایک چٹان میں ختم ہوتا ہے، جو زمین سے کوئی ۲۵ فٹ بلند ہے اور صرف اسی طرف تراکن کو قلعہ بند کیا گیا تھا۔ دیواریں بہت اُونچی ہیں اور ایک دو جگہیں تو چٹان کے دامن سے اٹھائی گئی ہیں۔ ان کے آثار چٹان کے بیرونی خطوط کے ساتھ ساتھ ہیں لیکن شمالی اور جنوبی پہلوؤں پر چٹان اُونچی ہو جاتی ہے تو دیواریں کم اُونچی ہیں حتیٰ کہ یہ اپنی دفاعی اہمیت بالکل کھو دیتی ہیں اور صرف عمارتوں کے درمیان ایک پست فصیل بن کر رہ جاتی ہیں جو حادثات کی روک تھام کے لئے مفید ہیں۔ دروازہ تباہ ہو چکا ہے لیکن یہ غالباً دیواروں کے شمالی سرے کے قریب تھا اور ایک ۱۰۰ فٹ مربع صحن میں لے جاتا تھا جس کی اطراف پر بھڑوں کے چھتے کی طرح گنبدیں عمارتیں یکے بالائے دیگرے ایستادہ تھیں۔ تراکن سورج کی زد میں تھا اور سرف کوہ خواجہ کی چٹانی ڈھلانوں پر واقع شہر کاخ حدت میں اس سے زیادہ تھا کیونکہ صرف ڈھلوان عمارتیں ہی ہوائے سیستان سے مستفیض ہو سکتی تھیں۔

اندرونی عمارات :-

مکانات گنبدیں تھے۔ اچھے مکانوں پر ویسی ہی تعمیری آرائش ہے جیسی زاہدان کے دو مغربی میناروں کی چوٹی پر دو ہشت پہلو کمروں کی۔ لیکن چونکہ تراکن صرف دو سو سال پہلے ویران ہوا ہے لہٰذا یہ عمارات زاہدان سے بہتر ہیں اور بہت سی شمالی عمارات تو موجودہ فن تعمیر کا نمونہ معلوم ہوتی ہیں۔ اونچی شمالی دیواروں کے نچلے ردّے پختہ اینٹوں کے تھے۔ جن میں سے ہر ایک کوئی ۱۸ انچ مربع تھی۔ بالائی حصے اور اندرونی کمرے سکھائی ہوئی اینٹوں کے بنائے گئے تھے۔ قصبے کے مکانات بھی زیادہ تر اسی مواد سے بنے ہیں اور پختہ اینٹیں بہت کم اور صرف آرائشی مقصد کے لئے استعمال ہوئی ہیں۔ البتہ قصبے کے کنوئیں کا زمین دوز راستہ خالصتاً انہی سے بنا تھا۔ اس راستہ کا دہانہ ۱۰ فٹ مربع ہے اور یہ بہت گہرا ہوگا، لیکن اب یہ دہانہ سے کوئی ۵۰ فٹ اندر تک بھر گیا ہے۔ ڈھلان کے تقریباً وسط میں ایک زمین دوز برآمدہ ہے جو زمین کے اندر تک جاتا ہے اور کوئی سو فٹ لمبائی کے بعد ایک پندرہ فٹ مربع کمرے میں ختم ہوتا ہے۔ یہ برآمدہ گنبدیں تھا اور اس میں بھی حاشیہ پکی اینٹوں کا تھا جو اب صرف دروازہ کے پاس موجود ہے۔ راستہ بھی اصلی نہیں ہے کیونکہ یہ راکھ سے اٹا ہوا ہے اور مطبخ کے کوڑے کا ڈھیر ہے۔ بظاہر برآمدہ عمارات کی آبادی سے قدیم تر معلوم ہوتا ہے جو اس کوڑے کی ذمہ دار تھی۔ ممکن ہے کہ فتح سیستان کے بعد تیمور نے تمام قلعوں کو گرانے کا حکم دیا ہو اور تراکن بھی اسی عام تباہی کی زد میں آیا ہو، لیکن اسے بعد میں دوبارہ آباد کیا گیا اور مکانات بحال کر دیئے گئے۔ دروازہ اور شمالی دیواروں کے وسطی مینار کی تباہی سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کیونکہ اس سے قلعہ کی اہمیت ختم ہوگئی اور یہی اس تباہی کا مقصد تھا۔

دفاعی انتظامات :-

تراکن کی دیواروں کی حفاظت کے لئے مینار نہیں ہیں اور ان میں محض در بچے ہیں اور

روزن ہیں۔ روزن چوٹیوں کے ساتھ ساتھ ہیں اور مدافعین کے کھڑے ہونے کے لئے چھجے بنے ہوئے ہیں۔ ترچھی آتشباری کے لئے روزن تین تین کے جوڑے ہیں۔ مرکزی روزن سیدھ میں ہے اور اس کے دائیں اور بائیں روزن اسی سمت پر ترچھے پڑتے ہیں فصیلیں کافی مضبوط ہیں اور ایک تنگ محرابی برامدہ مختلف کمروں سے رابطہ کا کام دیتا ہے اور شمالی اور جنوبی دیواروں سے ملحقہ شہر کے حصوں میں پہنچنے میں کام آتا ہے۔ تراکن دُور سے نظر آتا ہے اور یہ قرونِ وسطیٰ کا کوئی جاگیردارانہ قلعہ معلوم ہوتا ہے۔ اب یہ پانی کی نایابی کی وجہ سے ویران ہے اور عام منظر وحشت انگیز ہے کیونکہ آس پاس کی چٹانیں قبرستان اور مقابر بن چکی ہیں۔ جہاں تک نظر مغرب کی طرف جاتی ہیں مقبروں کی گنبدیں عمارتیں ہیں جو پلنگ کوہ سلسلہ کی دُور اُفتادہ چوٹیوں کے پیلے نیلے رنگوں کے پس منظر میں کھڑی ہیں۔ روایت کے مطابق ماقبل اسلام دور میں یہاں ایک آتشکدہ تھا جو عربوں کے دور میں بتدریج ٹھنڈا ہو گیا۔

آتشکدہ :-

بُوڑھے ارباب سیف الدین نے مجھے آتشکدہ کا حال بتایا اور یہ بھی کہ اس میں مُوبد کس طرح مقدّس آگ کو زندہ رکھتے تھے۔ یہ حال قزوینی کی تحریر کے عین مُطابق تھا جس نے ۱۲۷۵ء میں لکھا تھا۔

سیف الدین کا علم کتابی نہ تھا کیونکہ اُس کی علمی استعداد درمیانے سے درجے کی ہے اور اس کے علاقے میں کتب دستیاب ہی نہیں، اُس کی معلومات سراسر زبانی و صدری روایات پر مبنی تھی۔ اُس نے بتایا کہ تمرس کی قسم تاگز جو صرف بے آب علاقوں میں پھلتی پھولتی ہے' آگ جلانے کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ تاگز کا ایندھن خوب جلتا ہے، اس کا شعلہ شوخ اور واضح ہوتا ہے اور کم سے کم دُھواں دیتا ہے اور جل کر صاف راکھ بن جاتا ہے جسے نہایت آسانی سے ہٹایا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس، تمرس کی لکڑی سُلگتی ہے اور بہت دُھواں پیدا کرتی ہے۔

سیف الدین کے مطابق مؤبد اپنی باری پر قربانگاہ سے معقول فاصلے پر جھکے ہوئے ہوتے تھے۔ ان کے منہ اور نتھنے لپیٹے ہوئے ہوتے تھے اور وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے طویل سیمیں چمٹوں کے ساتھ تاگز کے ٹکڑے قربانگاہ پر پھینکتے رہتے تھے تاکہ آگ مسلسل اور یکسار جلتی رہے۔ ترا کن کا آتشکدہ کارکوشاہ کے آتشکدہ سے دوسرے نمبر پہ تھا، اور عربوں کی فتح سے پہلے یہی دو بڑے معابد تھے۔ عربوں نے انہیں ٹھنڈا کر دیا اور مقدس آگ بجھا دی گئی۔ دیگر چھوٹے چھوٹے آگ مندر شاید رہنے دیئے گئے لیکن ان دونو آتشکدوں کی تباہی اسلام کے تفوق کے اظہار کے لئے غالباً ضروری سمجھی گئی۔

بابِ چہار دہم

قلعۂ فتح کا بیان

قلعۂ فتح اور قلعہ بند محل کا محلِ وقوع

قلعۂ فتح[1] کا بیان موجبِ دلچسپی ہوگا۔ اِس کا کوٹ منظر پر چھایا ہوا ہے اور چونکہ یہ سقوطِ زاہدان کے بعد بنا لہٰذا قرونِ وسطیٰ میں سیستانی طرزِ تعمیر کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ کوٹ ملک قطب الدین کا کارنامہ ہے جس نے اسے محفوظ بنانے کے لئے میدان سے ۳۰ فٹ اوپر ایک الگ تھلگ، قطعۂ کم پر استادہ کیا۔ ایک گہری قدرتی یا مصنوعی گھاٹی اسے مشرقی دشت میکی سے علیحدہ کرتی ہے۔ یہ گھاٹی قدیم دریائی پاٹ کا تسلسل ہے اور بعد کی نہر اسی میں سے بہتی ہوئی قصبے کے پاس سے گذر کر شمال کو جاتی تھی۔ کوٹ مٹی یا ٹھ کھائی ہوئی اینٹوں کا ایک اونچا انبار ہے جس میں برج بہت کم ہیں اور وہ قطعۂ کم کی چوٹی کے محدود رقبہ کی وجہ سے کوئی دفاعی افادیت نہیں رکھتے۔ کوٹ کا اندرونی حصّہ دو محلّات میں بٹا ہوا ہے جو مشرقی اور مغربی محلّات کہلاتے ہیں۔ ایک میں حکمران رہتا تھا اور دُوسرے میں اُس کے عزیز و اقارب، خدّام اور دیگر متعلقین۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ معمول کے مطابق کمرے اور غلام گردشیں ہیں۔ صحن کے اندر ایک بڑا کنواں ہے جو سنگ و خشت کا بنا ہوا ہے اور اگلے وقتوں میں اونٹ سے چلنے والے رہٹ سے پانی نکالا جاتا تھا۔ چند

---

[1] ۔ سترھویں صدی کے مُغل شاہنشاہ شاہجہان کے عہد کے ایک ہندوستانی واقعات نامہ، بادشاہ نامہ کے مطابق قلعہ فتح کو سیستان کا دارالحکومت بتایا گیا ہے۔ حکمرانِ وقت ملک حمزہ بھی اِس میں مذکور ہے

سال پہلے اِسے صاف کیا گیا تو پانی طویل عدم اِستعمال کی وجہ سے کھاری پایا گیا۔ سار و تار کے اندرونی محل کی طرح اس میں بھی ایک بہت اونچا مینار تھا جہاں سے گرد و پیش کا پورا منظر نظر آتا تھا۔ زمانۂ جنگ میں یہ دیدبان کا کام بھی دیتا تھا اور شاہی عَلم گاہ کا بھی۔

کوٹ کی قلعہ بندی

کوٹ کی کرُسی کے گرد اور اُس کے آس پاس دوسرا خط دفاعی ہے جو مسقّف راستہ ہے اور دشمن کو کوٹ کی ڈھیری تک پہنچنے سے روکتا ہے جہاں اونچی دیواروں اور میناروں کی ناکافی پشت پناہی کی وجہ سے کافی زمین بے مَصرف ہے۔

اِس مسقّف راستے سے کافی آگے شہر کی دیوار تھی جو ایک بے ڈھب مربّع تھی۔ اس کی مشرقی طرف دیگر تینوں اطراف سے چھوٹی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اِن تینوں کی حفاظت کے لیے چھبّیس چھبّیس برُج تھے جبکہ مشرقی طرف کے لئے صرف سولہ تھے۔ شہر ۱۰۴۹ھ (۱۶۳۹ء) تک خوب عروُج پر تھا لیکن اب انحطاط پذیر ہے۔

پرانی عمارات کے آثار

جہاں دریا عظمتِ رفتہ کے نشانات کو بہا کر نہیں لے گیا یا ریت نے اُنہیں دبایا نہیں وہاں حوضوں اور حماموں کے آثار اَب بھی موجود ہیں۔ شہر میں ایک حمام ابھی تک دوسرے خطِ دفاعی اور روئے قلعہ کے درمیان ٹھسا ہُوا ہے۔ ایک اور کوٹ کے اندر موجود ہے۔ لیکن باعثِ فخر اور غیر مفتوحہ قلعۂ فتح کی آن بان مدتوں پہلے رخصت ہو چکی۔ یہ نام غالباً اِسے ملک قطب الدین نے دیا جو تھوڑے عرصے کے لیے اپنے حاکمِ اعلیٰ اور محسن شاہرخ کا اِسی قلعہ سے کامیابی سے مزاحم ہُوا۔

قلعہ فتح کی دیواریں اور مینار

قلعہ فتح کا شہر ایک بیرونی دیوار سے گھرا ہُوا تھا جس میں ۹۴ حفاظتی مینار تھے۔ اور اگر ایک مینار کا دوسرے مینار سے اوسط فاصلہ ۲۰۰ فٹ لیا جائے تو بھی دیوار کا احاطہ پورا تین میل

بنتا ہے۔ اس دیوار سے پرے نواحیات اور باغات تھے جو نہروں سے سیراب ہوتے تھے۔ یہ نہریں غالباً مقامی تھیں جن کے منابع قلعہ فتح کے نیچے پانی دینے والی نہر کے منبع سے نیچے اور مختلف تھے۔ قلعہ کی بیرونی دیوار اور مورچہ بندیاں بلاشک و شبہ ملک معزالدین حسین (۹۵۸ھ میں مارا گیا) کی مرہونِ منت تھیں۔ لیکن باغات علاقے کی تدریجی خوشحالی کے ساتھ ساتھ نمو پذیر ہوئے ہوں گے۔ اس کہانی میں شک کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ باغات اور گاؤں مغرب کی کنکریلی سطح مرتفع تک پھیلے ہوئے تھے۔

گنبدِ سرخ یا سرکاری کالج

قلعہ فتح کی دیوار سے پرے اور کوٹ کے جنوب مغرب میں ایک کالج کے آثار ہیں جو ملک حمزہ کا وقف کردہ تھا۔ اب اس کی مرکزی عمارت کا گنبد گر چکا ہے اور چونکہ یہ سراسر پختہ اینٹوں کا بنا ہوا ہے۔ لہٰذا گنبدِ سرخ کہلاتا ہے۔ مرکزی عمارت کے دونوں طرف دو بازو تھے جن میں کمرے اور ستونوں کے برآمدے تھے جن میں اساتذہ اور اُن کے تلامذہ رہتے تھے بالخصوص جو دُور کے رہنے والے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ ۸۰ اساتذہ کا عملہ تھا جو طلبہ کے والدین سے فیسوں کے علاوہ ۱۰۰ خروار غلہ اور ۲۰۰ تومان نقد لیتے تھے۔ غلّہ کا پیمانہ تبریزی خروار[1] تھا۔ کالج کی تعمیر ملّا شاہی سے منسوب ہے جو ملک حمزہ کے دور میں قلعہ فتح کا مجتہد تھا۔ اس کی تکمیل پر ملک نے اسے وقف کر دیا۔ ملّا مذکور کے ورثاء اب عسرت کی حالت میں ایرانی علاقے کے دیہات بنجر اور لنگوزی میں آباد ہیں۔ کالج اور اس کا عملہ مدتوں پہلے داستانِ پارینہ بن گئے۔ کالج کے اس مہتمم کے ابنا و اخلاف کوئی تیس سال پہلے ایرانی علاقے میں منتقل کر دیئے گئے۔ یہ عمارات ایک چھوٹی سی سطح مرتفع کی پیشانی پر سر برآوردہ ہیں اور دور سے نظر آتی ہیں۔ پختہ اینٹوں کا سرخی مائل رنگ جاذب و جالبِ توجہ ہے اس لئے کہ یہ سیستانی آثار میں

---

[1] قریباً ایک لاکھ انگریزی پاؤنڈ۔

خلافِ معمول چیز ہے۔

گمبذِ یک دست

اِس کھنڈر کے مزید جنوب میں ایک اور گنبدیں عمارت ہے۔ اِس کا ماخذ اور نام پردۂ گمنامی میں ہے لیکن روایت ہے کہ گمبذِ سُرخ کے معمار نے جب اسے مکمل کر لیا تو اُس کا دستِ راست کاٹ دیا گیا تاکہ وہ اِس عمارت کی مثیل نہ بنا سکے اور یہ بے نظیر رہے۔ لیکن گمبذِ یک دست یعنی ایک ہاتھ والے معمار کا گنبد گمبذِ سُرخ سے قدیم تر ہے جو اس کے ماخذِ نامعلوم سے ظاہر ہے۔ یہ غیر اغلب نہیں ہے کہ اس کے اندر کسی حکمران یا شاہی خاندان کے کئی افراد کے مقبرے ہوں۔ ہو سکتا ہے یہی ملک قطب الدین کا مدفن ہو۔ کالج کی طرح یہ بھی ایک دشتِ پست کی پیشانی پر واقع ہے بلکہ شمالی چٹان کے سرے پر۔

گمبذِ سُرخ اور چہار دری

کالج کی وسطی عمارت کی محرابوں کی تعمیر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اینٹیں ایک مرکز سے نکلنے یا حسبِ معمول ایک حاشیہ بنانے کی بجائے اس کی محرابیں اینٹوں کے اُفقی ردّوں سے بنی ہیں جو ایک دُوسرے کو ڈھانپ لیتے ہیں جبکہ جسیم دیواریں اِس اچھوتے طریقے کو ٹھوس بنا دیتی ہیں۔ ایسی محراب سازی کی ایک اور مثال بھی ملی ہے جو کارکوشاہ سے چھ سات میل جنوب مغرب میں چہار دری کے کھنڈرات میں ہے۔ یہ بھی پختہ اینٹوں سے بنی ہے ۔ یہ طرزِ تعمیر غالباً غیر محفوظ سمجھا جاتا تھا جب کوئی کم پائدار ذریعہ اختیار کیا جائے۔ چہار دری ایک مقبرہ تھا جس کی چاروں اطراف قطب نما کی چاروں سمتوں کے رُخ پر تھیں۔ یہ کھلے محرابی راستے تھے اور چاروں دیواروں کے زاویئے تنگ ستونوں کا کام کرتے تھے۔ اِس عمارت میں بھی قبر پر پختہ اینٹوں کا گنبد تھا۔ روایت بتاتی ہے کہ کالج کی وسطی عمارت میں ملک حمزہ خان کو دفن کیا گیا اور اسلامی مذہبی اور تعلیمی اوقاف کی مانند اِسے بطورِ مسجد بھی استعمال کیا جاتا تھا۔

پندرھویں صدی عیسوی کی تعمیراتی تفصیلات

قلعہ فتح نویں صدی ہجری کا ہے اور کوٹ سوختہ بھٹی ہوئی اینٹوں اور مٹی سے بننے والی سیستانی تعمیرات کا ایک نمونہ ہے۔ اونچی دیواروں میں کہیں کہیں کھڑکیاں یا بڑے بڑے موکھے ہیں۔ دیواروں کی بیرونی طرف سادہ ہے۔ سوائے اس کے کہ کہیں کہیں ایک محدود پیمانے پر سجاوٹ کے لیے مختصر متوازی اور ترچھی لکیریں کھینچی گئی ہیں جو ناظر کے لیے بارِ خاطر نہیں ہوتیں۔ زاہدان کی بیرونی دیواریں بالکل سادہ ہیں اور مٹی اور اینٹ کے کام کے پلستر کی سطح پر معمولی سا حاشیہ بھی نہیں۔ دورِ زاہدان کی عمارات میں بیرونی آرائش کا کوئی نام و نشان تک نہیں ملتا۔ لیکن کام کی عمدگی مسلمہ ہے اور اسی لئے پرانے قلعۂ رامرود میں دورِ حاضرہ کی جھلکیاں ملتی ہیں اور وہ بعد کے کام سے بہت بڑھیا ہے۔ کوٹ کے گرد کی محرابیں مربع اینٹوں سے بنی ہیں جو کنارے کنارے لگائی گئی ہیں۔ سار و تار، کوہِ خواجہ اور رودِ بیابان کی محرابوں میں محراب سازی کے لیے چکنی مٹی کی جو پتلی پرتیں استعمال ہوئی ہیں وہ ابتدائی دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ زاہدان کے دروازۂ بختیاری میں بھی انہی پرتوں کا حسنِ ترتیب ہے۔ اس میں سنگ و خشت کا حاشیہ بھی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ سیستان کی پرانی عمارتوں میں اندرونی اور بیرونی تزئین بہت کم ہے۔ لیکن بعد کی عمارتوں میں زیب و زینت کا مذاق بدرجۂ اتم موجود ہے جیسے ملک جلال الدین یا ملک حمزہ کی تعمیرات میں۔ خطوط عمودی بھی ہیں اور افقی بھی۔ لیکن مزید بعد کی عمارتیں ان جزئیات سے عاری ہیں لہٰذا ان کا مجموعی تاثر بھدا اور ناخوشگوار ہے اور اس میں احتیاط اور مہارت کا بھی فقدان ہے۔

ملک حمزہ کا رقبۂ کاشت

قلعۂ فتح سے دو میل شمال میں ایک جگہ ہے جہاں سے بندِ بُوالبقا سے نکلنے والی نہر کا پانی تقسیم ہوتا تھا۔ اسے اب بھی آب بخش یا تقسیم گاہِ آب کہتے ہیں۔ یہاں سے ایک بڑی نہر پرانی نہرِ زرکن کی گذرگاہ میں بہتی تھی۔ یہ زیارت عمران پر یا اس کے قریب ختم ہو جاتی تھی۔

اِس کی وجہ سے نہر کے ساتھ ساتھ کا علاقہ شاداب ہوگیا۔ اِس کی تقسیم گاہیں قلعہ گاوک کے کھنڈرات کے پاس اب بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ زیرِ کاشت رقبہ زیادہ تر دارالحکومت کے قریب تھا اور غلغلہ یا سارو تار کی زمینوں کو سیراب کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ یہ اضلاع اُس وقت بھی ایسے ہی رہے جیسے اب ہیں یعنی منتشر ریت کے بارکھانوں کی زد میں جو بادِ صد وبیست روز کے زناٹوں کی وجہ سے سال لبسال آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ملک محمود اور اِس کے جانشینوں کی مساعی سے فیض یاب ہونے والا رقبہ غالباً ملک قطب الدین اور اُس کے ورثائے کے تحت آباد ہونے والے رقبہ سے کم تھا۔ آثارِ غلغلہ کے قریب ملنے والی یادگاری تختی سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ علاقہ آباد تھا۔ امیر خلیل ہندوکہ کی لائی ہوئی تباہی سیستانی خوشحالی کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی اور اِس کا اور تیمور کی تباہ کاری کا فاصلہ صرف ۴۰ سال کا تھا جس کے دوران بحالی ملک کی کوشش تو کی گئی لیکن یہ مستحکم نہ ہوسکی تھی لیکن جب بالآخر ایک فردِ خاندان ملوک کو آبائی سلطنت بحال کی گئی تو اُسے حکماً قرب وجوار کے اضلاع سے آبادکاروں کو بلانا پڑا تاکہ وہ ایک ہزار خاندان بن سکیں اور آبادی کا مرکزہ قرار پائیں اور بحالیٔ خوشحالی کے لئے مطلوبہ افرادی قوت مہیا کرسکیں۔

ملک حمزہ خان کا نظام انہار

قلعہ فتح کی شمالی تقسیم گاہ سے نہروں کا ایک جھنڈ شمال مشرقی اضلاع کو سیراب کرتا تھا جو اَب کھنڈرات سے اَٹے پڑے ہیں۔ یہ قابلِ ذکر ہیں۔ شمالی ڈیلٹا اور اضلاع غلغلہ و سارو تار کی درمیانی رکاوٹ پہلے ہی بیان کی جاچکی ہے۔ لیکن اِس کے مشرق میں ایک اور رکاوٹ حائل ہے اور دشت کی ایک دو اُبھری ہوئی پرتوں کے سوا ان کی درمیانی جگہ کوئی پانچ میل چوڑی زرخیز پٹی ہے جو شمال کی طرف کافی لمبی ہے اور جہاں اب ریت کے ٹیلے ہیں۔ اِس مشرقی دشت کا جنوبی سرا ایک الگ تھلگ قطعہ ہے جو ۵۰ فٹ اُونچا ہے اور جس کی شمالی پیشانی کا کھنڈر اِسے اور بھی نمایاں کردیتا ہے۔ بلوچ اور دیگر باشندے اِس کے اندر

شیخ حسین کی زیارت کو مستورات مقدس سمجھتی ہیں۔ اِس قطعہ کے شمال میں ایک زرخیز پٹی اسے دشت کی سطح مرتفع سے علیٰحدہ کرتی ہے جو ذرا شمال میں تیس چالیس فٹ اونچی ہے اور مغرب کی طرف ڈھلاؤ ہے لیکن مشرق اور جنوب مشرق میں آہستہ آہستہ ایک وسیع اور لہراتے ہوئے میدان میں بدل جاتی ہے جس میں بجری بہت ہے۔ سرگاہ سیستان سے مشرق کو مڑنے والی نہر زیارت کے شمالی خلا سے گذرتی تھی۔ ملک حمزہ کے دور کی اس نہر کے کنارے زیارت شیخ حسین سے چار میل مشرق میں پیمائی کھنڈرات تک پہچانے جاسکتے ہیں۔ پرانی نہر تکالا اور سار و تار کی دور افتادہ زمینوں کو سیراب کرتی تھی۔ زیارت کے شمال کی بجری آلود سطح مرتفع کا رُخ شمال مشرق کو ہے اور اِس پر وہ اہم ڈھیری ایستادہ ہے جسے بلوچی وک دلیل کہتے ہیں۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہی وہ نشانِ راہ ہے جہاں سے نوادرات جُودگال گردی (یعنی سُراغی) سار و تار کی طرف مڑتے ہیں۔ سطح مرتفع شمال کی طرف بلند ہو جاتی ہے کیونکہ وہاں بہت اُونچے ریگزاروں کا سلسلہ ہے جو کئی میل تک سار و تار کے کھنڈرات کو چھپا دیتا ہے۔ وک دلیل کے شمالی قطعات دشت کی نوعیت کے متعلق حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن چونکہ سار و تار کو سیراب کرنے والی نہر وک دلیل سے پانچ میل مشرق میں اِس ضلع میں داخل ہوتی تھی لہٰذا صرف یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ موجودہ ریگ آلود سطوح مُرتفع ایک دُوسرے سے زرخیز پٹیوں سے جُدا ہوتی ہیں، جیسے دشت کی ڈھلانوں کے ذریعے رودِ بیابان کے دہانے ہاموں کی طرف مڑتے ہیں۔ قدیم نظام ہائے انہار اِن قدرتی راستوں سے مستفیض ہوتے تھے اور جہاں انہیں چکر کاٹنا پڑتا تھا تو وہ دشتوں سے گذرتے تھے جیسا کہ نہر زرکن تھی۔ لیکن ملک حمزہ کے پاس نہ اتنے وسائل تھے اور نہ اتنی مہارت کہ وہ ان کو بحال کر سکتا۔ لہٰذا اُس نے ریگزاروں کے آغاز تک کے علاقہ کو ہی سیراب کرنے پر اکتفا کی۔ اُس کی نہریں اب بھی قابلِ شناخت ہیں۔

پلنگی کے کھنڈرات

اِس علاقے میں اُس وقت کے دارالحکومت کے پاس اُمرا و کبائر کی حویلیاں تھیں جو پلنگی

کے کھنڈرات بنے ہیں۔ یہ بہت ہیں اور بلند اور سرسری نظر میں شہر کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔
پلنگی کے آثار کافی محفوظ ہیں۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ان کی ایک دیوار پر پلستر میں چھوٹے چھوٹے
مربع سوراخوں سے ایک چیتے کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آیا اس کا کوئی
خاص مقصد تھا جو حویلی کے مالک کے علم میں تھا یا محض کسی منچلے کی کارستانی تھی۔ لیکن یہ
موجب دلچسپی ہے کہ زرہ بکتر جیسی کندہ کاریاں بہت عرصہ پہلے سیستان کے صناع بھی استعمال
کرتے تھے۔

پلنگی کا نقشہ و تعمیر

پلنگی اس دور کی حویلی کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے جو کسی ذاتی دشمن کی مدافعت کے
لئے کسی حد تک قلعہ بند ہونے کے باوجود بنیادی طور پر ایک رہائش گاہ ہوتی تھی۔ نقشہ میں یہ
ایک مربع ہے جس کا ہر ضلع ۲۰۰ فٹ ہے۔ زاویئے مشرقی رخ پر ہیں اور ایک طرف گرمائی
ہوا کے رخ پر ہے۔ اندرون مربع دو مساوی حصوں میں تقسیم ہے۔ شمالی نصف میں معمولی مکانات
ہیں جن کی گنبدیں چھتیں گر چکی ہیں اور مکانات کے اندر ریت بھری ہوئی ہے۔ شمالی دیوار کے
ساتھ ساتھ ایسے مکانات کی دو قطاریں تھیں جن کی چھتیں زمانۂ جنگ میں فوجوں کا مجموعہ اجتماع
بن جاتی تھیں۔ جنوبی نصف میں زمیندار یا مالک کی قیام گاہ تھی اور یہاں بھی کمرے دو مختلف فرش
پر تھے۔ ہر فرش کے وسط میں ایک ایک ہال تھا جس کے گرد کمرے تھے۔ اندرونی حصوں کی
نوک پلک چونے کے گارے سے بنی تھی اور اسی سے دیواروں پر پلستر کیا گیا تھا۔ گنبدوں کے
اندرونی حصے چھوٹی چھوٹی معینوں میں تقسیم کئے گئے تھے اور خطوط تقسیم گچ سے بنے ہوئے تھے
اور ان پر پلستر اور سفیدی کی گئی تھی۔ ہر ہال ۳۰ فٹ لمبا اور ۲۰ فٹ چوڑا تھا اور ہر سرے کے
محرابی دروازہ سے چھوٹے گنبدیں کمروں میں جا سکتے تھے۔ چونکہ بالائی کمروں کی چھتیں اور فرش
گر چکے ہیں لہٰذا صرف نچلی منزل کا نقشہ ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ ہال کے دو طرفہ کمرے ضرور محفوظ
ہیں لیکن وہ بھی آدھے آدھے ریت اور ملبہ سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ بالائی فرش کے کمروں میں

بڑے بڑے دریچے تھے جو محرابی تھے۔ جہاں محراب کا خم اُبھرتا ہے وہاں ایک افقی تعمیر پارہ ہے۔ ایک مسطح محراب جو دریچے کو دو غیر مساوی حصّوں میں بانٹتا تھا۔ زیریں حصّہ چوکور اور بالائی قریباً ایک نیم دائرہ تھا۔ دریچہ سازی کا یہ طریقہ عام تھا۔ غالباً چوکور حصّوں کے آگے ایک دری معلّق رہتی تھی اور بالائی حصّے ہَوا اور روشنی کے ذریعے تھے۔ بنیادی منزل کے کمروں میں ہَوادان تھے اور روشنی کے لئے روزن بھی، جو بوقتِ جنگ دفاعی کام بھی دیتے تھے۔ دیوار کے ہر زاویئے پر ایک گول مینار تھا جو دفاع کے کام بھی آتا تھا اور تکمیلِ نقشہ اور ظاہری تاثر میں اضافہ کا بھی مظہر تھا۔

ہَوا چکّی

عمارت کے شمالی نصف کے شمالی زاویہ کی طرف ایک ہَوا چکّی کے آثار ہیں جہاں غلّہ پیسا جاتا تھا اور دیواروں بلکہ کسی چھوٹے مکان میں ایک کنوّاں بھی تھا تاکہ پانی کی فراہمی یقینی رہے۔ شمال مغربی رُخ یا پَردے سے پرے آگے کو نکلی ہوئی دیواریں تھیں جو پردے کے ساتھ ایک خاص زاویئے پر بھی اور ایک مخصوص خم پر بھی تعمیر کی گئیں تاکہ نہ صرف ہَوا چکّی کے لئے بادبانوں کا کام دیں بلکہ اندرونِ عمارت بھی ہَوا رسانی کر سکیں۔ بہت سی حویلیوں میں جہاں ہَوا چکّی موجود ہے اس کے شواہد پائے جاتے ہیں کہ ہَوا چکّی ایک دوسرا مقصد پورا کرتی تھی یعنی گندم پیسنا اور اندرُونی کمروں کو ہَوا اور ٹھنڈک پہنچانے کا ذریعہ بننا۔

غسل خانے اور دیگر دفاتر چھت کے اُوپر تھے اور دیواروں میں نالیوں کی جگہیں ابھی نظر آتی ہیں۔ نالیوں کا تعمیری حصّہ غائب ہے لیکن اس کے گہرے داغ موجود ہیں۔ ہَوا چکّی کے دروازے کے جنوب کی طرف شمال مغربی رُخ پر ایک عجیب وغریب نیم مدوّر دیوار ہے جو ہَوا چکّی سے بل کھاتی ہوئی مُڑتی ہے اور زمین سے عمارت کی پوری بلندی کے برابر ہے۔ اس کا مقصد بالکل واضح نہیں ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ چکّی کے اندرونی حصّہ میں ہر قسم کے فاسد مواد کا داخلہ روکنے کے لئے بنائی گئی تھی، گویا ہَوا چکّی کی محافظ تھی۔ اس حصّہ عمارت میں

دریچے نہیں ہیں اور صرف چھوٹے چھوٹے سوراخ ہیں۔ روزنوں سے ذرا بڑے، جن کے ذریعے بالائی کمروں یا دفتروں کا کوڑا کرکٹ باہر پھینکا جاتا تھا۔ اس وقت دیوار کا ایک شگاف دروازہ کا کام دیتا ہے اور چونکہ اصلی دروازہ قلعہ بند نہ تھا۔ لہٰذا اس کی نشاندہی نہیں ہو سکتی۔ غالباً یہ خدام کے مکانات کی جنوب مشرقی دیوار میں تھا۔ دروازے پر حفاظتی تعمیرات کی عدم موجودگی ثابت کرتی ہے کہ عمارت کا مقصد موثر، منظم اور مصمم مزاحمت و مدافعت نہ تھا اور مینار اور روزن وغیرہ صرف آرائشی مقصد کے لئے تھے۔

تعمیراتی جزئیات

یہ عمارت بہترین گل کاری کی کرسی پر کھڑی ہے جس پر دیواریں بنی ہیں۔ کرسی بجائے خود ۶ فٹ اونچی ہے اور دیواریں اس پر مزید ۲۵ فٹ اونچی ہیں۔ دیواروں کا بیرونی حصہ زائد تختوں سے سجایا گیا ہے جو پختہ اینٹوں کے ڈھلے ہوئے ردّوں میں شامل تھے اور ان کا مجموعی تاثر بہت خوشگوار ہے۔ بحیثیت مجموعی ملینگی ملک حمزہ کے دور میں دیہاتی امرا کے مکان کا بہت اچھا نمونہ ہے جو قرب و جوار میں بھی نظر آتا ہے۔ بعض باتوں میں یہ ان سے مختلف بھی ہے اور جدت ترکیب کا مظہر ہے۔ مشرق، مغرب اور شمال کی طرف علاقہ قدیم تر اور شاید کم ماہرانہ عمارات کے کھنڈرات سے بھرا پڑا ہے جو محض بے ڈھنگے ہیں۔ یہ شاید معز الدین حسین اور امیر خلیل کے دور کے ہوں۔ یہ ملینگی سے پرانے معلوم ہوتے ہیں اور اس کے جنوبی آثار سے بھی۔

حمزہ خان کا حوض

مذکورہ عمارتوں کے جنوب میں ایک حوض ہے جس پر شروع میں گنبد تھا۔ حوض اب بھی واضح ہے اور اس میں پانی کے داخلہ و خارجہ کی نالیاں بھی ہنوز نظر آتی ہیں۔ اس طرح حوض کا پانی صاف رہتا تھا۔ یہ حمزہ خان کا حوض کہلاتا ہے جو عمارت کے اندر اجلاس اور دربار کرتا تھا۔ کنارہائے حوض اور دیواروں کے درمیان دریاں بچھی رہتی تھیں اور وہاں اونچے گنبد کے خنک

سائے میں، آبِ رواں کے قریب علاقے کے اکابر و اشراف جمع ہوتے تھے اور گرمی کی شامیں قلیان پی کر اور موسیقی سُن کر گذارتے تھے۔ اِن اجتماعات میں سرکاری کام بھی نمٹایا جاتا تھا اور شعراء اور ادبا کی تخلیقات و نگارشات بھی داد و بے داد پاتی تھیں۔ حوض کی آب رساں نہریں اب بھی پہچانی جاتی ہیں۔ گنبدیں عمارت کے اِرد گرد چھوٹے چھوٹے کمروں میں اُمرائے کے خدام آرام کرتے تھے۔

پلنگی کے قریب کھنڈرات

مزید جنوب مغرب میں حویلیوں اور کاشانوں کے وسیع کھنڈرات ہیں جن میں سے کچھ بالکل بوسیدہ اور کچھ بہتر حالت میں ہیں۔ ان میں سے اکثر میں امرائے کے کمرے دو فرشوں پر تھے اور ایک کھلے صحن کے شمال مغربی رُخ میں تھے۔ دیگر تینوں طرف ملازموں کے کمرے تھے۔ ان میں کئی ہواچکیاں بھی ہیں جن میں سے مشہور ترین کے پہلوؤں کی دیواروں پر المکس جیسی صلیب نما گُل میخوں سے آرائش کی گئی ہے جو گچ یا پلستر میں اُبھرے ہوئے نقوش ہیں۔ یہ ہواچکی اپنے احاطہ میں کھڑی تھی اور بہت بڑی تھی۔ عمارت کا نچلا حصّہ کئی فٹ بلند کُرسی ہے جس پر سُکھائی ہوئی اینٹوں سے اونچی اونچی دیواریں بنائی گئی ہیں۔ ان عمارتوں کے ساتھ باغات اور کشت زار تھے۔ مکانات کی طرزِ تعمیر اور علاقے کی شکل و شباہت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکمّل دورِ امن میں آباد تھے اور یہ امن داخلی بھی تھا اور خارجی بھی[1]۔

ملک حمزہ خان کا زمانۂ امن

ملک حمزہ کا دَورِ امن کا دَور تھا۔ سیستان ایرانی سلطنت کے زیرِ حفاظت ہونے کی وجہ

---

[1]۔ کرسٹی ان آثار کو پلنگی کہتا ہے۔ پُلگ سیستانی لفظ ہے بمعنی نفیس ریت یا مٹی۔ پُلگی پلنگی کا بگاڑ ہو سکتا ہے یا کرسٹی کے وقت (۱۸۱۰) اس پر ریت کے تودہ ہائے جُنباں ہوں گے جنہیں ہوا اُڑا کر لے گئی ہے۔

سے خارجی حملوں سے محفوظ تھا۔ اُوزبک ماوراالنہر میں دبک گئے تھے اور ہندوستان کی مغل سلطنت بہت دُور تھی۔ صفوی اور مُغل دونو سلطنتوں کی بیخ و بُن اکھاڑنے والے عوامل ہنوز در پردہ تھے اور ان دونو دُودمانوں کے بانیوں کی عظمت و شوکت کا طلسم ہنوز اُن کے جانشینوں کا محافظ تھا۔

کیانی ملوک کی عمارات اور شاہانِ ایران کے محلّات

کیانیانِ سیستان نے اپنی عمارات کا نمونہ ہمیشہ ایران باستان کے محلّات کے روایتی بیانات کو بنایا۔ لہٰذا عام سیستانی عمارات میں بھی حکمرانوں کے طرزِ تعمیر کی تقلید کی گئی۔ اسی لئے سیستان کی قدیم لیکن ہنوز کسی حد تک محفوظ عمارتوں میں اونچے محرابی راستے اور ہال اتنے عام ہیں۔ زاہدان کے آثار کے شمال میں قلعہ تیمور کی عمارات (جو دورِ تیموری سے بہت پہلے کی ہیں) میں کمرے گنبدیں چھت کے بڑے بڑے ہال ہیں اور باہر سے راستہ بھی چھت جتنی اونچی محراب کے نیچے سے ہے۔ سیستان میں تعمیر کرتے وقت اِن افرادِ خاندان کے سامنے ہمیشہ اپنے آباؤ اجداد، اکابرۂ قدیم کے ہال رہے اور ہر کھنڈر میں ان کے نشانات موجود ہیں۔

قلعۂ گاوک

اِس طرزِ تعمیر کا ایک اچھا نمونہ قلعۂ گاوک[۱] ہے۔ یہ اپنے دنوں میں ایک قلعہ نما محل تھا جس کے گرد بیرونی دیوار تھی۔ اصل عمارت بہت بوسیدہ ہو چکی ہے اور بیرونی دیوار گر کر ڈھیر بن گئی ہے لیکن اندرونی حصّہ ہنوز واضح ہے۔ یہ ایک لاطینی صلیب کی شکل کی ہے جس کے چاروں برابر بازو دو طرفہ کمروں کے راستے ہیں جو محرابی چھت تک کھلے ہوئے ہیں اور دو طرفہ کمرے دو منزلہ ہیں۔ لہٰذا صحن مربّع اور غیر مسقّف ہے۔

یہ جگہ اِس مشہور معرکے کا منظر سمجھی جاتی ہے جس میں رستم بالآخر جیت گیا۔ ذنگل باز

ع۱۔ قلعۂ فتح سے تیرہ چودہ میل شمال میں۔

صبح صبح اُٹھتے تھے اور مقابلہ کی تیاری کرتے تھے۔ اِسی لیے یہ جگہ چنڈولوں کا قلعہ کہلاتی ہے
سیستانی لہجہ میں 'خ'، 'گ' میں بدل جاتی ہے۔ موجودہ کھنڈرات ملک حمزہ کے دَور کے ہیں[1]۔

دیہہ ملیوں کے قریب چگِنی

کئی کھنڈرات میں آرائش بہت خوش اسلوبی سے کی گئی ہے۔ اس کے بہترین نمونے
ان کھنڈرات میں ملتے ہیں جنہیں بلوچی چگِنی (بمعنی آراستہ و پیراستہ) کہتے ہیں۔ یہ موجودہ گاؤں ملیو
کے قریباً مشرق میں ہیں اور یہ چکالنسر کے قریب آسکن زمینوں کی چُنگ دراز گو کے جنوبی
برے سے زیادہ دُور نہیں ہیں۔

نشتر نما کھڑکیاں جنہیں پلستر سے خوب ڈھالا گیا ہو، سیستان کی پرانی عمارت کی تعمیراتی
جزئیات کا اہم حصہ ہیں۔ چگِنی کے کھنڈرات کمروں کے بڑے بڑے انبار ہیں جو یکے بالائے
دیگرے ہیں اور ایک کشادہ صحن کے ہَوا کے رُخ پر ہیں۔ وسط میں ایک بلند محرابی راستہ دوطرفہ
کمروں کے ساتھ رابطہ پیدا کرتا ہے اور ایک چھوٹا محرابی راستہ داخلہ کے راستہ کے عین مقابل
باہر نکلتا ہے۔ ہَوا کے مخالف رُخ کی اطراف پر زیب و زینت محفوظ ہے۔ ورنہ گرد آلود ہَوائیں
سکھائی ہوئی اینٹوں کے مواد کو اپنی رگڑ سے گھسا ڈالتی ہیں۔ یہاں بعد کے دَور کی انتہائی آراستہ
عمارات اور پرانی سادہ و بے تصنع عمارات کا تضاد نمایاں ہے۔

زیارت عمران

چگِنی سے قریباً چھ میل دور زیارت عمران ہے۔ گنبدیں عمارت کے روضہ کے اِرد گرد
قدیم تر کھنڈرات بھی ہیں جو انتہائی سادہ ہیں اور جن کی سجاوٹ صرف دیواروں اور گول محرابوں
کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے تک محدود رہی ہے۔

---

[1] اِس حکمران کے زرّیں سکّوں کا ایک دفینہ مشہور ہے لیکن مجھے اس کا کوئی سکّہ نہیں ملا۔ اِس میں بھی شبہ ہے کہ
آیا اُس نے سکّے جاری بھی کیے یا نہیں۔ اُس کے والد نے تانبے کے سکّے ضرور بنوائے تھے۔

طاقِ عمران

زیارت کے شمال میں عمارات کا ایک ڈھیر ہے جو طاقِ عمران یا عمران کا محل کہلاتا ہے
یہ اپنے وقت میں ایک خوشنما عمارت تھی۔ اس کا ایک رُخ ہَوا کی طرف ہے اور پہلو کی دیواریں اسی
سمت میں ہیں اور ان کے اندر ایک باغ تھا جس میں اندر جانے کے لئے ایک اونچا دروازہ لگا ہُوا
تھا۔ اس لحاظ سے یہ زاہدان کے شمالی محل سے مشابہ ہے لیکن اس کی خصوصیت اس کے
کمروں کا طول و عرض ہے۔ دروازے کے دو رویہ معمولی کمرے ہیں لیکن مغرب کی طرف ایک ہال
ہے جو ۶۰ فٹ لمبا، ۲۰ فٹ چوڑا اور ۳۰ فٹ اُونچا ہے جس میں مالک کے ملاقاتیوں کا مجمع رہتا
تھا۔ چھت کافی حد تک گر چکی ہے لیکن کمروں کا نقشہ واضح ہے۔ دوہری دیواروں کا طریقہ مع تنگ
درمیانی راستوں اور روشن دانوں کے ایک اور اہم خصوصیت ہے۔ یہ عمارت غالباً زاہدان کے
شمالی محلات کی ہم عصر ہے اور قلعۂ تیمور کے ساتھ راستوں کی مشابہت اس کی تعمیر کے دور اور
وقت کی مظہر ہے۔ چکینی کھنڈرات ملک حمزہ کے زمانہ میں آباد بتائے جاتے ہیں لیکن طاقِ عمران
آباد نہیں تھا۔ اس کی آرائش بھی چکینی کی نسبت کم ہے۔ یہ زمینی منظر پر چھایا ہُوا ہے اور اس
کے آثار کھُلے میدان میں خوب نظر آتے ہیں۔ اس کے عام معمولی کمرے خدام اور جان نثاروں کے
تھے اور اس لاؤ لشکر کے جو حکمران کے جلو میں جا بجا جاتا تھا۔ دروازہ صحن کے جنوب مشرقی
رُخ میں تھا۔ یہ عمارت غالباً کسی ابتدائی ملک یا کسی عظیم شخصیت کی قیام گاہ تھی اور یہ تیمور کی تباہیٔ
زاہدان سے پہلے کی بنی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ خواجہ عمران کا محل محض اس لئے کہلاتی ہے
کہ یہ زیارت خواجہ عمران کے قریب واقع ہے۔

زمانۂ تعمیر

اس کے قریب ہی زورگن اور زرکن نہروں کی موجودگی غمازی کرتی ہے کہ یہ محل اُس
وقت آباد تھا جب یہ نہریں رواں دواں تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ عمارت بہت پُرانی ہے
اور آثار و شواہد بھی اس پر صاد کرتے ہیں۔ اس کا محلِ وقوع پانی کے براہِ راست عمل سے محفوظ ہے

اور دریا اُس پر کبھی حملہ آور نہیں ہُوا ۔ ارد گرد کے علاقہ میں دورِ تیموری سے کوئی خاص کاشتکاری نہیں ہوئی لہٰذا اُس کی جسیم دیواروں کو صرف ہَوا کے تھپیڑوں کا سامنا کرنا پڑا جو مٹی کے امدادی معاون کے بغیر بے ضرر ہوگئی ۔ اِسے انسانی دستبرد سے بھی واسطہ نہیں پڑا ۔

ملک حمزہ خان کی عمارات

ملک حمزہ خان یا اُس کے والد بلکہ حملۂ تیموری سے پہلے کی تمام پُرانی سیستانی عمارات میں ہَوا رسانی کا انوکھا طریقہ پایا جاتا ہے ۔ بعض گنبدوں کے اوپر روشندان بلکہ ہوادان تھے جو نچلے کمروں کو ہَوا پہنچاتے تھے لیکن اندرونی کمروں میں بھی ہَوا آتی تھی اور دوہری دیواریں انہیں تمازتِ آفتاب سے محفوظ رکھتی تھیں ۔ اِبتدائی منزل میں کمروں کو جُدا کرنے والی دیواریں ٹھوس اور جسیم تھیں ۔ بالائی منزل میں دیواریں دوہری تھیں جن کے درمیان دو فٹ چوڑا محرابی راستہ تھا جو صرف چند فٹ بلند تھا اور اُس کے اُوپر ٹھوس دیواریں تھیں حتیٰ کہ گنبد کی محرابیں شروع ہو جاتی تھیں ۔ زاہدان کے بعض شمالی کھنڈرات میں ابتدائی منزل کے اندرونی کمروں میں چھوٹی چھوٹی درزوں کا ایک سلسلہ تھا جو بالائی دیواروں کے روزنوں سے منسلک تھا ۔ نچلے کمروں میں یہ سوراخ گنبد کے آغاز کے ساتھ ہی تھے اور ایک مفید مقصد پورا کرنے کے علاوہ آراستہ بھی تھے جو سپاٹ پن کا تاثر دور کرتے تھے ۔ ہَوا رسانی کا یہ نظام ساروتار ، قلعہ فتح کے قریب پلنگی میں بھی موجود ہے جو ملک حمزہ یا اُس کے والد ملک جلال الدین کے دَور سے زیادہ پُرانے کھنڈرات نہیں ہیں ۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ اِن ماضیہ عمارتوں بلکہ حالیہ تعمیرات میں بھی وہی عمومی نقشہ اور طرزِ تعمیر پایا جاتا ہے جو ساسانی شاہانِ ایران کے دَور میں مروّج تھا ۔ چکنی مٹی کا صحیح استعمال کیا جائے تو یہ خشک ہو کر مُحکم ہو جاتی ہے اور کہگل کا احتیاط سے استعمال کیا جائے تو دیواریں اینٹوں جیسی بلکہ ان سے بھی زیادہ پائیدار بنتی ہیں ۔ کیونکہ کہگل ایک یکرنگ تودہ بن جاتی ہے جس کی بنی ہوئی عمارتوں کو تباہ کرنا خالہ جی کا گھر نہیں ۔ سیستان میں پُرانی عمارات اُن عمارات سے بہتر ہیں جن میں محض سُکھائی ہوئی اینٹیں اور ریندول استعمال ہوئی ہو ۔ بابل کے عظیم شہر

کے حالیہ اکتشافات سے یہ ثابت ہُوا ہے کہ یہ سامانِ تعمیر ان ایّامِ قدیم میں بھی بافراط اور بارہا طور پر استعمال ہوتا تھا جب گچکاری اتنی مقبول تھی اور جس کے کھنڈرات کی ڈھیریاں اِس شہرِ عظیم کی نشاندہی کرتی ہیں۔

ملک حمزہ خان کے کاشت کاروں کی تعداد

ملک حمزہ کے وقت ہلمند سے نکلنے والی نہروں سے جتنی کاشتکاری ہوتی تھی وہ گویا اس کا نقطۂ عروج ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دو ہزار (۲،۰۰۰) پگو یا مزدور ٹولیوں کی صورت میں اِس جگہ اور دارالحکومت کے درمیان زراعت کاری اور نہروں اور آبی گذرگاہوں کی حفاظت میں مشغول تھے۔ پوستِ گاؤ اور خواجہ سُرجُو کی سمت کی زمینوں پر ایک ہزار مزید پگو کاشتکاری میں مصروف تھے جو خاش رود سے سیراب ہوتی تھیں۔

ملک حمزہ کے وقت ایرانی سیستان

موجودہ ایرانی سیستان اُس وقت ایک ویران علاقہ تھا۔ ممکن ہے قدیم ملک حیدری تک اچھے سالوں میں کاشتکاری کی کوشش کی گئی ہو لیکن بقایا حصّہ بے آب و گیاہ تھا اور صرف بارش یا کہیں کہیں کنوؤں کی بدولت موسمِ بہار میں ریوڑوں کی چراگاہ بنتا ہو۔ زاہدان کا علاقہ بالکل بنجر اور چٹیل تھا۔

علاقہ حوضدار۔

تراکن، رامرود اور حوضدار کے علاقے جو اب صحرا ہیں اُس وقت شاداب و آباد تھے۔ رودِ بیابان کی کئی گذرگاہیں تھیں جن میں سے ایک پُرزہ سُرہ دگال کے جنوب کی گہری کھاڑی سے بہتی تھی اور آج بھی پہچانی جا سکتی ہے۔ یہ گذرگاہیں صرف برسات میں بھری ہوئی ہوتی تھیں جب پانی بند ماشی سے اُچھل جاتا تھا۔ موسمِ سرما میں پانی گھٹ جاتا تھا اور اِسے قابو میں رکھنا اور اِس سے فائدہ اٹھانا آسان ہوتا۔

ملک حمزہ کے وقت جنوبی ڈیلٹا کے کاشت کار

کہا جاتا ہے کہ تراکن اور اِس کے مغربی اضلاع میں ایک ہزار سے ڈیڑھ ہزار پگو زراعت

سے وابستہ تھے۔ یہ اعداد و شمار بالکل صحیح تو نہیں ہو سکتے تاہم دیگر معلومات کے فقدان کے باعث بیدقیمتی ہیں یا محض تقابل کے عدم وجود کی وجہ سے نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ یہ تو تھا دُور افتادہ اضلاع کا حال لیکن ملک حمزہ کے وقت دارالحکومت کی قریبی زمینوں کے لیے مزید ایک ہزار پگو (پگو : سات افراد) درکار تھے اور ہلمند کے ساتھ ساتھ قلعہ فتح سے ضلع خانشین کی زمینوں پر ڈیڑھ ہزار پگو مصروفِ کار تھے۔

ترّاکن سے سرکوہا کا قدیم دشتی راستہ

ہامون کا جنوبی حصّہ اپنے موجودہ خاکہ سے بہت مختلف تھا جب ہلمند رودِ بیابان میں بہتا تھا۔ اس کا انتہائی شمالی راستہ پُز سرہ دگال کے جنوب کی کھاڑی میں داخل ہوتا ہے اور اس وقت یہ اس کھاڑی اور حوضدار (اور گندر) اور رامرود کے درمیانی زرخیز میدان کو بھی کبھی کبھار ہامون کی ایک شاخ میں بدل دیتا ہوگا۔ یا کم از کم افراطِ آب سے اِسے کچھ دنوں کے لیے ناممکن العبور بنا دیتا تھا۔ لہٰذا مواصلات کو برقرار رکھنے کے لئے ایک راستہ ترّاکن سے دشت کو عبور کرتا ہُوا اِس کھاڑی اور راس سرہ دگال کے پاس سے گذرتا ہُوا یا وادیٔ سنارود کے مغربی سرے سے ہوتا ہُوا موجودہ سرکوہا تک پہنچتا تھا۔ اب یہ قابلِ شناخت نہیں ہے لیکن اُس وقت یہ ایک شارعِ عام تھا کیونکہ ایک دو جگہوں پر ایسے نشانات پائے گئے ہیں جو اُن دَرّوں کو ظاہر کرتے ہیں جن کے ذریعے دشتی چٹانوں پر چڑھا یا اُترا جا سکتا تھا۔ ایک نشان پنڈول کا ایک چھوٹا سا چبوترہ تھا جس کے وسط میں تمرس کی ایک سیدھی چھڑی گڑی ہوئی تھی۔ اِس کا باقیماندہ بوسیدہ حصّہ اس سوراخ سے ملا جس میں یہ گڑی ہوئی تھی۔ یہ نشانات لغزش ختم کرنے کے لیے بنائے گئے تھے کیونکہ چٹانوں پر ہر جگہ سے چڑھنا یا اُترنا محفوظ نہیں ہے اور سطحِ مرتفع کو کاٹتی ہُوئی ندیاں اکثر پنڈول کے ٹیلوں اور ناقابلِ عبور گھاٹیوں کی تنگ و تاریک گھیتوں میں اُلجھ کر تہِ زمین غائب ہو جاتی ہیں۔ یہ راستہ بہت مقبول تھا اور ترّاکن اور سرکوہا کے درمیان ایک مسلّمہ ذریعۂ سفر تھا بالخصوص جب وقت کی بچت منظور ہوتی تھی کیونکہ مسافر کو جنوبی ڈیلٹا سے گذر کر رامرود اور حوضدار

ے ہوتے ہوئے سہ کوہا پہنچنے میں زیادہ فاصلہ طے کرنا ہوتا تھا۔ یہ بات بھی تھی کہ طغیانی کے دنوں میں رود بیابان کا ڈیلٹا دنوں بلکہ ہفتوں تک زیرِ آب ہوتا تھا۔ اِن دونو جگہوں کے درمیان صحرائی راستہ یقیناً اُس وقت چالو تھا جب شمالی ڈیلٹا اور تراکن دونو آباد تھے۔ یہ ملک قطب الدین کے دورِ حکومت میں صورتِ حال تھی جب تیمور نے ملک پر حملہ کیا۔ یہ اغلب ہے کہ بندِ رُستم کی تباہی کے بعد جب شمالی ڈیلٹا محرومِ آب ہوگیا تو یہ صحرائی راستہ شارعِ عام نہ رہا اور صرف سردی کے موسم میں چالو رہا جب بارش کے بعد شمالی ڈیلٹا میں پانی دستیاب تھا۔

زیارت شیخ حسین

جب بیرونی اضلاع خوشحال ہوتے تو دارالحکومت کے آس پاس کی زمینیں اور بھی بہتر ہوتیں۔ اِن زمینوں میں اکابر و اشراف قیام کرتے تھے۔ اِسی لئے موجودہ گاؤں چہار بُرجک سے کوئی آٹھ میل نیچے سے جنوب میں قلعۂ گاوک تک سارا علاقہ کھنڈرات سے اَٹا پڑا ہے جو بیرونی اضلاع کے کھنڈرات سے طرزِ تعمیر اور طُول و عرض میں بہت مختلف ہیں۔ شاہی خاندان کے افراد اِن میں سے اکثر بنگلوں میں رہائش پذیر تھے اور کہا جاتا ہے کہ قلعۂ فتح کے شمال کی بیشتر زمینیں ابوطاہر کو دے دی گئی تھیں جو ملک حمزہ کی بڑی بہن کا بیٹا تھا۔ یہ نوجوان بائیس سال کی عمر میں فوت ہوگیا تو اُسے زیارت شیخ حسین میں دفن کیا گیا۔ بعد کا روضہ عین اُس کی قبر پر بنایا گیا۔ اُس کی غمزدہ ماں نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قبر پر مقبرہ بنوایا جو اَب گر چکا ہے اور اس پر ایک یادگاری تختی بھی لگوائی۔ یہ مقبرہ کہگل کی ایک بھاری کُرسی پر بنایا گیا جس پر گنبد میں عمارت تعمیر کی گئی جو خالصتاً پختہ اینٹوں کی تھی۔ اس کے پاس ہی قبروں کے مربّع قطعے ہیں جو کیانیوں کے ہیں۔ دیگر قبروں کے قطعے دوسرے خاندانوں کے ہیں۔ مزار زمین سے اوپر بنے ہوئے ہیں۔ قبروں کی بالائی سطح ایک چبوترہ یا ڈھلان ہے اور جہاں کہیں یہ کسی حد تک گر گئے ہیں وہیں یہ سمجھنا ممکن ہے کہ اس کے نیچے انسانوں کے خاک شدہ ڈھانچے ہیں۔ ابوطاہر کے مزار کو افغانوں نے ۱۸۷۲ء میں لُوٹ لیا جب اُنہوں نے برطانوی کمشنر کے فیصلہ کے تحت سیستان کے اِس حصّہ پر قبضہ کیا۔ کتبۂ مزار کو اشارۂ خزانہ سمجھا

گیااور ان کی حریصانہ فطرتوں نے تباہی مچادی۔ بلوچیوں نے چند سال بعد تباہ شدہ مقبرے میں ایک زیارت بنادی اور اسے شیخ حسین سے منسوب کر دیا۔ مرحوم کی والدہ کی نصب کردہ تختی دو ٹکڑے کر دی گئی جن میں سے ایک ٹکڑے پر طاہر کا نام ہے اور وہ زیارت میں ہی موجود ہے اور دوسرا ٹکڑا قلعہ فتح کے جنوب کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں موجود ہے جس کے مالک اس کے کتبے کو اشارۂ دفینہ سمجھتے ہیں اور عربی حروفِ خفی کو قدیم فارسی گردانتے ہیں۔ ابو طاہر کا یادگاری کتبہ ایک قطعۂ سنگ میں کندہ کیا گیا تھا جس کے چکی کے پاٹ بھی بنتے ہیں۔ حروف ایک بھاری بھرکم عربی رسم الخط میں عمودی تھے اور خوش کندہ نہ تھے جیسے کہ زاہدان کے کھنڈرات میں پائے جاتے ہیں۔ اسی زیارت میں ایک اور تختی بھی ہے جس کا کتبہ مرمریں کھریا مٹی میں کھودا گیا تھا۔ اس کے بھی ٹکڑے ہو چکے ہیں اور اس کا کتبہ موجودہ شکستہ فارسی رسم الخط میں لاابالی طور پر کندہ ہے۔ ایک ٹکڑے پر مرقوم ہے " اعلیٰ حضرت (یا تقدس مآب) کی تاریخ وفات، ز ذوالحجہ ۶۲۳ھ (یا ۹۲۳) تھی۔" حضرت کا لفظ دینی یا دُنیاوی پیشوا کا مظہر ہے۔ ہندسہ ۶ یا ۹ کچھ مِٹا ہُوا ہے اور دونو پڑھے جا سکتے ہیں۔ الواح کے رسم الخط کے فرق سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اور چونکہ یہ ٹکڑے بہت فاصلوں سے چُنے جاتے ہیں اور رضاکارانہ طور پر درگاہوں کی نذر کئے جاتے ہیں لہٰذا مرمریں تختی بھی کہیں دور سے موجودہ جگہ پر آوردہ معلوم ہوتی ہے۔

باب پانزدہم

بعد کے سیستانی قصبے اور دارالحکومت

شاہجہان کا حملہ سیستان اور محاصرۂ دارالحکومت

ملک حمزہ کی موت سے پہلے سال میں قلعہ فتح کا محاصرہ ہوا یا اس سے تاوان لیا گیا - عین اسی وقت ایک ہندوستانی دستے نے وادئ ہلمند سے گذر کر بندِ لُوالبقا کو تباہ کر دیا - اس حملہ کی تفصیلات حصّہ تاریخ میں دی گئی ہیں - اس کی کامیابی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سیستان کی خوشحالی کتنی غیر محکم تھی اور یہ کہ یہ اتنا آسودہ حال نہیں تھا جتنا کہ روایات اور شجرۃ الملوک میں مندرج معلومات میں ظاہر کیا جاتا ہے -

قلعۂ فتح کا زمانۂ عروج و زوال

روایت کے مطابق قلعۂ فتح کا دورِ عروج کوئی ۲۳۰ سال رہا اور زوال کوئی ۲۴۰ سال پہلے شروع ہوا - یہ اعداد و شمار تاریخ کے اعداد و شمار سے عین مطابقت نہیں رکھتے ، لیکن دونوں میں فرق بھی صرف ۲۶ سال کا ہے - تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ خوشحالی و بدحالی کے ادوار غالباً قریباً یکساں تھے اور ان کا مجموعہ ۴۹۶ سال بنتا ہے - بدحالی بتدریج بڑھتی رہی اور فتح علی خان کے عہد میں ہلمند نے رودِ بیابان سے اپنی گذرگاہ بدل لی - گو یہ تبدیلی اس کے دَور میں ہوئی تاہم روایت کے مطابق دریا کچھ عرصے سے تبدیلی گذرگاہ کے لئے کسمسا رہا تھا - ایک انتہائی صحیح اور مسلسل روایت کے مطابق یہ تبدیلی اُس وقت ہوئی جب ایک سیلاب عظیم کا موسم تھا - ہلمند غیر معمولی شدّ و مد سے بہہ رہا تھا - تیز و تند پانی بندِ لُوالبقا کو بہا کر لے گیا اور اس

کے غضبناک ریلے دیگر پُشتوں کو توڑ پھوڑ کر نکل گئے۔

قلعۂ فتح کا جو حشر ہُوا وہ سیستان کے ہر دارالحکومت پر معلّق رہا۔

قلعۂ فتح سے کُنذارک

ہلمند کے شمالی ڈیلٹا میں لَوٹ آنے کے بعد قلعۂ فتح سے دارالحکومت کا کنذارک منتقل ہونا ضروری ہو گیا کیونکہ سیلاب کی تباہ کاریوں کا مداوا یہی تھا اور پھر آبادی بھی ایسے کشادہ علاقہ میں آگئی جسے دریا کی مراجعت زرخیز و زر ریز کرنے والی تھی۔ جب لوگ قلعۂ فتح کے گرد کی زمینوں کو خیرباد کہہ گئے تو حکومت کو بھی شمال کا رُخ کرنا پڑا۔ اس کے بعد قلعۂ فتح ورطۂ انحطاط میں آگیا اور دوبارہ کبھی دارالحکومت نہ بن سکا۔ گو یہ کئی نسلوں تک خاندان ملوک کا برائے نام صدر مقام رہا جس کے افراد محلّات میں جاگزیں رہے۔

کُنذارک

ملک فتح علی خان کی وفات کے ایک پُشت بعد تک کُنذارک دارالحکومت رہا اور لوگوں اور دریا کے درمیان ایک زبردست آویزش چلتی رہی جو مسلسل اس کی طرف بڑھتا رہا۔ مذکورہ پشتے اسی دَور کے ہیں جو دارالحکومت کو دریا کی دستبرد سے بچانے کے لئے بنائے گئے۔

یہ قصبہ ایک دارالحکومت کی نیو ڈالنے کی آخری سنجیدہ کوشش ہے اور اس کی تعمیر سیستان کے زوال کی مظہر ہے جو بدزیب اور بے سلیقہ طرزِ تعمیر سے عیاں ہے۔ اس سلسلہ میں یہ جلال آباد سے ذرا ہی بہتر ہے۔ کُنذارک کا نقشہ وہی ہے جو غالباً اوّلین قلعہ سے شروع ہُوا تھا۔ دو بیرونی خطوط دفاعی ایک قلعہ بند محل یا کوٹ کو گھیرے ہوئے ہیں اور دوسری دیواروں میں سے اندرونی طرف کی دیوار شہر کو اپنی آغوش میں لیے ہُوئے ہے۔ اس کے اور بیرونی دیواروں کی درمیانی جگہ میں چند بڑی بڑی عمارات، باغات و کشت زار میں ایستادہ ہیں اس مخصوص جگہ میں دیواروں کا نشان چوکور ہے جو قریباً ایک مربّع معلوم ہوتا ہے۔ احاطوں کی اطراف مشرقی رُخ پر ہیں گو یا زاہدان سے مختلف ہیں۔ اندرونی دیواروں میں محصور چھوٹے

ے قصبہ کے لئے باغات وکشت زار ایک تفرّج گاہ تھے ۔ قصبہ معمولی جھونپڑیوں کا مجموعہ تھا، جو سوکھائی ہوئی اینٹوں سے بنی تھیں اور جن کی چھتیں گنبدیں تھیں۔ مشرقی اور مغربی دروازے کو ملانے والی گلی اندرونی قلعہ کو قریباً دو برابر حصّوں میں بانٹ دیتی تھی اور یہ قریباً سیدھی تھی یہ محل کی جنوبی دیوار کے نیچے سے گذرتی تھی جو اونچی دیواروں سے محصور ایک صحن کی مغربی طرف عمارات کا ایک اونچا ابار تھا۔ اِن دیواروں کے اندر کی طرف شاہی خدّام کے کمرے تھے ۔ یہ محل اور اُس کا قُرب وجوار کسی حد تک قلعہ بند کیا گیا تھا لیکن زیادہ مضبوطی سے نہیں۔ قصبہ محل کی مشرقی اور جنوبی اطراف میں تھا اور موّخر الذکر اور دیواروں کے درمیان مخالف اطراف میں صرف چند بڑی بڑی عمارتیں تھیں۔ یہ عمارتیں اب کھنڈر بن چکی ہیں لیکن قصبہ محل سے بہتر حالت میں ہے ۔ غالباً اِس لئے کہ یہ محل کے ویران ہونے کے بعد بھی آباد رہا۔ سب عمارات وغیرہ سوکھائی ہوئی اینٹوں کی ہیں۔ اندرونی دیواروں کے نشان موجود ہیں لیکن بیرونی بالکل بے نشان ہو چکی ہیں۔ دونو اندرونی اور بیرونی دیواروں میں ہر رُخ پر ایک دروازہ تھا۔ موّخر الذکر کا دروازہ جنوبی رُخ پر تھا اور اُس کی حفاظت کے لئے ایک علیٰحدہ قلعہ تھا جو معرضِ انہدام میں ہے اور ایک قلعہ بند محل یا محض ایک مضبوط مورچہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک دیوار کے ذریعے مقبرہ کی بیرونی دیوار سے ملا ہوا تھا۔ کنڈارک کے مغرب میں ایک بڑی ہوا چکی کا نمایاں کھنڈر ہے جسے قاضی عبداللہ کُنڈارکی نے بنوایا تھا۔ یہ مُلک بھر میں آسِن قاضی کہلاتی ہے ۔

مدرسہ

مہال گلستان کے بیان میں جس تباہ شدہ مدرسہ کا ذکر کیا گیا ہے اُسے ملک فتح علی نے بنوایا تھا اور اُس کا مہتمم قلعہ فتح کے ملا شاہی خاندان کا سربراہ تھا۔ اِس میں شک ہے کہ آیا جلائی اور گوری دیہات کے آس پاس کے کھنڈرات دورِ کنڈارک کے ہیں یا اِس سے پہلے کے۔ سیلابوں نے اِنہیں سفید چکنی مٹی کے ڈھیر بنا دیا ہے لیکن اِن میں سے کچھ غالباً دورِ زاہدان کے ہیں جن کی دیواروں کے حصّے ابھی موجود ہیں۔ وہ دورِ کنڈارک کے ہو سکتے ہیں۔

محمود اور ملک فتح علی خان دوم

بالآخر اِس قصبے کا بھی وہی انجام ہُوا جو زود دیا بدیر ہر سیستانی دارالحکومت (ماسوائے زاہدان) کا مقدر رہا ہے، لیکن یہ دور نادر شاہ میں سلامت رہا۔

یہیں سے شہزادہ محمود عزم بالجزم کے ساتھ روانہ ہُوا اور خراسان پر قابض ہُوا جس پر وہ کچھ عرصہ حکومت کرتا رہا۔ بالآخر وہ اِس عظیم قائد کی عسکری قوّت سے مغلوب ہو گیا جس نے اپنے ملک کو افغانوں کی ظالمانہ گرفت سے چھڑایا۔ شجرۃ الملوک کے مطابق ملک فتح علی خان کو ۱۱۶۰ھ (۱۷۴۷ء) میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور اُس کی موت سے سیستان ایک دورِ ابتلاء و انتشار کی زد میں آ گیا۔

کندارک کے بعد کے دارالحکومت

کندارک کو غالباً خیرباد تو نہیں کہا گیا لیکن عملاً ایسا ہی ہُوا اور اِس کے ساتھ ہی تجدید خوشحالی کا دور ختم ہُوا۔ گو یہ تجدید بھی تعمیرِ کندارک سے پہلے ہی رُو بہ تنزّل ہو چکی تھی۔

کندارک کے بعد کے دارالحکومت محض گاؤں بن کر رہ گئے جیسے کہ آج کل کا صدر مقام ہے۔ انہیں قلعہ بند کرنے کی روایت جاری رہی لیکن مورچے انتہائی کمزور ہوتے تھے اور دیواریں اور برج محض خول تھے۔ صدیوں کی شورشوں، قتلام اور دریائی گذرگاہ کی تبدیلیوں (جو بحرانوں کی وجہ سے قابو نہ کی جا سکیں) نے سیستان کی قدیم آبادی کو ملک سے باہر جانے پر مجبور کر دیا اور باقی ماندہ آبادی کی ہمّت و قوّت جاتی رہی۔ وہ جو ہر خود اعتمادی سے محروم ہو گئی اور اپنے حکمرانوں کی گرفت میں نہ رہی۔ کیونکہ وہ بھی اپنا لوہا نہ منوا سکتے تھے۔

اللہ آباد میان شیلا کی تعمیر

دریں اثناء دریا کندارک کی طرف مسلسل پیش قدمی کر رہا تھا اور بالآخر اُس نے لوگوں کی مزاحمت پر قابو پا ہی لیا۔ کندارک کا حشر بھی قلعہ فتح جیسا ہُوا اور دارالحکومت اللہ آباد میان شیلا میں منتقل کر دیا گیا جو اِس کے بعد بسایا گیا۔ یہ نیا گاؤں شیلاؤں یا ملبند کی پُرانی گذرگاہوں کے درمیان تھا

لہٰذا اِس کا محلِ وقوع سازگار نہ تھا۔ یہ نہ صرف ہلمند کی پر طغیانی کی زد میں رہا بلکہ بادِ صد و بیست روز کے غضبناک تھپیڑے ہاموں کے پانی کو بھی مشرق کی طرف دھکیل کر اس کی دیواروں تک کی زمینوں کو غرقاب کرتے رہے۔ اِس طرح اِس جگہ کا انتخاب ذمہ دار لوگوں کی نااہلی کا غماز تھا جو اِس میں مضمر نقصانات کو نہ سمجھ سکے۔

ملوکِ سیستان کو قائنات میں زمینیں دی گئیں۔ خاندان کی ایک شاخ طوُن جاسبی اور احمد شاہ نے حق آباد اور خُسف کے علاقے بھی اپنے مملوکات میں شامل کر لیے۔ اسی کی وجہ سے اُس نے یہ جگہ ہاموں کے قریب منتخب کی جہاں سیستان سے قائن اور برجند کو جانے والی سڑک کوچہ افضل آباد کے ذریعے جھیل کو عبور کرتی تھی۔ اللہ آباد میانِ شیلا موجودہ دارالحکومت سے چھ میل شمال مشرق میں ہے۔

اللہ آباد میانِ شیلا نقشہ میں چوکور ہے۔ یہ شمالاً جنوباً ۸۰۰ فٹ لمبا اور شرقاً غرباً ۵۰۰ فٹ چوڑا ہے۔ اندرونی حصہ گلیوں کے ذریعے چار حصّوں میں منقسم ہے جو شمالی، جنوبی، شرقی اور غربی ابواب کو ملاتی ہیں اور ان حصّوں کے درمیان ایسے مکانات ہیں جو کندارک کی نسبت بہت حقیر اور بدنما ہیں۔ دیواروں کے اندر کوئی محل نہیں یا اگر تھا تو وہ سِرے سے غائب ہو چکا ہے۔ دیواریں گو پختہ اینٹوں کی ہیں تاہم بوسیدہ ہو چکی ہیں۔ اندرونی مورچوں سے دو تین سَو فٹ پرے بیرونی دیواریں تھیں جن کے گرد خندق تھی جس کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ قرب وجوار، حویلیوں، ہواچکیوں اور باغوں کی دیواروں کے کھنڈرات سے بھرے پڑے ہیں۔ اللہ آباد میانِ شیلا کی مدّت بہت مختصر تھی۔ ملک سلیمان خان کچھ عرصہ کندارک کے محل میں رہا اور شاید اسی لئے یہاں کوئی محل نہ بنایا گیا۔ روایات کے مطابق اللہ آباد کو اِس لئے چھوڑنا پڑا کہ ہاموں کا پانی اس کی زمینوں کو تختۂ مشق بنائے رکھتا تھا بلکہ اس کی دیواروں تک کو ضعف پہنچاتا رہتا تھا۔ ہلمند کے پانی نے بھی اِس کی تباہی میں حصّہ لیا۔ اُس وقت ہلمند شمالی ڈیلٹا کے جنوبی سِرے پر زور ڈال رہا تھا اور موجودہ دارالحکومت کا جنوبی علاقہ پُرانی دریائی گذرگاہوں سے پٹا پڑا ہے۔ اور اِسی لئے کندارک کو خیرباد کہنا پڑا۔

امیر کابل کا نمائندہ

موجودہ دارالحکومت سے کوئی چار میل مغرب میں کھنڈرات ہیں جو قلعہ نما حویلیوں اور الگ تھلگ کاشانوں کے ہیں جن کے اردگرد باغات و کشت زار تھے۔ یہ غلام شاہ خان کہلاتے ہیں جو احمد شاہ یا تیمور شاہ والئی کابل کے ریذیڈنٹ کی رہائش گاہ تھے کیونکہ ملک سیستان درانی خاندان کا باجگزار اور حکم بردار تھا۔ نمائندہ اپنے آقا کے مفادات کی حفاظت کرتا تھا اور ملک کو سرکش امرا پر قابو رکھنے میں مدد دیتا تھا۔

خُوضدار

خُوضدار ایک موجودہ قلعہ ہے جس کی چار دیواری کے اندر قصبہ بھی ہے۔ جنوب اور شمال کی طرف دروازے تھے اور اس کے اردگرد ایک ۵۰ فٹ چوڑی خندق تھی۔ شمالی دروازے کے بائیں طرف کہگل کی بنی ہوئی ایک عظیم الشان عمارت حکمران کا محل تھی۔ خندق کے اندر دو تین کنوؤں کے آثار ہیں جو نہروں کے بتدریج خشک ہونے پر پانی کے رواں ہونے کے دوران بھی شہر کو پانی دیتے تھے۔ قلعہ کے شمال میں باغات کی دیواروں کے آثار ہیں اور جنوب میں ایک قبرستان ہے اور اس سے آگے شہر رستم کی جگہ ہے جو صرف ایک ٹکڑا اور وخر کے کھنڈر کی صورت میں موجود ہے۔

کُندار

کُندار محض ایک دیوار بند گاؤں تھا جس کے گرد خندق تھی جو خُوضدار کی طرح دشمن کی بجائے صرف سیلاب کی روک تھام کے لئے تھی۔ کیونکہ کندار، خوضدار اور شہر رستم جگہیں ایک سخت ہموار میدان پر واقع ہیں۔ یہاں بھی کھنڈرات کے بعض کتبوں پر تواریخ تھیں لیکن ۱۱۳۰ھ سے پہلے کوئی تاریخ نہ پڑھی جا سکی۔ ایک میں مرقوم تھا: "میر جعفر خان ولد (ناخوانا) خان در سال ۱۱۳۰" (۱۷۱۷ء)

باب شانزدہم
شہر کاخ اور کوہ خواجہ کے کھنڈرات

حالیہ مصنّفین نے سیستان کے باب میں شہر کاخا کا ذکر بھی کیا ہے اور ان کے بیان آثار میں مزید اضافہ کی گنجائش نہیں البتّہ نام کا ماخذ کچھ مشکوک ہے۔ غالباً کرسٹی (۱۸۱۰ میں) کے استناد پر کنیرٗ نے اپنے 'جغرافیائی تذکرۂ ایران' میں سیستان کا ذکر کیا۔ اُس نے شہر کو گوخو زرد پکارا۔ جرد قدیم فارسی میں قلعہ کو کہتے ہیں اور گوخو لفظ کاخا کی تحریف ہے۔ سیستانی حرف 'ا' کو بیشتر میں بدل دیتے ہیں۔ لہٰذا کینرٗ کا دیا ہوا نام کاخاجرد ہے جو اس نے کرسٹی یا کسی اور سے لیا۔ کاخا اب بھی سیستانی آبادی کا ایک مشہور قبیلہ یا طائفہ ہیں اور یہ قدیم قلعہ اس قبیلے نے اس وقت بنایا اور قبضے میں رکھا جب یہ آبادی کا اہم اور طاقت ور حصّہ تھا۔

قصبہ کا محلِ وقوع

قصبہ بہت بڑا نہ تھا۔ یہ سطح مرتفع کی جنوبی پھسلواں چٹان سے نیچے کوہِ خواجہ کی ڈھلان پر بنا ہوا تھا لیکن گرمی میں یہ جہنم زار بن جاتا تھا۔ اس کی تعمیر کے وقت گردوپیش کی زمین شاداب آباد تھی۔ سیستان میں یہ اب بھی ایک روایت بنا ہوا ہے۔ جب مرورِ زمان کے ساتھ ہلمند نے جھیل کے اس حصّہ کو نیزار میں بدل دیا اور علاقہ زیرِ آب رہنے لگا تو صیاد آبادی کے ایک ارباب نے دشت کی ایک معمولی گہرائی میں ایک چھوٹا سا قلعہ بنوایا جو جنوب کی طرف باہر کو نکلا ہوا تھا۔ شہر کو خوب قلعہ بند کیا گیا اور اس کے گرد دوہری دیواریں تھیں جن میں سے بیرونی گر چکی ہے اور شہر اور محل کے گرد اندرونی دیوار سے آگے ڈھیریوں کی شکل میں موجود

ہے۔ بیرونی دیوار ایک ٹیڑھا میڑھا نیم دائرہ ہے جس کے دونو بازو ان پہاڑی ڈھلانوں پر متمکن ہیں جن پر شہر بنا ہوا ہے۔ پختہ اینٹ شاذ و نادر ہی استعمال ہوئی ہے اور پتھر بہت کام میں لایا گیا ہے جو قریب ہی وافر مقدار میں دستیاب تھا۔ عمارتوں کے نچلے ردّے پتھّر کے بڑے بڑے ٹکڑوں پر مشتمل ہیں جو چکنی مٹی کے گارے سے جوڑے گئے ہیں اور اس کے اوپر پوری عمارت کہگل کی ہے۔ محل میں زیادہ تر سکھائی ہوئی اینٹ استعمال ہوئی ہے اور دیواروں میں آرائش کے لئے سنگین ردّوں کی قطاریں بھی ہیں جیسے دیگر جگہوں پر پختہ اینٹوں کی ہیں۔

قلعہٴ کک

سطح مرتفع کے ایک سرے پر ایک قلعہ یا محل کا کھنڈر ہے جسے قلعۂ کک کہتے ہیں اور جو سکھائی ہوئی اینٹوں اور کہگل کا بنا ہوا ہے۔ اس کی جنوبی دیواریں کہیں کہیں پتھر کے پشتوں پر کھڑی ہیں جنہیں پھسلواں چٹان سے چبوترے کی شکل دی گئی ہے اور اس پر قلعہ بنایا گیا ہے۔ یہ قدیم کانوں کی مہارت اور قوّت کا مظہر ہے جنہوں نے کبھی دیواریں ایسی جگہ پر بنائیں جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خطرۂ آب و سیلاب سے محفوظ تھی۔ ہاموں کے اپنی جگہ پر متمکّن ہونے سے پہلے یہاں پانی کا ملنا کافی مشکل تھا۔ سطح مرتفع کی ڈھلانوں کی ہر آبی گذرگاہ میں پتھروں کے بند بنے ہوئے ہیں جن کی مٹی مدتوں پہلے زائل ہو چکی ہے۔ یہ صرف آبِ باراں کو روکنے کے لئے بنائے گئے تھے۔

پانی کی فراہمی

شہر یا بیرونی دیوار کے اندر کنوئیں بنوائے گئے ہوں گے جن سے گدھے ایک کشادہ راستے سے پانی چوٹی تک پہنچاتے تھے۔ پتھروں کا پشتہ اب گر چکا ہے لیکن اس کا باقی ماندہ حصّہ اس کی نوعیّت کا پتہ دیتا ہے۔ بالائی قلعہ ہاموں سے ۴۰۰ فٹ بلند ہے اور ڈھلان پر قصبے کا بالائی حصّہ قریباً ۲۰۰ فٹ۔ شہر کے گرد کی پہاڑیوں پر بالائے زمین قبریں ہیں۔

زیارت

شمالی ڈھلان کی پیشانی پر زیارت خواجہ غلطان ہے۔ جہاں سے شمال کا منظر دیکھا جا سکتا

ہے۔ اِس کی وجہ سے اِس کے قریب بہت سی موجودہ قبریں بھی ہیں۔

درّہ سوختہ

درّہ سوختہ گھاٹیوں کے درمیان ایک گہری وادی ہے جو کوہ خواجہ میں ہیں اور اِس وادی سے زیارت تک جانے کا ایک اچھا راستہ ہے۔

چہل دُختران

اِس وادی اور جنوب مغربی ہامُوں کے چوڑے پاٹ کے اوپر چہل دُختران نامی ایک عمارت کا کھنڈر ہے۔ یہ قلعہ بند تھی اور دروازے کا ایک مشرق رُو مینار ظاہر کرتا ہے کہ ہر مینار میں دو محرابی کمرے تھے جو سار و تار اور چہل بُرج کی طرح روزن دار تھے۔ محرابی دروازے کا اندازِ تعمیر بھی سار و تار جیسا ہے جو پتلی سکھائی ہوئی پنڈول کی پرتوں سے بنا ہے۔ یہ طرزِ تعمیر رودِ بیابان کے قدیم ترین کھنڈرات میں بھی ملا ہے جو قدیم نہری علاقوں میں ملے ہیں۔ چہل دُختران بڑے بڑے پتھروں کی کُرسی پر کھڑی تھی جنہیں پنڈول سے جوڑا گیا تھا اور کُرسی کے عین اُوپر روزنوں کی ایک قطار اِس کی سلامتی کی ضامن تھی۔ پتھر اور گارے کی جھونپڑیاں اور ایک احاطہ اِس کے قریباً ۳۰ گز کے فاصلے پر موجود ہیں۔

چہل دُختران کی روایت

کہا جاتا ہے کہ زمانۂ گزشتہ میں یہاں ۴۰ دوشیزائیں رہتی تھیں جن کی آوازیں اور قلقاریاں ان کے افرادِ خاندان کو صاف سنائی دیتی تھیں جو ایک قدیم قلعہ میں مقیم تھے اور جس کی جگہ پر موجودہ سرکوہا تعمیر ہُوا۔ ان دونوں جگہوں کے درمیان ۲۵ میل کا فاصلہ ہے۔

کاخا کے روایتی اور تاریخی حوالے

شہر کاخا، ماقبل رستم دَور کا بتایا جاتا ہے جس کا سردار اِس جانباز کا خاندانی دشمن تھا۔ اسی شہر پر حملہ اور قبضہ نے رستم کی آئندہ بہادری کی ہَوا باندھی۔ لیکن نویں دسویں صدی ہجری (پندرھویں صدی عیسوی) تک تاریخ میں اِس کا ذکر نہیں ہے۔ تذکرۂ ہرات کے مصنّف (جس کے قلعۂ طاق کے بیان کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے) نے بتایا ہے کہ ہاموں کے جزیرہ میں ایک قلعہ تھا۔ بدقسمت ملک معزّالدین

حسین نے ۸۵۹ ھ میں اس میں پناہ لی لیکن اس کی اپنی رعایا نے اُسے بہت جلد علاقے سے نکل جانے پر مجبور کر دیا اور یوں ہرات کے تیموری حکمران بابر مرزا کو خوش کر لیا جس کے خلاف ملک نے بغاوت کی تھی۔ اسی مصنّف نے اس کا نام قلعۂ رُستم بتایا ہے جو اب بھی مروّج ہے۔ ملک حسین کی موت کے بعد قلعہ و قصبہ ویران ہو گئے کیونکہ اسی مصنّف نے چالیس سال بعد اسے بے آباد پایا۔ بعد میں یہ پھر آباد ہو گیا اور حملے کے وقت پناہ گاہ بنا رہا۔ اس وقت آب ہاموں اس کا محافظ تھا سوائے مشرقی طرف کے جہاں پانی کی وُسعت اور گہرائی کم تھی۔ اس طرف مورچے تھے جن میں بندوقوں یا تیروں کے لیے روزن تھے جو بعد کے دَور کے ہیں۔

سر کوہا

سرکوہا ایک قدیم جگہ ہے۔ موجودہ قلعہ پُرشکوہ ہے لیکن معرضِ انہدام میں ہے۔ اسے سربندی سردار نے سَو ڈیڑھ سو سال پہلے حاصل کیا اور اسی وقت سے بیشتر تعمیرات ہُوئیں۔ یہ غالباً پرانے قلعہ راسکک کی جگہ پر ہے جس کا کوئی نام و نشان نہیں۔ موجودہ قلعہ انیسویں صدی میں پہلی دفعہ تاریخ میں مذکور ہُوا۔

فوٹ: کوہِ خواجہ کی گھاٹیوں کے بند اس بات کے ثبوت ہیں کہ اس شہر کی تعمیر و آبادی کے وقت سیستان میں آج کل سے زیادہ بارش ہوتی تھی۔ اگر اُس وقت بارش تھوڑی ہوتی تو نہ گھاٹیوں میں پانی ہوتا نہ کوئی بند بنانے کی زحمت گوارا کرتا۔ (جی۔ پی۔ ٹی)

باب ہفدہم

میل قاسم آباد کا بیان

سیستان کی اِس سابقہ خوشحالی کی اِس دلچسپ یادگار کا ذکر پچھلے ابواب میں بار بار آیا ہے لہٰذا اِس کا مفصّل بیان ضروری ہے اور اسے اِس حصّہ کے آخر میں اس لئے بیان کیا جا رہا ہے کہ یہ ملک کی دیگر یادگاروں کے مقابلہ پر ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔

مینار اور اس کی جگہ

میل قاسم آباد کی وجہ یہ ہے کہ دیہہ قاسم آباد اِس تباہ شدہ مینار سے قریب ترین ہے۔ مینار کی چوٹی ٹوٹ کر گر چکی ہے لہٰذا اِس کی اصل بلندی بتانا ناممکن ہے۔ مغربی طرف ٹھوس تعمیر میں ایک بڑی سی دراڑ ہے جو شکستہ چوٹی سے کوئی ۲۰ فٹ نیچے تک پھیلی ہوئی ہے اینٹوں کے نچلے ردّے بھی آدمی کے انتہائی قد تک دیوار کی ایک چوتھائی جسامت پر سے اُکھڑ گئے ہیں۔ دروازہ بھی اب تو محض ایک سوراخ ہے کیونکہ محرابی راستہ سیستانیوں کی تخریب پسندی اور تباہ کاری کی نذر ہو چکا ہے۔ یہ عظیم نشانِ راہ اُسی پست چٹان یا ٹُرگ پر ایستادہ ہے جس پر زاہدان تعمیر ہوا اور یہ اِس تباہ شدہ شہر کی شمالی دیوار سے ساڑھے چار میل شمال مغرب میں ہے۔

ذیلی اور ملحقہ عمارات

جہاں تک آثار سے سمجھا جا سکتا ہے یہ ایک صحن کے جنوبی زاویئے پر کھڑا تھا اور اِس کے اردگرد چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ یہ بھی صحن کی مغربی طرف تک پھیلے ہوئے تھے۔ اِن

تمام عمارات کا رُخ بھی وہی ہے جو شہر زاہدان کا ہے۔ صحن کے شمال مغرب میں ایک عمارت تھی جو مینار کے اِردگرد کے کمروں سے بہت بڑی تھی۔ یہ سب ذیلی عمارتیں سکھائی ہُوئی اینٹوں یا کہگل سے بنائی گئی تھیں اور پُختہ اینٹیں صرف سجاوٹ، آرائشی حاشیوں اور دیگر تعمیراتی جُزئیات کے لئے استعمال کی گئی تھیں۔ ایک کمرے کو دوسرے کمرے سے مربُوط کرنے والی محرابیں بھی کچّی اینٹوں سے بنی تھیں جو ایک مرکز سے چلتی تھیں اور صرف ان کی دیواروں کے نچلے ردّے پُختہ اینٹوں کے بنے ہُوئے تھے لیکن کھنڈرات اور مینار کے گرد کی زمین عمارتوں کے گرے ہُوئے مواد سے اِس طرح بھری پڑی ہے کہ دیواروں کے نچلے حصّوں کو کھدائی کے بغیر نہیں دیکھا جاسکتا۔ مینار اور اس کے ذیلی کمروں کو ایک دیوار صحن سے جُدا کرتی تھی۔ اِس کھنڈر کے گرد بہت سی چھوٹی چھوٹی عمارتیں تھیں اور جن دنوں میں یہ تعمیر ہُوا اُس وقت مینار اور شہر کے درمیان کی زمینوں پر مکانات، باغات اور کشت زار تھے جو اُن نہروں کے کناروں پر تھے جو ہلمند کا پانی اِس علاقے تک لاتی تھیں۔

قرب وجوار کی عمارات

مینار کے اِردگرد کھنڈرات کے شمال میں (جو بہت گنجان آباد تھا) زمین پکّی اینٹوں اور ظرف پاروں سے ڈھکی ہُوئی ہے اور ہر جگہ قدیم مکانوں کے نشانات نظر آتے ہیں۔ مینار سے ایک میل دُور ایک ڈھیری ہے، اِس کے مغرب کے کچھ شمال میں، جو ایک قلعہ بند عمارت کا کھنڈر ہے۔ یہ غالباً کسی جاہ وحشمت کے خاندان کی حویلی ہے۔ دیہہ قاسم آباد اِس ڈھیری سے ایک میل پرے ہے جو اسی سمت پر ہے جس پر ڈھیری مینار سے ہے۔ یہ حویلی ایک کشادہ صحن کی شمال مغربی طرف واقع تھی اور صحن کے اندرُونی طرف خدّام کے کمرے تھے جو اِس خاندان سے وابستہ تھے۔ عمارتیں ہَوا کے رُخ پر ہیں۔ یہ دو منزلہ تھیں اور ان سے کوئی بیس تیس فٹ پرے ایک بیرونی حفاظتی دیوار تھی جو دیوار ہائے صحن کے گرداگرد ایک مسقّف راستہ بھی تھا۔ اِس پورے احاطہ کا بیرونی رقبہ کوئی ۴۰۰۰۰ مربّع فٹ تھا۔ اِس ڈھیری کے قریب ہی دیگر مکانات کی

بُنیادی کرسیاں نظر آتی ہیں جو پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی ہیں۔ یہ مکانات حویلی کے اِردگرد تھے۔

مینار کی جسامت

مینار کا بلند ترین حصّہ موجودہ زمینی سطح سے ۵۰ فٹ اونچا ہے۔ بنائے گئے کے اندرونی شہر کے مینار کے برعکس قاسم آباد ایک اُسطوانی مینار ہے جو ۱۸ فٹ مربّع کُرسی پر کھڑا ہے۔ اس کا عمودی ستون چوٹی کی طرف بتدریج پتلا ہوتا جاتا ہے اور مدوّر مینار کا کُل قطر بنیاد پر ۱۸ فٹ ہے۔ اب کُرسی ملبے سے صرف ایک فٹ یا اُس کے قریب اُونچی رہ گئی ہے جو ایک ڈھیری بن گئی ہے۔ کُرسی کی اینٹیں عمُودی ہیں جو ایک آرائشی ردّے کی صورت میں چاروں طرف موجود ہیں تاکہ سپاٹ تعمیر کی یکسانیت کا تاثر دُور ہو سکے۔ دروازہ شمال کے رُخ پر تھا اور راستے کے دائیں طرف ایک چکّردار اور تنگ زینہ مینار کے اندر بنا ہُوا ہے جو کوئی ۴۰ فٹ کی اُونچائی میں پُورے دو چکّر کاٹتا ہے۔ بنیاد پر کسی وقت ایک ٹھوس ستون کھڑا تھا جو زمین سے ۱۰ فٹ سے زیادہ اونچا نہ تھا اور اس پر دیوار کے باہر سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ تباہ ہو چکا ہے اور دیواروں سے صرف کہیں کہیں اس کی اینٹیں نظر آتی ہیں۔

مینار کے کتبے

عمود کی بیرونی طرف آرائش سے بالکل معرّا ہے سوائے ایک چوڑی پٹّی کے جو آرائشی حاشیئے کے دو خطوط کے درمیان عمود کے گرد گھومتی ہے اور جس پر عربی حروف کا ایک کتبہ ہے۔ کتبہ کے حروف پکّی اینٹوں کے ہیں جن کو خاص طور پر ڈھالا گیا ہے اور حروف کوئی ۱½ فٹ اونچے ہیں۔ اس کے اوپر عمود پھر بے آرائش ہے اور چوٹی کے قریب کتبہ کی دوسری لیکن چھوٹی پٹّی ہے۔ یہ بھی عربی حروف میں ہے۔ اس کے اوپر مینار بے حد آراستہ و پیراستہ تھا۔ جزُئیات خوشنما ہیں اور نقشہ میں بھڑکیلی ہونے کے باوجود بہت فنکارانہ ہیں اور اینٹوں سے نہایت خوبصورت انداز میں بنائی گئی ہیں۔ صرف اعلیٰ ترین قسم کی پختہ اینٹ استعمال کی گئی ہے۔ یہ افقی اور عمودی انداز میں لگائی گئی ہیں اور بہترین قسم کی سروج سے سیمنٹ کیا گیا ہے جس کی پتلی تہیں اینٹوں سے بھی زیادہ

سخت ہیں۔

کتبوں اور آرائشی جزئیات کی اینٹیں نرم حالت میں ایک مخصوص شکل میں ڈھالنے کے بعد نہایت احتیاط سے پکائی گئی ہیں۔ سادہ حواشی کے ردّے ان سے مستثنیٰ تھے۔ عربی حروف کے حصّے علیحدہ علیحدہ ڈھالے گئے تھے اور پھر معمار نے انہیں یک جا کیا۔ بالقصد سادگی کو تزئین کا تاج پہنا دینے کا عام تاثر نہایت عمدہ ہے اور نقاش کا فنی احساس یقیناً بہت ترقی یافتہ تھا اور غالباً اُسے ورثہ میں ملا تھا۔ معمولی سی لغزش آرائش کو غیر معتدل بنا دیتی۔ عمود کی بالقصد سادگی قابلِ قدر ہے اور چوٹی کے قریب آرائشی کام کے بھرپور تاثر کے تضاد سے جاذب ہو جاتی ہے۔

مینار پر موسموں کا عمل

موسموں کا عمل کتبات اور مینار کے گرد کی تعمیراتی جزئیات سے بخوبی نمایاں ہے۔ بادِ صد و بست روز کی زد میں آنے والا حصّہ عمود کی مخالف سمت سے بہتر ہے۔ ہوا نے اس حصّہ کو کم نقصان پہنچایا ہے جبکہ دوسرے حصّے مشرق اور مغرب میں حدّتِ آفتاب اور برودتِ سرما کے باری باری حملوں سے جزوی طور پر اپنے حروف و جزئیات کھو بیٹھے ہیں۔

مینار کا بالائی حصّہ بھی ریگِ باد آوردہ سے کم فرسودہ ہوا ہے۔ حالانکہ نچلے حصّہ کی سطح اس کے عمل سے ہموار ہوگئی ہے۔ اس سے ایک دفعہ پھر ثابت ہوتا ہے کہ تند ترین ہوا کی لائی ہوئی ریت یا گرد بلند عمارات کو صرف چند فٹ زمینی سطح سے اُوپر تک ہی متاثر کر سکتی ہے اور اس کے لائے ہوئے سنگریزے اور ریت کے ڈھیلے (جو لازماً اس کے جلو میں ہوتے ہیں) زمینی سطح سے دس سے پندرہ فٹ سے زیادہ بیرونی حصّے پر اثر افگن نہیں ہو سکتے۔ مُلک کے لوگ کہتے ہیں کہ "ہوا کا زور سب سے زیادہ سطح کے ہی آس پاس ہوتا ہے۔"

کتبات کا ترجمہ

کتبات میں دو سابقہ ملوکِ سیستان کے نام ہیں۔ مندرجہ ذیل اقتباس برٹش میوزیم کے اے۔ جی۔ ایلس سے لیا گیا ہے اور مصنّف صاحب موصوف کا سیستان میں ملنے والے کتبات کے ترجمے کے

لئے بےحد ممنون ہے۔" مینار کے نچلے کتبہ پر تاج الدین ابوالفضل نصر کا نام ہے اور بالائی پر اُس کے پڑپوتے تاج الدین حرب کا۔ غالباً تاج الدین کبیر مینار کو ادھورا چھوڑ کر فوت ہوگیا۔ عرب مؤرخ ابن الاطہر کے مطابق وہ ۵۵۹ھ میں واصل بحق ہُوا۔" تاج الدین کبیر نے ۸۰ سال حکومت کی اور چونکہ اُس کے حاکم بالا سلطان سنجر سلجوقی کا زوال اُس کے دَور کے اواخر میں شروع ہُوا، لہٰذا اُس نے مینار کی تعمیر اپنے دَور اور زندگی کے آخر میں شروع کی۔ اُس کا پڑپوتا تاج الدین حرب ۶۱۲ھ میں فوت ہُوا۔ چونکہ اُس کا دَور ابتلا و اِنتشار کا دَور تھا لہٰذا تاج الدین صغیر سے شاید ہی کسی عظیم کارنامے کو مکمل کر سکتا تھا۔ اِس بنا پر مینار وسط چھٹی صدی ہجری (بارھویں صدی عیسوی کا رُبع آخر) کا ہی ہو سکتا ہے یا زیادہ سے زیادہ ساتویں صدی کے نصف اوّل کا۔

مینار کا مقصد

مینار ایک مقدّس جذبے کے تحت بنایا گیا اور یہ کسی مذہبی درس گاہ کا حصّہ تھا جو کسی مشہور روحانی پیشوا نے سابقہ ادوار میں شروع کی ہوگی۔ چھوٹے کمرے غالباً اساتذہ کے تھے جو انصرام و اہتمام کرتے تھے اور مذہبی و عمومی تعلیم دیتے تھے۔ احاطہ میں ایک مدرسہ تھا اور صحن کے شمال مغرب میں ایک مسجد بھی جو نماز اور تعلیم کے لئے اِستعمال ہوتی تھی اور اب سب سے بڑی ڈھیری کی شکل میں موجود ہے۔

مینار اور تخت پُل

تخت پُل کے مقابلہ پر مینار میں تعمیراتی مہارت زیادہ نمایاں ہے۔ موخّر الذکر کی دیواریں زمینی بنیاد پر ۲½ فٹ سے زیادہ موٹی نہیں ہیں بوجہ انسانی دستبرد کے۔ کیونکہ لوگ اِس کا بہترین سامان تعمیر اُکھیڑ کر لے گئے۔ مینار کے مقابلہ پر تخت پُل بہت پرانی تعمیر ہے جب فنِ تعمیر ابھی ابتدائی تھا۔

مینار کا مقابلہ مینارِ سبزوار سے

۱۸۷۲ء کے مشن کی رپورٹ میں میلِ قاسم آباد اور میلِ سبزوار کا خوب مقابلہ کیا گیا ہے۔" سبزوار سے پانچ میل دور خسرو گرد کا مینار ہے جس کی طرف پہلے اِشارہ کیا گیا ہے۔ یہ کوئی ۱۲۰ فٹ اونچا مدوّر

مینار ہے، پختہ اینٹوں کا بنا ہوا جس کے اندر چھت تک جانے والی سیڑھی صرف اتنی ہی چوڑی ہے کہ ایک آدمی اس پر چڑھ سکے۔ اس کے بیرونی حصّہ کے گرد اینٹیں وقفے وقفے سے ترتیب دی گئی ہیں تاکہ ایک کوئی کتبہ بن سکے۔ یہ کافی پرانا ہونے کے باوجود بہترین حالت میں ہے جو ہنوز سلامت مربع بنیاد پر ایستادہ ہے اور جواب (۱۸۷۱۔۷۲) قریباً چھ فٹ گہری ہے۔ اس کی اینٹیں گچ سے جوڑی گئی ہیں اور ظاہری صورت میں یہ سیستان کے میل قاسم آباد سے ملتا جلتا ہے ''
(مشرقی ایران، جلد اوّل، صفحہ ۳۴، ۳۴)۔ لیکن اس میں شک ہے کہ آیا میل قاسم آباد کبھی ۱۲۰ فٹ اونچا ہوگا۔ سیستان میں عمارت کی بلندی ۱۰۰ فٹ ہی ہوتی ہوگی۔

دیباچہ

جب سے یہ حصّہ زیرِ طبع رہا، مجھے پروفیسر اُولف سیین کی حالیہ کتاب "امیرِ بخارا اور اُس کا مُلک" مِل گئی۔ جس میں دیگر قیمتی معلومات کے علاوہ اُس قدیم ایرانی نسل، تاجیک کا اِنتہائی مفید ذِکر ہے جسے اُس نے بُخارا کے مشرقی اور پہاڑی اضلاع کی وادیوں اور مغربی حصّہ کے کُشادہ میدانوں میں آباد پایا۔ مَیں نے پروفیسر موصوف کے بیان تاجیک کو ضمیمہ سوئم میں شامل کرنے کی جسارت کی ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ مَیں ایم۔ اُجفلوی کی کتاب "ہندوکش کے شمال و جنوب کے آریہ" کا کوئی نُسخہ حاصل نہ کر سکا جو حوالے کے لیے انمول اہمیّت کا حامل ہوتا۔

جی۔ پی۔ ٹیٹ

حصّہ چہارم

سیستان کے باشندے

تاجیک، جاٹ؟ گوجر اور؟ اہیر

سیستان کے باشندے

باب اوّل

تعارف

سیستان میں بشر پیمائی کے مشاہدات کی اہمیت:-

یہ بہت دلچسپ ہوتا اگر ۰۵-۱۹۰۳ کے مشن کے دوران قیام میں پیمائش بشری محدود پیمانے پر ہی ممکن ہوتی۔ اس قسم کی وسیع پیمانے پر تحقیقات مفاد پرست اور بدنیت افراد کو لوگوں میں خوف دہراس پھیلانے کا موقع دے دیتی لیکن چند مختلف افراد کی پیمائش یقیناً سُود مند ہوتی اور ہندوستان اور وسط ایشیا میں کی جانیوالی تحقیقات کے درمیان رشتہ کا کام دیتی!

اہل سیستان کے اس مختصر حال میں میں نے ان تمام رُدایات کو قلمبند کر دیا ہے جو میں نے کئی سال تک سیاحت اور قبائل کے ساتھ رہنے کے بعد حاصل کی تھیں اور پھر وہ نتائج اخذ کئے ہیں جو ان روایات سے مترشح ہوتے ہیں اور معقول ہیں۔ یہ نتائج محض بشر پیمائی سے اخذ ہونے والے نتائج سے کم پختہ اور کم محکم نہیں ہیں[1]۔

---

[1] عام عقیدہ کہ سر کی شکل ایک انتہائی مسلسل اور دیرپا خاصہ ہے جو آب وہوا اور طبعی ماحول کے اثرات کو رد کرتا ہے"۔ (ہندوستان کے لوگ۔ سَر ایچ رسلی' ۱۹۰۸' ص ۲۶) فرانز بوآس کی تحقیقات

مَیں یہاں اُس روشنی کی دو مثالیں دُوں گا جو قبائلی روایات ان قبائل کے ماخذ پر ڈالتی ہیں جن میں یہ سینہ بسینہ متحرک رہی ہیں۔ بہت سال پہلے مَیں نے جمبے سے ریاست مارواڑ (جودھپور) کے راستے سندھ کی حد یعنی ضلع تھار پارکر تک سفر کیا۔ مارواڑ کے ضلع سنچور میں مجھے ایک خانہ بدوش قبیلہ اور یا اوڈ[1] کے کئی گروہ ملے۔

اور یا اوڈ اور قدیم اور یطائی :-

یہ لوگ علاقائی زبان سمجھتے تھے گو آپس میں اپنی مخصوص زبان بولتے تھے اور اُن کے

سے غلط ثابت ہوگیا ہے جو کولمبیا یونیورسٹی میں بشر پیمائی کے پروفیسر تھے۔ مَیکلیور میگزین جلد سی و پنجم مئی ۱۹۱۰ میں ایک مقالہ ہے بہ عنوان "ہمارے نو آباد کاروں کے کاسہ ہائے سر" اس میں پروفیسر موصوف اور ان کے معاونین کی تحقیقات کا ذکر ہے جس کے نتائج کا خلاصہ یوں ہے "صغیر الرّاس یہودی طویل الرّاس بنتے ہوتے، طویل الرّاس اہلِ الصّقلیہ صغیر الرّاس بنتے ہوئے۔ جسمانی نمونوں میں بنیادی تبدیلیاں" انسانی کھوپڑیاں بھی انسانی جسم کے دیگر حصّوں کی مانند ماحول کے زیرِ اثر تغیّر پذیر ہوتی ہیں۔

ایشیا میں اسلام کی اشاعت نے ان تمام قیود کو توڑ دیا جو اسے قبول کرنے والی نسلوں میں مخلوط شادیوں کے سلسلہ میں موجود تھیں اور موجودہ آبادی میں مختلف نمونوں کا امتزاج پیدا کر دیا لہٰذا اب ان کی تمیز نسل سے زیادہ سیاست اور پیشہ کی بنا پر کی جاتی ہے۔

[1] خانہ بدوش اوڈ مغربی ہندوستان کے باشندے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اپنے خاندانوں سمیت مٹی کے کام کی تلاش میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے کام نہیں کرتے بلکہ سڑکوں، نہروں، ریلوے وغیرہ کے ٹھیکوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ مٹی اور گھاس پھوس سے بنی ہوئی کچّی اینٹوں سے مکانات بناتے ہیں اور کنواں یا حوض بھی کھودتے ہیں۔ وہ ہمہ خور ہیں اور گو مغرب کی طرف اکثر مسلمان ہیں تاہم وہ راندۂ معاشرہ رہتے ہیں۔ اُن کی زبان اوڈ کی ہے جسے مَیں بالکل نہیں جانتا لیکن جو غالباً ان کے منبع کی زبان ہے، وہ عموماً اُونی کپڑے یا کم از کم ایک اُونی کپڑا ضرور پہنتے ہیں۔ وہ بھاگیرتھ نامی کو اپنا مورث اعلیٰ سمجھتے ہیں جس نے قسم

متعلق پوچھنے پر اُن کے معتبر نے بتایا کہ کسی وقت وہ اُس ملک میں ایک "راج" تھے جس میں ہنگلاز واقع ہے۔ لفظ راج زمینی ملکیت اور سیاسی اثر و رسُوخ کا مظہر ہے اور ہنگلاز ایک مشہور زیارت ہے جہاں موجُودہ ہندو یاترا کے لئے جاتے ہیں۔ یہ تیرتھ دریائے ہنگول کے دائیں کنارے پر ہے۔ ایک تنگ گھاٹی میں جہاں سے اُس کا پانی آخری سلسلۂ کوہ سے گذر کر بحیرۂ عمان میں گرتا ہے۔ لفظ اور آج بھی اور ماڑہ (ہنگول کے دہانے پر سمندر پر واقع ایک گاؤں یا قصبہ) اور ہور قلات[1] کے ناموں میں موجُود ہے جو اور ماڑہ سے کوئی پچاس میل شمال مغرب میں وادی کولواہ کا ایک گاؤں ہے۔ اُیریئن کے مطابق اسی علاقے میں سکندر کا سامنا اوریطائی سے ہُوا۔ کیا اور یا اوڈ انہی لوگوں کے باقیات ہیں؟ ہنگلاز عندھ کی مغربی سرحد سے سڑک کے راستے کوئی .. امیل ہے اور سبیلہ میں واقع ہے۔ جس علاقے میں اور یا اوڈ کسی وقت رہتے تھے اُس کا واضح نام ہے اور یہ ضلع کیچ تک پھیلا ہوا ہے۔ موجودہ اور یا اوڈ کی اوریطائی سے تطبیق دیگر مشابہ ناموں کی نسبت بہتر بنیاد پر اُستوار ہے۔

سیستان میں خواجہ عمران کی روایت بھی کاشانی قبیلے کے ماخذ پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔ کاشانی سیستان سے قلات اور ضلع پنجگور سے جنوبی افغانستان میں قندھار تک پھیلے ہوئے

کھائی تھی کہ وہ ایک کنوئیں سے دو بار پانی نہیں پیئے گا لہٰذا وہ ہر روز ایک کنواں کھودتا تھا حتٰے کہ ایک دن وہ کنواں کھودتا ہی گیا اور کبھی باہر نہ نکلا۔

اسی کے ماتم کے لئے وہ اُون پہنتے ہیں اور اسی کی تقلید میں وہ اپنے مُردوں کو دفن کرتے ہیں خواہ وہ ہندو ہوں۔ وہ شادی ہندو رسومات کے مطابق کرتے ہیں۔ بھاگیرتھ کے دوبارہ ظہور تک وہ بے خانماں رہیں گے۔ وہ راجپوت اور کھشتری بتائے جاتے ہیں اور مارواڑی سمجھے جاتے ہیں۔ وہ رام اور شو کے پرستار ہیں (پنجاب کا نسلیاتی خاکہ، ۱۸۸۳، باب چھٹا، ۵۷۳)

[1] ہور قلات یا قلعۂ ہور (اور یا اوڈ؟)

ہیں۔ عمران کو حمزہ (آنحضورؐ کے چچا) اور نوشیرواں کی پوتی کا بیٹا سمجھا جاتا ہے۔ مذہبی معلّم کا پیشہ اختیار کر کے عمران بہت سی سرزمینوں میں گھومتا رہا۔ حتیٰ کہ سیستان میں متمکن ہو گیا جہاں اُس نے ایک رباط بنوایا۔ اُس کے ہمسائے اَشگ کا پُترا تھے' جو کافر تھے اور جن کا سردار سار و تار میں رہتا تھا۔ لیکن سردار نابالغ تھا لہٰذا اُس کا چچا اس کا سرپرست تھا اور عمران کے رباط کے پاس ہی قلعہ چہل بُرج میں رہتا تھا۔ موخرالذکر اور اُس کے کافر ہمسایوں کے درمیان ٹھنی رہتی تھی۔ ایک دن انہوں نے مرد پارسا پر اچانک حملہ کر دیا جب وہ اپنی بہن اور اپنے خادم کے ہمراہ مصروفِ نماز تھا اور کفار نے ان تینوں کو تہ تیغ کر دیا۔ زیارت خواجہ عمران سے موجودہ کاشانی بچتے ہیں۔ دیگر سیستانی زیارت پر بصد عجز و نیاز حاضر ہوتے ہیں لیکن کوئی کاشانی قریب پھٹکنے کی جرأت نہیں کرتا' مبادا کوئی گزند پہنچ جائے۔ وجہ یہ ہے کہ کاشانی "اُشگ کا پُترا" کے وارث ہیں' جنہوں نے خواجہ عمران کو قتل کیا تھا' لہٰذا اپنے آباؤ اجداد کے سوءِ عقیدت اور پامالیٔ تقدس کی وجہ سے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شہید کی فیض گستری سے محروم ہو گئے۔

اشگ کا پُترا اصطلاح بَنی اُشگ کی آریہ شکل ہے جو عرب وقائع نگار اہلِ پارتھیا (پہلویں) کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم اس معتقد علیہ روایت سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ کاشانی پارتھیوں (یا ہند پارتھیوں) کی اولاد ہیں اور وہ سیستان میں ورود اسلام کے ابتدائی سالوں تک یہاں کافی قوت و اقتدار کے مالک تھے۔

سیستان میں ہندو مذہب:۔

سیستان میں ہندو مت کی موجودگی کے امکان کے سلسلہ میں صرف کشن بابل کی روایت ملی۔ سار و تار میں مجھے ایک چھوٹی سی مہر ملی جس پر دو ہندوستانی گوہان دار بیل اور ناگری سے ملتے جلتے ہندوستانی (سنسکرت ؟) رسم الخط میں دو حروف کندہ تھے۔ میں نے اس خود یافتہ مہر کے علاوہ کچھ بڑی بڑی مہریں بھی دیکھیں جو سب سار و تار سے منسوب کی جاتی تھیں۔ لیکن یہ جگہ صرف چودھویں صدی کے اواخر تک آباد رہی اور ہو سکتا ہے کہ مُہریں ہندوستانی تجار یا دیگر ہندوستانی

باشندوں کی ہوں جو وہاں مقیم رہے ہوں۔

بدھ مت کے آثار اور روایات:۔

سیستان یا پنجگور یا کیچ میں بدھ مت کے کوئی آثار نہیں ملے۔ سارو نار کے نزدیک بعض کھنڈرات فاصلے سے سٹوپے معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ بڑے نہیں تھے۔ ان میں سے ایک بھٹے کی اینٹوں کا بنا ہوا تھا لیکن ارباب سیف الدین نے بتایا کہ یہ ایک غلہ دان تھا جسے بالائی سوراخ سے بھرا جاتا تھا۔ چونکہ کھدائی نہ کی جاسکی لہٰذا اس کا بھی کوئی ثبوت نہ مل سکا۔ لیکن سیستان کے ملحقہ علاقے میں کچھ مقامات کے ساتھ ایسی روایات وابستہ ہیں یا کچھ اسمائے ایسے ہیں جو ناگاؤں (چشموں کے دیوتا) کی روایات سے متعلق معلوم ہوتے ہیں جو پانچویں اور ساتویں صدی عیسوی میں ہندوستان آنیوالے چینی سیاحوں کے دستاویزات کے تراجم میں اکثر مذکور ہیں۔ دو جگہوں پر یعنی ضلع پشین میں گلستان کے قریب سپین تژہ اور خاران کے مشرق میں گُمرغ میں ایک مہاناگ کی روایات دریافت ہوئیں اور ان دونوں جگہوں پر ایک ایک مشہور دائمی چشمہ تھا۔ پنجگور اور کیچ کے اضلاع میں اور ان دونو کے درمیان وادیٔ بلیدہ میں ایسے مقامات ہیں جن کے نام ناگ ہیں اور ہر جگہ دائمی چشمہ ہے جو ہمیشہ رواں رہا ہے۔ ان میں سے ایک پنجگور کے مشرق میں ۸۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ دوسرا کیچ سے ۴۰ میل مشرق میں اور تیسرا وادیٔ بلیدہ میں قلعہ چپ سے کوئی بائیس میل شمال مغرب میں زامران پہاڑیوں کے عین دامن میں ہے۔ اس نام کے دیگر مقامات اس علاقے میں نہیں ملے حالانکہ ان چشموں کے علاوہ اور چشمے بھی ہیں جو وقت نامعلوم سے رواں ہیں۔

بالائے زمین طریقہ تدفین:۔

کسی زمانے میں سیستان میں مُردوں کو بالائے زمین دفن کرنے کی رسم تھی جو حال ہی میں متروک ہوگئی ہے۔ یہ شاید مذہب زردشت کا رہا سہا اثر تھا[1]۔ بالائی طبقوں یا خاندانوں

---

[1] تاکہ ناپاک لاش زمین سے مَس نہ کرسکے۔

کی قبریں پہلے وقتوں میں بھٹے کی اینٹوں اور گچ سے بنائی جاتی تھیں۔ کافی طول وعرض کا ایک چبوترہ بنایا جاتا تھا۔ اور اس پر لاشیں رکھ کر اسی مواد سے انہیں دیوار بند اور مسقّف کر دیا جاتا تھا۔ یُوں بنائی ہوئی قبروں کے بالائی حصّوں پر کسی قسم کی کوئی آرائش نہیں ہے بلکہ وہ ہموار چبوترے ہیں جو زیریں چبوترے سے کوئی ۲½ فٹ اُونچے ہیں۔ بالائے زمین قبروں کے بڑے بڑے مجموعے اُوپر سے کھُلے ہوتے تھے لیکن چھوٹے چھوٹے مجموعے عموماً گنبدیں چھت کے مقابر کے اندر ہوتے تھے۔

بتایا جاتا ہے کہ بالائے زمین تدفین کی رسم اب بھی ژوب کے کاکڑ افغانوں کے بعض قبائل میں موجود ہے۔ وہ لاش کے پاؤں سے ذرا آگے قبر میں ایک چھوٹا سا سوراخ بنا دیتے ہیں اور مخصوص ایّام میں افراد خاندان مُردوں کے ماتم کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ چہار شہر میں سنگ و خشت سے بنی ہوئی ایک الگ تھلگ قبر میں یہ سوراخ آٹھ انچ مربّع پایا گیا ہے۔ ایسی قبروں کے لئے گچ کا کام عدم دستیابی کی وجہ سے سیستان میں کوئی ۵۰۰ سال پہلے ترک کر دیا گیا۔ چہار شہر میں سنگ و خشت کے مزار غالباً ۵۰۰ سال سے زیادہ پرانے ہیں اور سقوط زاہدان (جنوری ۱۳۸۴) سے پہلے دَور کے ہیں۔ ان مزاروں کے پاس ہی متعدّد کنوئیں ہیں جن میں کہیں کہیں سنگ و خشت بھی کام میں لائے گئے ہیں۔ بعد کے بالائے زمین مزار سکھائی ہوئی اینٹوں اور مٹّی کے گارے سے بنے ہیں اور یہ کہیں اُوپر سے کھلے اور کہیں گنبدیں مقابر میں ہیں۔ لیکن اوّل الذکر بہت جلد تباہ ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے بعض فرسودگی کا شکار ہو گئے ہیں اور ان میں مدفون ڈھانچے نظر آتے ہیں، جیسے غلغلہ میں[۱]۔

---

[۱] میں نے سنگ و خشت کے کئی مزار کھول کر دیکھے اور مجھے ان میں صرف مٹّی اور ہڈیوں کے چند چھوٹے چھوٹے ٹوٹتے ہوئے ٹکڑے ملے جو ایسے مزاروں کی قدامت کا حتمی ثبوت ہیں۔ البتہ پنڈول کے مزاروں میں بعض ڈھانچے صحیح سالم ملے اور بعض میں لاش کے حصّے واضح تھے۔ طریقۂ تدفین یہ تھا کہ لاش کو ایک خاص حالت میں رکھ کر مزار تعمیر کیا جاتے۔ جی۔پی۔ٹی

ترکِ رسم کی ممکنہ وجہ :-

ترک رسم کی وجہ غالباً نو واردوں کی آمد ہے۔ ثانیاً اس لئے بھی کہ زمین میں قبر کھود کر لاش کو دبا دینا اور اسے مٹّی سے بھر دینا بالائے زمین مزار کی تعمیر سے بہت آسان ہے۔ بالائے زمین تدفین کی آخری مثال ۱۹۰۳ میں وقوع پذیر ہوئی جب ملک گلزار خان کو ایسے ہی دفن کیا گیا۔ بالائے زمین مزارات کا رُخ اسلامی رواج کے مُطابق مشرق طرف رکھا جاتا ہے۔

کوہ خواجہ :-

کوہ خواجہ کی ڈھلان پر واقع شہر کا خاکی پُشت کی طرف قدیم قبرستان میں بالائے زمین مزارات پتھّروں سے بنائے گئے ہیں جو چکنی مٹّی کے گارے سے جوڑے گئے تھے۔ یہ طریقۂ تدفین عام تھا اور بالائی طبقوں تک محدُود نہ تھا۔

بَاب دوم

تاجیک یا مشرقی ایرانی نسل :-

خراسان میں تاجیک کو زمین کا اصلی مالک سمجھا جاتا ہے اور یہاں کے قدیم باشندوں کا موجودہ نمائندہ بھی گردانا جاتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ تاجیک آبادی میں مشرقی ایرانی یا آریہ نسل ملفوف و مستور ہو جسے چینی تاہیا کہتے تھے اور جو قابل زراعت علاقوں میں آباد تھی اور جس کی دریائے جیحوں کے دونوں کناروں اور خراسان بھر میں گنجان آبادی تھی۔ یہ آبادی تیرھویں صدی عیسوی کے ربع اول میں چنگیز خانی لشکروں کے حملوں تک برقرار رہی۔" چانگ کین کے روزناچوں سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ تاہیا یا باختری فرغانہ اور آنسی (پارتھیا) کے مابین دیگر قبائل کی مانند تھے۔ یہ لوگ مختلف بولیاں بولنے کے باوجود ایک دوسرے کو سمجھتے تھے۔ یہ تمام زراعت کار تھے، اپنی بیویوں کا بحد احترام کرتے تھے اور انہیں بہت آزادی دیتے تھے۔ اور اپنی

لہ " باختر قدیم الایام سے پنجاب میں باختری یونانی حکومت کے خاتمہ تک"۔ ہیر یونیورسٹی کا انعامی مضمون ۱۹۰۸ تحریر کردہ ایچ۔ جی۔ رالنسن ایم اے۔ " ہندوستان قدیم کی ایک تاریخ" از ونسنٹ سمتھ، لندن ۱۹۰۸، دوسرا ایڈیشن، ص ص ۲۳۴ تا ۲۵۸، دیکھئے ضمیمہ سوم.... چانگ کین یوچی کے پاس چینی دربار کا سفیر تھا۔ وہ کئی مہمات کے بعد ۱۲۵ ق م کے قریب وطن واپس آگیا۔

" ہندوستان قدیم کی ایک تاریخ "

گھنی داڑھیوں اور عمیق آنکھوں کی وجہ سے ممیز ہو سکتے تھے۔ وہ ناکارہ اور بزدل سپاہی تھے۔ اور صرف تجارت کے رسیا تھے۔"

شکل و شباہت اور عادات:۔

دیہی برادریوں کی صورت میں پُر امن زندگی اور پُر سکون پیشے ہمیشہ سے اس نسل کا طُغرائے امتیاز رہے ہیں۔ یہ خواص اور ان کے خوبصورت خد و خال چینی سفیر نے دو ہزار سال سے بھی پہلے دیکھے اور ایک حالیہ سیاح کی توجہ بھی ان پر مرکوز ہوئی[۱]: "مجھے ایک روسی کی بات یاد ہے کہ بخارا میں تاجیک نسل کی اکثریت نے ہی خانِ بخارا کو زار کے سامنے بلا مزاحمت گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا[۲]۔"

مزید یہ کہ "تاجیک کو کم از کم ہمارے جمالیاتی نظریات کے مطابق اچھے نقوش کے لئے امتیاز حاصل ہے۔ وہ اپنے ایرانی آباؤ اجداد کے واضح نقوش اور سیاہ، پُر اظہار آنکھوں کا مالک ہے[۳]۔"

تاجیک، ایک کلمۂ اہانت آمیز:۔

تاجیک کی امن پسندانہ زندگی نے اسے ہمیشہ قانون کا طرفدار رکھا ہے لہٰذا اس پر حکومت کرنا آسان رہا ہے لیکن اس کی وجہ سے وہ ایک نکما سپاہی رہا ہے اور مشرقی تواریخ میں

---

[۱] روسی ترکستان میں ایشیا کا ایک باغ اور اس کے لوگ" از اَیبنٹ ایم۔ پی میکن مصنف "ایک فیتۂ آہنی" فیلو آف دی اینھرو پولوجیکل انسٹی ٹیوٹ آف گریٹ برٹین اینڈ آئرلینڈ، لندن ۱۹۰۳ء" وادی جیحوں (بدخشاں) کے تاجیک" از کیپٹن جان وڈ بھی دیکھئے جو اس نے جیحوں کے منابع دریافت کرنے کے دوران لکھی۔

[۲] ایضاً، ص ۹

[۳] ایضاً، ص ۱۰

لفظ تاجیک حقارت سے ایک مردِ امن، محض ایک غیر فوجی۔ ایک بیکس کا مترادف بن گیا ہے۔

نسل کا دیرپا کردار:-

امن پسندی کے باوجود شاذ و نادر ہی دیگر ایشیائی نسلیں تاجیک کی طرح دیرپا ثابت ہوئی ہیں۔ جہاں کہیں قابلِ کاشت زمین ہے اور پانی دستیاب ہے تاجیک اس زمین سے چمٹا ہوا ہے جو اس کے آباؤ اجداد کاشت کرتے رہے ہیں۔ بُری حکومت یا لاقانونیت ان لوگوں کو نہ مٹا سکی اور نہ زمین بدر کر سکی۔ انہوں نے سیتھی اور ترک حملے برداشت کیے۔ ان کے آقا یونانی اور عرب فاتحین اپنا تشخص کھو بیٹھے اور مفتوحہ آبادیوں میں جذب ہو گئے، لیکن تاجیک اب بھی ایک جُداگانہ نسل ہے۔[1]

تاجیک کی قدر و قیمت:-

زراعت کاری اور علم آبپاشی میں تاجیک کو تخصص حاصل ہے۔ صحرائی عرب فاتحین نے ان معاملات میں کورے ہونے کی وجہ سے ممالک محروسہ کا مالیاتی نظم و نسق اور ایسے دیگر معاملات بخوشی غیر جنگجو تاجیک کے ہاتھ میں رہنے دیئے اور عسکری کارروائیاں اور سیاسی اقتدار اپنے ہاتھوں میں رکھا۔ شاید یونانی سپاہیوں نے بھی ایسا ہی کیا ہو لیکن درشت ترک اور منگول فاتحین نے یقیناً ایسا کیا۔ لہٰذا تاجیک ایک مفید شخص بن کر رہا اور پرلے درجے کی اوباش مشرقی حکومت نے بھی اپنا ظلم اس حد تک نہ بڑھایا کہ مصیبت کا مارا، امن پسند تاجیک

---

[1] یونانی فوجی آبادکاروں نے گرد و پیش کی نسلوں سے باہم شادیاں کرلیں۔ بکٹوں میں آخری باختری بادشاہوں کے نقوش میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ اسی مقامی مشرقی خون سے آمیزش کا نتیجہ ہے۔ ابتدائی عرب فاتحین نے بھی تاجیک اور دوسری عورتوں سے شادیاں کرلیں۔ یہ عموماً رابطہ یا چوکیوں میں متعین ہوتے تھے۔ عرب قبائل کی خراسان میں عام ہجرت بعد میں ہوئی اور صرف چند اضلاع تک محدود رہی۔

زمین چھوڑ کر ہی بھاگ جاتا۔

بدیشی خون کی آمیزش سے تغیّر و تبدّل :-

اس نسل کے مختلف آقاؤں نے اس پر اپنے شوخ یا مدھم نقوش چھوڑے ہیں۔ لیکن جسمانی ساخت اور نقوش میں تبدیلی کے باوجود انہوں نے گردشِ ایام کے دوران اپنی سیرت اور اپنی زبان ہو بہو قائم رکھی ہیں۔ اُن کی زبان آج بھی فارسی ہے۔ اُنہیں دہقان کہا جائے یا دہوار، ارباب کہا جائے یا تاجیک، تات کہا جائے یا سارت[1]۔ وہ عملاً بدلے نہیں اور اپنے تُرک، منگول یا افغان ماخذ کے خانہ بدوش اور حکمران قبائل سے ہمیشہ بحیثیت فارسی دان ممیّز رہے ہیں: تاجیک اپنے آقاؤں کی زبان سمجھتا ہے۔ زراعت کے علاوہ ان میں تجارت اور دیگر معاملات کا ملکہ ہے۔ ایک موروثی ذہنی طباعی اسے کم متمدن ہمسایوں سے افضل بنا دیتی ہے اور گو وہ تاجیک سے نفرت کرتے ہیں تاہم وہ تاجیک عاملا یا گماشتوں کے بغیر اپنا تصوّر بھی نہیں کر سکتے[2]۔

تاجیک ماہر انجینئر یا مہندس :-

مذکورہ مصنّف نہروں اور گذرگاہوں کی تعمیر کے لئے ان لوگوں کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہے اور ترکستان میں اس جفاکش نسل کے برپا کردہ حیرت انگیز نظام انہار کو بیان کرتا ہے۔

---

[1] روسی ترکستان میں سارت اُزبک و تاجیک کی مخلوط نسل ہے۔

[2] جب عرب کوئی ایرانی قصبہ یا شہر فتح کرتے تو دہقانوں کو بلا کر پوچھتے کہ وہ اکاسرہ کے تحت کیا مالیہ دیتے تھے اور پھر اتنا ہی مالیہ عاید کر دیتے تھے۔ النُّوَیری (مسودہ لیڈن، ن۔۲۰۔د) تاریخ ساسانیاں میں ان کے ضوابط خراج دیتا ہے۔ یہ ابُو یوسف میں خلفائے عباسیہ کے قانون کے مطابق ہیں۔ چونکہ ساسانیوں نے ماقبل سکندر دَور کے نظام کو سنبھال کیا لہٰذا انہوں نے قدیم ایرانی ادارے زندہ کئے۔ سپرینگر : المسعودی، جلد اوّل،

اُس نے ان نہروں کی گذرگاہ کی قطار بندی کا جو طریقہ بیان کیا ہے وہ حرف بحرف اس طریقہ سے ملتا ہے جو محمدؐ دادی کے مصداق اُس نے سیستان میں نہروں کی نقشہ بندی کے لئے اختیار کیا، اور بزبانِ خود ۱۹۰۳، اور ۱۹۰۴ میں مجھے بتایا۔ یہ طریقہ ایشیا میں تہذیب کی نمود اوّلیں کی طرح پرانا ہے لہٰذا اُسے قلمبند کرنا ہی مفید ہوگا۔

"لیکن ہم خواہ مخواہ پوچھیں گے کہ ایک سارت اُن آلات کے بغیر کس طرح یہ سب کچھ کر لیتا ہے جنہیں یورپی انجینئر ناگزیر سمجھتے تھے؟"

"جواب بہت آسان ہے۔ جہاں گُنیا کی ضرورت پڑتی ہے وہاں سارت اپنی آنکھ استعمال کرتا ہے۔ اگر وہ یہ جاننا چاہے کہ آیا ایک نہر اُس کی زمین یا کھیت کے کسی مخصوص حصّہ تک پہنچائی جا سکتی ہے یا نہیں تو وہ اپنی پُشت کے بل لیٹ جاتا ہے اور اپنی ٹھوڑی اُونچی کرکے اپنی پیشانی کے اُوپر سے اس مقام کو دیکھتا ہے۔ اگر وہ اپنے سر کی اس حالت میں اسے دیکھ سکتا ہے تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ پانی وہاں تک ضرور بہے گا۔"[1]

یہی وہ طریقہ ہے جو بزبانِ محمدؐ دادی اُس نے آزمائشی سطح پیمائی کے لئے استعمال کیا۔ صرف مذکورہ مصنّف کا بیان کردہ تسلسلِ خیالات ضرور اُلٹ ہو جاتا ہے۔ اگر بیان کردہ کیفیت میں ایک آدمی کسی مقام کو اپنے عقب میں دیکھتا ہے تو یہ اُس مقام سے یقیناً بلند ہوگا جس پر وہ لیٹا ہوا ہے۔ نہروں کی سطح کو مزید ہموار اور سیدھا رکھنے کے لئے لوہے یا پیتل کی پانی سے لبریز قاب استعمال کی جاتی ہے۔ میں نے اسے ضلع پشین اور میواڑ (راجپوتانہ) کے بھیلوں میں بھی استعمال ہوتے ہوئے دیکھا ہے جہاں پانی کو زمین کے لہردار خطوط کے گرد کافی فاصلے پر پہنچانا ہوتا ہے۔

---

[1] "رُوسی ترکستان میں" ص ص ۱۲ تا ۱۳۔

کیانی اور مشرقی ایرانی نسل :-

سیستان میں کیانی قدیم شاہان ایران سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا وہ متذکرہ بالا مشرقی ایرانی یا آریہ نسل کے نمونے سمجھے جا سکتے ہیں۔ وہ کافی حد تک ان خصائص کو برقرار رکھے ہوئے ہیں جو اس نسل سے منسوب ہیں۔ اس قدیم خاندان کے معمر ترین زندہ نمائندے "ملک عظیم خان" (۱۹۰۵ میں) نے اپنے نکمے باپ ملک جلال الدین سے اچھے نقوش ورثے میں پائے تھے۔ ملک عظیم خان کے چہرے بشرے میں قدیم حسب نسب سے متوقع مخصوص تربیت کا سُراغ ملتا تھا۔ جو دقیق اور عقابی نقوش، حلقہ ہائے جلی میں نسب غزالی آنکھوں، متناسب کاسہ ہائے سَر خوشنما اور پوری داڑھی، قوی ہاتھ اور ایک متوازن لیکن مختصر جسم (جو اب ضعیفی کی وجہ سے خمیدہ ہے) کے ساتھ مل کر اُسے اس نسل کا کامل نمونہ بنا دیتا تھا۔ البتہ خاندان کے چھوٹے افراد بالخصوص ملک عظیم خان کے بھتیجوں اور دیگر رشتہ داروں میں اُس تنزل کے آثار نمایاں تھے جو بخارا کی شہری آبادی کا خاصہ بن چکا ہے۔

جمالی اور کمالی خاندان :-

جمالی اور کمالی نام کے دو اور خاندان ہیں جو خاندانِ ملوک کے متوسّل و مؤکل ہیں، اور قدیم نسل سے ہی متعلق سمجھے جاتے ہیں اور انہی سے ملوک ماضیہ اپنے خدّام اور ذاتی محافظ چنتے تھے۔ ملوک کیانیہ کی ناجائز اولاد کی کوئی ذات یا قبیلہ دریافت نہیں ہو سکا' جیسے کہ ملوک بمپور اور پنجگور اور کیچ کے گچکی سرداروں کے خاندانوں میں پائے گئے تھے۔ وہاں سرداروں کی ناجائز اولاد' تولک' یا' تونگین' ملوک یا گچکی کہلاتی یعنی گیدڑ ملوک یا گچکی ملوک بمپور کا خاندان تو اب انہی ناجائز اخلاف کی صورت میں زندہ ہے۔

کیانیوں میں پست نسل کی خادمہ یا داشتہ کا بیٹا اپنی ماں کا قانونی عدم استحقاق اور گھٹیا درجہ ورثے میں پاتا ہے۔

اس قدیم نسل کا ایک اور قبیلہ کاخا ہے جسے ہر سیستانی ایک پرانے اور باعظمت ماخذ سے منسلک قرار دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تراکن اور کارکوکے آتشکدوں کیلئے مقدس آگ کے متولی اسی قبیلہ سے لئے جاتے تھے۔ بندیگاہ المعروف بہ بندِ رستم کا معمار بھی اسی قبیلے کا بتایا جاتا ہے۔ بعد کے بندِ بُوالبقا کا بنانیوالا بھی ایک کاخا ہی سمجھا جاتا ہے۔ کوئی ۵۵ سال پہلے جب بندِ سیستان (جس کی حفاظت کے لئے کوھک قلعہ بنایا گیا) بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو ایک کاخا کدخدا شاہ بیگ (کدخدا غلام رضا کاخا کا والد) کو ہی تاج محمد سربندی نے اس کا مہتمم مقرر کیا۔

قندھار، خاش، اور وادئی ہلمند کے ارابیب:-

عربوں کی فتح خراسان سے پہلے علاقہ قندھار پر ایک تاجیک خاندان برسرِ اقتدار تھا۔ جب عرب یہاں وارد ہوئے تو انہوں نے اسی خاندان کے افراد کو یہاں مقتدر دیکھا اور غالباً مالیاتی و انتظامی معاملات انہی کے سپرد کر دیئے۔ اسی وجہ سے انہیں ارباب (آقا) کا امتیازی لقب ملا۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اسی خاندان کی ایک شاخ خاش اور دوسری وادئی ہلمند میں اسی امتیاز و استحقاق کے ساتھ براجمان ہوگئی۔

سیستان میں قلعہ فتح کے ارابیب سے ہی کیانی عمال لئے جاتے تھے اور نادر شاہ بلکہ احمد شاہ درانی کے وقت تک اسی خاندان کا ایک فرد ہلمند سے مالیہ اندوزی کا نگران تھا۔ اسوقت صرف ارابیب خاش کا سربراہ قدرے اس قدیم اختیار و اقتدار کا مالک ہے۔ وہ اس علاقے کا ذمہ دار افسر ہے لیکن وہ گورنر قندھار کے پنجے میں ہے اور افغان باشندے اُسے تاجیک سمجھ کر اُس کی برائے نام ہی عزت و تکریم کرتے ہیں۔

جسمانی ساخت، خدوخال اور عام شکل و شباہت میں ارباب کیانی سے ملتا جلتا ہے اور ان میں سے بعض تو کیانیوں کے خاندانی خواص کے عین مظہر ہیں۔ ایسے ارابیب عموماً معمر افراد ہیں جنہوں نے اچھے دن دیکھے ہیں۔ ان کے نوجوان افراد افغانوں کے سائے

تلے دبے ہوئے ہیں۔ وہ وحشی، جاہل اور غلامانہ اطوار کے مالک ہیں۔

پہلوان :-

پہلوان ایک اور سیستانی قبیلہ ہے جو قدیم ایرانی نسل پارہ ہے۔ اس کے افراد اربیب اور کیانیوں کی طرح عقابی نقوش اور متوازن کاسہ ہائے سر کے مالک ہیں۔ لہٰذا ان خصائص کو ہم قدیم ایرانی نسل کے خصائص کہہ سکتے ہیں۔

تواجیک کے قبائلی نام :-

یہ نسل مختلف قبائل میں منقسم ہے جن میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا نام ہے، جیسے گُندا، دیوانا، دادی وغیرہ جو سیستان کے زرعی قبائل ہیں اور خراسان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ جب خاندان کا قبائلی نام گُم یا نامعلوم ہو لیکن یہ پتہ ہو کہ یہ قدیم متعلقہ آبادی سے ہی ماخوذ ہے تو پھر اسے محض تاجیک کہنے پر ہی اکتفا کی جاتی ہے۔

تاجیک اور قدیم جنگی کاروائیاں :-

تاجیک ایک نیم سپاہی رہا لیکن اُس کا جنگی مصرف بھی تھا۔ اُس کا کسرتی اور جفاکش جسم، بیلچہ اور کدال پر قدرت اور نہر کادی کی مہارت اسے مشرقی افواج میں ایک مخصوص مقام دے دیتے تھے۔ وہ قلعہ بندیوں کی تعمیر و مرمت اور محاصرے کی کاروائیوں میں بیحد مُفید تھا۔ بیلچوں اور کدالوں سے مسلّح تاجیک دستے مشرقی عساکر کے موجودہ سفر منیا تھے محصور قلعوں کی مورچہ شکنی کے لئے تواجیک ہی سُرنگیں بچھاتے تھے اور وہی ان قلعوں کے گرد کی آب آلود خندقوں سے پانی نکالنے کے لئے نالیاں بناتے تھے۔

تواجیک بلوچستان میں :-

کچھ زیادہ وقت نہیں گذرا کہ تواجیک سیستان کے ملحقہ علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ جو اَب نیم صحرائی ہیں اور خانہ بدوش بلوچوں سے آباد ہیں۔ وادئ دِزک (ایران کے صُوبہ کرمان کا ضلع بمپور) میں کافی تاجیک آبادی ہے جو اپنے آپ کو دہوار کہتی ہے۔ بلوچوں (جن میں رند، عنصر

زیادہ ہے) میں محصور ہونے کی وجہ سے دونوں کا فرق فوراً نمایاں ہو جاتا ہے ۔ دہوار دیہات کے باشندے ہیں جو پنڈول سے بنے ہوئے مضبوط مکانوں پر مشتمل ہوتے ہیں ۔ یہ مکان ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوتے ہیں اور ان دیہات کے گرد کھیت ہوتے ہیں ۔ لیکن ان کے ہمسائے خانہ بدوش ہیں ۔ جو خیموں یا گدانوں میں رہتے ہیں جو مستقل زیر کاشت رقبے سے پرے ڈھلوان چٹانوں کے ملبے پر یا کھجوروں کے جھنڈ میں گڑے ہوئے ہوتے ہیں ۔ جسم اور اس کی ساخت میں بھی دونوں کا تفاوت نمایاں ہے ۔ قادر بخش ۱۸۸۹ میں دہواروں کا معتبر تھا ، اور وہ بند وقچیوں کا ایک لشکر مہیا ان میں لاسکتا تھا اور گو ۱۸۹۰ میں ضعیف دلاور خان ، ایک نام نہاد بلوچ ، ضلع کا سردار تھا وہ دہوار معتبر کی پشت پناہی کے بغیر کوئی اقدام نہ کر سکتا تھا ۔ لیکن دِزک کے دہواروں کا علاقہ ایک شورش پسند بلوچ آبادی میں گھرا ہوا تھا جہاں ایرانی حکومت کے خلاف اکثر مظاہرے ہوتے رہتے تھے اور چونکہ دہواروں کو بھی مقامی افسروں کی طلب زر کا سامنا تھا لہٰذا وہ قریب کی پہاڑیوں میں ایک پناہ گاہ کے مالک تھے جہاں پوری دہوار آبادی اپنی منقولہ جائیداد کے ساتھ منتقل ہو جاتی تھی اور ناکوں کی حفاظت اس کے جنگجو آدمیوں کے سپرد ہوتی تھی اور وہ اپنے گاؤں ، اور کھیت اپنے دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے تھے ۔

دِزک کے دہواروں کی روایات :-

دزک کے دہواروں کا کہنا ہے کہ وہ خانہ گزین تاجیک آبادی کے باقیات ہیں جو کسی وقت علاقہ خاران میں مقیم تھی اور ہامون ماشکیل کے جنوبی سرے کا علاقہ اب بھی دہوار کہلاتا ہے ۔ جب حالات اتنے بدل گئے کہ وہ خاران کے نشیبی علاقہ میں نہ رہ سکے تو وہ پہاڑیوں ، دِزک اور مستونگ میں منتقل ہو گئے ۔

دہوار یا تاجیک آبادی کے ترک زمین کی وجہ محض سیاسی یعنی بری حکومت یا فتنہ انگیز ہمسایوں کا جبر و تشدد ہی نہ تھی بلکہ اس میں غالباً آب و ہوائی تغیر و تبدل کا بھی بہت ہاتھ تھا ۔ جب ایک طویل دور خشک سالی نے تحت الزمین پانی کی سطح کو نیچے کر دیا اور چشمے اور نالے

خشک ہوگئے تو تاجیک آبادی اپنے زیادہ طاقتور ہمسایوں یا آقاؤں (جو تاجیک کو اپنے دودھیل گائے سمجھتے تھے) کے مطالبات پُورے کرنے کے بعد اپنی زمینی پیداوار سے بسر اوقات کرنے میں ناکام ہوگئی اور چونکہ یہ استحصال بالجبر ہوتا تھا لہٰذا زرعی آبادی اپنے آبائی مقبوضات میں ٹھہرتی تو بھوکوں مرتی یا پھر زمینیں ترک کرکے کہیں اور چلی جاتی۔

تاجیک کردار پر ماحولی اثرات:۔

وادیٔ دزک میں دہواروں کا اثر یُوں نمایاں ہے کہ جب اُن کا قافیہ حیات تنگ ہو جاتا ہے تو وہ پہاڑیوں میں پناہ لیتے ہیں لیکن اس کے سوا وہ ایک مقیم آبادی ہے جو خانہ بدوش اور شبانی ہمسایوں کے درمیان خانہ گزیں ہے اور ان دونو کے مابین اتنا فرق ہے جو دیگر جگہوں پر اتنا نمایاں نہیں ہے۔ لیکن اگر کبھی حالات مانع زراعت ہُوئے (اور یہاں کی تاریخ میں ایسے مواقع اکثر و بیشتر آئے) تو تواجیک کو من حیث الاجتماع اپنے آپکو زندہ رکھنے کے لئے خانہ بدوشی اختیار کرنا پڑی۔ ایسے خانہ بدوش تواجیک چند پشتوں کے بعد اپنے آپ کو ان خانہ بدوشوں کا حصّہ سمجھنے لگتے تھے جو قدیم ادوار سے ہی ایسے چلے آرہے تھے اور مؤخر الذکر بھی انہیں اپنی قبائلی یا سیاسی تنظیم کا حصّہ سمجھنے لگتے تھے اور وہ علاقے کی نسبت سے 'بلوچ' یا 'براہوی' شمار ہونے لگتے تھے۔

لیکن سیستان میں یہ عمل اس کے برعکس تھا۔ ہلمند کے ڈیلٹا میں قابل کاشت زمین اور پانی ہمیشہ فراواں فراواں رہے ہیں لہٰذا نو وارد تاجیکی طرز حیات کو اپنا لیتے تھے۔ مسلّمہ طور پر عرب ماخذ کے قبائل از قبیل سربندیٔ شاہرکی، میران اسکل اور میران چکانسر اور بعض بلوچ ماخذ کے قبائل اب اپنے ہمسایوں سے ممیز نہیں کئے جا سکتے جو بلاشک وشبہ تاجیک الاصل ہیں۔ سیستان کے علاوہ یہ ان علاقوں پر بھی صادق آتا ہے جہاں زمین اور پانی کی بہتات تھی۔

"ایم نالوکن اپنی تاریخ فرغانہ میں اُوزبکوں کو تین حصّوں میں تقسیم کرتا ہے۔ خانہ بدوش، نیم خانہ بدوش اور خانہ گزیں یعنی وہ جنہوں نے تواجیک کو فتح کیا ہے اور پھر انہی میں رَس بس کر ان کے اطوار، رسومات اور زرعی مشاغل اختیار کر گئے ہیں[1]"۔

---

[1] "روسی ترکستان میں" ص ص ۲۸ - ۲۲۷

اُوزبکوں اور تاجیک کی باہمی شادیاں اور سَرت :-

جو اُوزبک تاجیک کے درمیان رہنے اور اُن سے شادیاں کرنے کے بعد ہر لحاظ سے تاجیک بن گئے۔ اُن سے سَرت نام کی ایک مخلوط نسل چلی جس کی شکل و شباہت میں بعض اُوزبک نقوش بھی محفوظ رہے۔ اسیطرح خراسان کے عرب فاتحین صدیوں تک مفتوحہ تاجیک یا ایرانی آبادی سے اختلاط کے بعد اسی میں جذب ہو گئے۔ عرب اپنا تشخص صرف انہی علاقوں میں قائم رکھ سکے جہاں حالات شیابنت، خانہ بدوشی اور غارتگری کے لئے سازگار تھے۔ خراسان میں عربوں کا اقتدار بنو امیہ کے زوال کے ساتھ ہی ختم ہو گیا اور ابتدائی خلفائے عباسیہ نے عربی زبان کی حوصلہ شکنی کی جس سے عرب عنصر نہایت آسانی اور سُرعت سے ایرانی آبادی کے سوادِ اعظم میں جذب ہوتا گیا۔

بشر الپائنی (مرد کہستانی) :-

"موجودہ ماہرین انسانیات مشرقی ایرانیوں کو کسی بہتر نام کے فقدان کی وجہ سے آریہ کہتے ہیں جو کاکیشی نسل کی اس شاخ سے بیحد متأثر ہیں جسے بشر الپائنی کا نام دیا گیا ہے اور جو وسطی یوروپ اور ایشیائے کوچک سے ہندوکش کی سطوح مرتفع تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس نسل کی ایک نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس کا سَر مستقلاً چھوٹا اور تقریباً گول ہے جس کے بہترین نمونے ترکستانی تاجیک اور ہندوکش کے غلچوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

مشرقی ایرانی نسل کی بشر پیمائی :-

چوڑا سَر اور خالص ایرانی کی مخصوص عقاب آسا ناک[۲]، تاجیک کا نمونہ ہے جہاں کہیں بھی یہ نسل

---

[۱] (بلوچ نسل' از ایم لانگور تھ ڈیمز' جلد چہارم، لندن' ۱۹۰۴' ص ۱۰ ماخوذ از 'ہندوکش کے شمال و جنوب کے آریہ' از اُحفلوی)

[۲] 'ختن کے ریت میں دبے ہوئے آثار' از آرل سٹین، لندن' ۱۹۰۳' ص ۴۶ نیز دیکھئے ضمیمہ سوم۔

موجود ہے البتہ کہیں کہیں منگول خون سے غلط ملط ہونے کے بعد نمونہ قدیم میں ہلکا سا تغیر آگیا ہے۔
قدیم ایرانی نسل کی بیرونی چوکی واخن ہیں مشرقی ایران کی قدیم زبان کی ہی کوئی شاخ بولنے والے
لوگوں کے جسمانی نقوش اور رنگ[1] اُن کی نسل کے نو وارد دوں کو ممیز کرتے تھے جن سے خطر پسند
سیاح ہنزہ میں ملا تھا۔

"وخیوں کے پُرامن کردار کا عجیب وغریب مظہر وہ آلہ ہے جو ہر معزز مکاندار سرکاری تقریبات
پر بھی اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ یہ ایک لمبا سونٹا ہوتا ہے جس کے سرے پر لکڑی کا ایک چھوٹا سا
لیکن دل کی شکل کا کرچھا لگا ہوا ہوتا ہے جس کی مدد سے آبپاشی کی نالیوں کو کھولا یا بند کیا جاتا ہے۔
یہ نالیاں بہت محنت سے صاف کی ہوئی ڈھلوان چبوترے دار زمینوں کو سیراب و شاداب
کرتی ہیں[2]"۔

نسبتاً سفید رنگ بھی تو اجیک کو ورثہ میں ملا ہے جو سیستان اور دیگر علاقوں میں اُنہیں
سانولے بلوچ ہمسایوں سے فوراً ممیز کر دیتا ہے۔ افراد ہیں بدلیشی خون کی آمیزش سے جسم، نقوش
اور رنگ میں کہیں کہیں البتہ تبدیلیاں آئی ہیں۔ سیستان میں تاجیک و بلوچ والدین کی
مشترکہ اولاد عجیب وغریب انحراف کی مظہر ہے جو اپنے والدین کے نسلی قد و قامت سے لمبی
ہے اور تاجیک کا چھوٹا سر اور عقابی ناک رکھنے کے باوجود تاجیک صباحت سے کسی حد تک
محروم ہو کر اسی نسبت سے بلوچ ملاحت کی آئینہ دار ہو جاتی ہے۔ چکانسر کے ارد گرد تو اجیک اور
بلوچوں کے درمیان اکثر باہمی رشتے ناطے ہوتے رہے ہیں لہٰذا تاجیک (فارسیوان) اور بلوچ مجمع
میں چکانسری کو فوراً اُس کے لمبے قد، دُبلے پتلے اکہرے جسم اور رنگ کی وجہ سے پہچانا جاسکتا ہے۔
"سطح مرتفع ایران کے مختلف حصوں کے تو اجیک کا انڈکس ۸۱ سے ۸۴ تک ہوتا ہے۔

---

[1] ایضاً ص ۴۵

[2] ایضاً ص ۴۷

درّازیوں کا ۸۱۰۴، اور غلیچوں کا ۸۵۔ ممبئی کے پارسی اپنے ہندوستانی ہمسایوں سے الگ تھلگ رہے ہیں اور ان کا انڈکس ۸۲۰۳ ہے۔"[1]

۱۹۰۱ میں ریاست قلات کے دہوار (جو قلات کے قریب اور قصبہ مستونگ کی زرخیز وادیوں میں ہی زیادہ تر آباد ہیں) ۶،۲۷ نفوس پر مشتمل تھے۔ ان کے علاوہ ۲۷۳ ضلع کوئٹہ پشین اور ۱۸ ضلع چاغی میں بھی موجود تھے۔ ریاست قلات کے دہواروں کی اوسط بشری پیمائش مندرجہ ذیل تھی:۔

اوسط سفالک (سَر) انڈکس = ۸۱۰۷

اوسط نیزل (ناک) انڈکس = ۷۴۰۳

اوسط قد و قامت انڈکس = ۱۶۴۰۲

اوسط آربٹس نیزل انڈکس = ۱۱۸

وہ تاجیک نسل کے دیگر خصائص کے بھی مظہر ہیں۔ وہ دیہات میں رہتے ہیں، خالصتاً زراعت پیشہ ہیں اور سردی میں نشیبی علاقوں کو ہجرت نہیں کرتے۔ دہواروں کا معتبر ارباب کہلاتا ہے۔[2]

---

[1] 'بلوچ نسل' ص ۱۱ -

[2] بلوچستان گزیٹیر سیریز جلد ششم، ۱۹۰۷، ص ۶۳ --- وادیٔ مستونگ کے قبائل یقیناً تاجیک الاصل ہیں۔ گو حالیہ دَور میں افغان، بلوچ اور براہوی بھی ان سے مل گئے ہیں۔ ایک چھوٹا حصّہ (لیکن اچھے کاشتکاروں کا) کشمیر زئی کہلاتا ہے اور کشمیری الاصل بتایا جاتا ہے۔ یہ سب فارسی بولتے ہیں۔ دہواروں کا مرکزہ (موجودہ باشندوں میں قدیم ترین) بلخی الاصل کہا جاتا ہے۔ ضمیمہ سوم میں تاجیک بخارا کا دلچسپ اور اہم بیان ہے جو 'امیر بخارا اور اس کا ملک' از او۔ اولف سَین، لندن، ولیم ہین مین ۱۹۱۱ء کے باب ششم سے ماخوذ ہے۔

سیستانی اور قندھاری تواجیک کا تصویری فرق :-

سیستان اور قندھار کے فارسی دان (یا تواجیک) کی تصویروں میں موجود افراد زیادہ مشابہت کے مظہر نہیں ہیں۔ لیکن اس کی وجہ ان دو نوممالک کا ملبوساتی فرق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ افغان پوشاک قدیم انداز کو برقرار رکھتی ہے۔ داڑھی بھی پوری اور ناتراشیدہ ہوتی ہے اور مجموعی تأثر اس سے کہیں زیادہ شاندار ہوتا ہے جو (یوروپ سے مستعار موجودہ ایرانی لباس) بدنما سرداری یا فراک کوٹ اور بدزیب پاجامے سے پیدا ہو سکتا ہے۔ سیستان میں بڑے بوڑھوں اور ملّاؤں کے سوا داڑھی تراشی جاتی ہے لہٰذا سیستانی فارسی دانوں کی شکل وشباہت اپنے ہم نسل قندھاریوں سے مختلف ہوتی ہے جو 'جیسا دیس ویسا بھیس' کی واضح مثال ہے۔

باب سوم

سگزیوں کا ابتدائی تذکرہ:-

ابتدائی مشرقی مسلمان مصنّفین (جن کی تصانیف محفوظ رہی ہیں) سیستان کو سجستان اور لوگوں کو سجزی لکھتے ہیں لیکن وقائع مابعد میں سجزیوں اور سیستانیوں میں تمیز کی گئی ہے۔ تیرھویں صدی کے ربع اوّل میں سجزیوں کا ذکر قلعۂ اُک[1] کے ضمن میں آیا ہے جو ان کا صدر مقام تھا۔ یہ قلعہ عبدالرزّاق کی 'مطلع السعدین' (۱۴۰۸ء) کے مُطابق قلعہ لاش ہے۔ میں یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ سگزئی یا سجزی جن کا صدر مقام اب بھی قدیم ضلع اُک (جسے اب جوین یا لاش جوین کہتے ہیں[2]) میں ہے انہی سجزیوں کے باقیات ہیں جو غالباً قدیم ترساکا نامی نسل سے متعلّق تھے۔

سگزی (اسحاق زئی) سجزی اور ساکا:-

منگول عساکر نے قلعۂ اُک کا اُنّیس ماہ (بعض کے مطابق دو سال) تک محاصرہ کئے رکھا۔ ۱۴۰۸ء میں شاہرخ ابن تیمور نے اس کا محاصرہ کیا اور سجزیوں نے سیستانیوں کے ساتھ مل کر ڈٹ کر مقابلہ کیا (صاحب مطلع السعدین سجزیوں اور اہل ڈیلٹا یعنی سیستانیوں کو ملک قطب الدّین کی رعایا بتلاتا ہے)۔ اس وقت سجزی علاقہ فرح پر قابض تھے اور وہاں کے دیگر قبائل سے شیر و شکر

---

[1] دیکھئے حصّہ اوّل، باب دوم

[2] اب اسے ہوکاٹ بھی کہتے ہیں۔

ہو رہے تھے ۔ فوج نے ہتھیار ڈال دیئے جس کے بعد شاہرخ قلعہ اُک (لاش) کے خلاف بڑھا جسے بالآخر مدافعین نے فاتح کے حوالے کر دیا ۔ سکی اب خود کو افغان کہتے ہیں اور دُوسرے بھی انہیں یہی سمجھتے ہیں جو قیس کے ایک وارث اسحاق کی اولاد ہیں لہٰذا اسحاق زئی لکھے جاتے ہیں ۔ ایک مسلمان ماہرِ انساب قدرتی طور پر اس طاقتور قبیلے کو حضرت اسحاقؑ بن حضرت ابراہیمؑ سے منسوب کر کے خوش ہو گا لیکن وہ اپنے صدر مقام میں اپنے آپ کو سکزی یا سجزی کہتے ہیں (جو ابتدائی عرب مؤرخین کے عین مُطابق ہے) اور کبھی اسحاق زائی نہیں ۔

لفظ سجزی کا ماخذ :-

میجر راورٹی مرحوم نے لفظ سگزی یا سجزی کو سجستان سے اخذ کیا (جیسے رازی از رَے) لیکن ساکا سے ساکستان کا استنباط (اور نتیجۃً سجزیوں سے سجستان کا اشتقاق) شک و شبہ سے بالا ہے ۔ اگرچہ سکزیوں کا صدر مقام ضلع اُک ہے (جہاں یہ تیرھویں صدی سے یقیناً اور قدیم الایّام سے اغلباً آباد رہے ہیں) تاہم یہ قبیلہ جنوبی افغانستان میں کافی علاقے پر پھیلا ہُوا ہے ، شمال میں قریباً ہرات تک اور قندھار کے مشرق کی طرف وادیٔ اَرغسان تک ۔ لیکن سرداروں کا مرکز ہمیشہ قلعہ لاش اور قلعۂ جوین ہی رہا ۔ قلعہ لاش کے تو وہ پچھلی صدی کے وسط تک مالک رہے جن کے بعد امیر افغانستان نے اُسے قبضہ لیا اور اس میں ایک فوج متعین کر دی ۔ ۱۸۵۷ یا ۱۸۷۲ میں ایرانیوں نے اُسے خالی کیا تو اس قلعہ کو ایک چوکی بنا دیا گیا ۔

طرزِ زندگی :-

وہ شاہانی طرزِ حیات کے مالک ہیں اور ہوکاٹ یا لاش جوین میں ان کی زمینیں یہاں کے قدیم فارسی دان بحیثیت مزارعین کاشت کرتے ہیں ۔ یہاں کے تاجیک اوقاتی یا سوقاتی کہلاتے ہیں ۔ سکزی گنوادار (مویشیوں کے مالک) بھی ہیں اور ان کے اڈے ہامون پُزہ اور ہامون کے شمالی سرے کے نیزاروں میں ہیں ۔ سیستانی گنوداروں کے برعکس سکزی چرواہے

بھی ہیں، غالباً اس لئے کہ دشت یا بنجر سٹیپ (جس پر ان کی اکثریت آباد ہے) پر صرف بھیڑ بکریوں کے ریوڑ ہی زندہ رہ سکتے ہیں یا پھل پھول سکتے ہیں۔

ماحول کا اثر :-

سکزیوں میں ہمیشہ لوٹ مار کا رجحان رہا ہے اور ایران و افغانستان کی سرحدات کے صدیوں پرانے حالات نے انہیں اس رجحان کی تسکین کا خوب موقع دیا ہے۔ اُن کا ایک سردار موسیٰ خان اب بھی "ڈنگی"[1] یا قزاق کے عرفی نام سے مشہور ہے۔

سکزی اور پنجگور کے ساجدی :-

لاش جوین سے بہت دور جنوب کے ضلع پنجگور میں قبیلہ ساجدی ہے جو شاید قدیم ساکا کا نمائندہ ہو۔ سطح مرتفع قلات کی تلہٹی میں، بسیط وادئ خاران سے اونچی اور پنجگور سے قریباً ۱۰۰ میل شمال مشرق میں، دار وان نامی ایک چھوٹی سی وادی ہے جس کے قریب ایک مشہور بستی گریشہ ہے۔ اسی وادی میں ساجدیوں کا صدر مقام ہے۔ اس قبیلے کے دو حصے ہیں۔ ایک سنگر ہے جو کیچ، سمندر اور وادی کولواہ کی درمیانی پہاڑیوں اور اوراماڑہ کی طرف پھیلا ہوا ہے۔ یہ خانہ بدوش ہیں اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ رکھتے ہیں اور اونٹ پالتے ہیں۔ ساجدی ان سے اوپر آباد ہیں۔ ممکن ہے سنگر کا ماخذ مختلف ہو لیکن وہ ساجدیوں کا ہی ایک حصہ سمجھے جاتے ہیں۔ ساجدی سردار کا قبیلہ ساکازئی (سگزئی، سگزی یا سکزی؟) کہلاتا ہے۔ اور مشہور ہے کہ وہ کوئی ۲۰ قرون پہلے یا ۴۵۰ سال پیشتر سیستان سے یہاں وارد ہوئے[2]۔ وہ پہلے پہل پنجگور کے

---

[1] ڈنگ ڈاکہ زنی کو کہتے ہیں۔

[2] یہ دعویٰ کو صحیح مان لینے کی صورت میں ہے لیکن یہ دعویٰ مشکوک ہے۔ ساجدی اَن پڑھ ہیں۔ کوئی تحریری دستاویزات نہیں رکھتے اور پشتوں کی تعداد غالباً محض ایک قیاس ہے جس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ بہت عرصہ پہلے سیستان سے وارد ہوئے۔

جنوب کی وادی میں آباد ہوتے جہاں انہوں نے قلعہ بنایا جو اب بھی موجود ہے اور ساکائی قلات یاساکا قلات (قلعہ ساکا) کہلاتا ہے۔ ۱۹۰۱ کی مردم شماری میں ساجدی ۹۳۰۶ (۶ تھے اور سنگر ۳۸۵، ۴۔ موخر الذکر اپنے آپ کو جاٹ بتلاتے ہیں اور سندھ کے جوکھیوں سے روابط کے مدعی ہیں۔ اگر ہم ایک قرن کو اوسطاً ۲۲ سال لیں تو ساکا نے سیستان سے ۱۴۶۱ کے قریب ہجرت کی۔ اور سقوط زاہدان سے اُنیسویں صدی کے خاتمہ تک کے سال تاریخ سیستان[1] میں انتہائی پُر آشوب تھے لہٰذا ایسی ہجرت قرین قیاس تھی۔

ضلع پنجگور وغیرہ میں ساجدی خانہ بدوشانہ طرز زندگی کی لپیٹ میں آگئے ہیں۔ اگر وہ کہیں کاشتکار ہیں بھی تو حقیر اور ان کی دولت ان کے جانور ہیں۔ سیستان میں زراعت کاروں کا ایک چھوٹا ساگروہ ساج نامی ہے اور غالباً ساجدی اسی سے کٹ کر علیحدہ ہوئے لیکن طرز زندگی کے اعتبار سے لاش جوین کے سکزی اور پنجگور اور کیچ کے ساجدی (یاساکا[2]) بہت مشابہ ہیں۔ اور غالباً موخر الذکر سکزیوں کا ہی ایک حصہ تھے۔

دونو کا ماخذ نامعلوم :-

سکزی اور ساجدی دونو کو اپنے قدیم ماورالنہری ماخذ کا علم نہیں لیکن ایک قبیلہ ایسا ہے جسے ابتک یاد ہے کہ اُس نے وہاں سے ہجرت کی۔ یہ قبیلہ منگل یا مینگل ہے جس کا صدر مقام نوشکی ہے۔ اس کا ایک حصہ ریاست قلات کے جھلاوان ڈویژن میں بھی ہے جس کا صدر مقام وڈھ ہے۔ قلات سے کوئی ۱۰۰ میل جنوب میں۔

نوشکی کے ذگر مینگل اور اُن کا ماخذ :-

نوشکی کے مینگل اپنے کو جھلاوانی حصہ سے ممیز کرنے کے لئے ذگر مینگل کہلاتے ہیں جبکہ

---

[1] دیکھئے حصہ اول، باب چہارم

[2] ساکا اب بھی کیسپئن کی سرحدوں پر موجود ہیں۔ بلوچستان گزیٹیر جلد ششم ب ص ۹۸۔

بھلا وان کے مینگل شاہی زئی کہلاتے ہیں۔ ذگر مینگلوں کا کہنا ہے کہ اُن کا یہ معزز لقب زُغند (سمرقند کے قریب) کی وجہ سے ہے جہاں سے اُن کے آباؤ اجداد ہجرت پذیر ہوئے۔ زُغد وینی داد کے باب اوّل میں مذکور صوبوں میں سے ایک ہے جسے ژند میں سُغدیا اور قدیم فارسی سُغد کہا گیا ہے جس سے یونانی سُغدیانہ بنا۔ اس قدیم نام کی شکل اب بھی موجود ہے کیونکہ اسی ضلع میں سمرقند واقع ہے[1]۔

ضلع سُغد نوشکوی ذگر مینگلوں کا آبائی وطن تھا جو صدیوں پہلے نوشکی میں آباد ہوئے۔ یہ عرب فتح سے پہلے کا واقعہ ہے جہاں دریائے خَیسار نوشکی سے اُوپر کی پہاڑیوں سے نکلتا ہے۔ اُس کے دائیں کنارے پر اور پہاڑیوں کے بیرونی سلسلہ کے سرے پر ایک دیوار بند چوکور احاطہ تھا جو کسی قسم کے سیمنٹ کے بغیر پتھروں سے بنا تھا۔ یہ احاطہ عرب خیمہ یا پڑاؤ تھا۔ مینگلوں نے کئی سال پہلے مجھے بتایا کہ قرب وجوار میں صرف ایک قبیلہ ایسا ہے جو ان سے پہلے یہاں آباد تھا۔ اور جو نوشکی سے چند میل جنوب میں احمد وال کی کاریزات سے سیراب ہونیوالی زمینوں کا مالک ہے۔ نام نہاد براہوئی قبائل کو ذگر مینگل نووارد سمجھتے ہیں۔ احمد وال کے لوگ رخشانی کہلاتے ہیں اور براہوئی سمجھے جاتے ہیں لیکن وہ غالباً اصلی تاجیک آبادی کے باقیات ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ کسی وقت نوشکی کے مغرب کی ساری زمین کے مالک تھے۔ نوشکوی مینگلوں کا ایک بڑا حصّہ نوشکی اور رلمند کی مشرقی کھینی کے درمیانی صحرا میں رہتا ہے۔ بلوچستان و افغانستان کی

---

[1] یونانی فتح کی یاد ابھی تک زندہ ہے کیونکہ "روسی ترکستان میں" صفحہ ۲۴۹ پر مصنّف لکھتا ہے "سکندر نامی جھیل کے پاس ایک اَندَدب نامی پہاڑی گاؤں ہے جس کے باشندے اپنے آپکو سکندر کے یونانی سپاہیوں کی براہِ راست اولاد کہتے ہیں۔ جب وہ اس کے ساتھ مقدونیہ سے سُغدیانہ آئے" یہ جھیل دریلتے زرافشاں کی اُونچی وادی میں ہے۔ سمرقند سے بہت دُور اور دریا کے بائیں کنارے پر۔ زرافشاں کا ایک معاون بھی اسی بنا پر اسکندر کہلاتا ہے۔

سرحد بندی (۱۸۹۶) کے بعد قبیلہ کا یہ حصّہ (قریباً ۳۴۰۰ خاندان) امیر افغانستان کی رعایا بن گیا۔ وہ اپنے سردار محمود کے تحت نوشکوی مینگلوں سے بالکل کٹ گئے لیکن ذگر مینگلوں کا سردار نوشکی میں ہی رہا۔ موجودہ ذگر مینگل بے اثر و رسوخ ہیں اور جھلاوانی مینگل تعداد میں اُن سے بہت زیادہ ہیں۔

جھلاوانی مینگل ایک مخلوط قبیلہ :-

جھلاوانی مینگل (۱۹۰۱ میں) ۱۳۶۲ تھے اور وہ مخلوط ماخذ کے ہیں۔ غالب حصّہ شاہی زئی ایرانی ماخذ کا دعویدار ہے۔ محمد زئی اور باران زئی افغان ترین ماخذ کے ہیں۔ رئیسانی سہرادانی رئیسانیوں[1] کے ہم اصل اور افغان ترین (سپین زرین) ہیں۔ مردوئی ملفتی جدگال (جاٹ) ہیں جو جام اری سے برآمد ہوئے اور جو سندھ کے ضلع کراچی کے بیرانی، حمالانی اور لوہارانی جو رام تھانہ بولاخان اور تونگ کا مورث اعلیٰ تھا۔ وہ مینگل سردار کے باجگزار تھے لیکن اب کوئی بیس سال سے مینگل قبیلہ کا حصّہ سمجھے جانے لگے ہیں۔ ایک مردوئی سردار فیروز نے منگول ایجنٹ ملک چیپ کو خضدار سے نکال دیا۔ پہلوان زئی ایرانی ہیں (پہلوان سیستانی آبادی کا ایک مشہور فارسی وان حصّہ ہے[2])۔

منگ ایک ماوراالنہری قبیلہ :-

سترھویں صدی میں مغل شہنشاہ شاہجہان نے بلخ پر قبضہ کیا اور قریباً دو سال جیحوں تک حکومت کرتا رہا۔ ہندوستانی فوجیں اُدھر کے کنارے پر بھی ایک دو جو کیور، پر قابض رہیں تاکہ دریا

---

[1] جھلاوانی مینگلوں کی بشری پیمائش یوں ہے :- سفالک انڈکس ۸۲۰۸

نیزل ۵۹۰۵

آربٹس نیزل ۱۲۰۰۶

"دی پیپل آف انڈیا" کلکتہ، ۱۹۰۸، ضمیمہ چہارم

[2] بلوچستان گزیٹیر سیریز، جلد ششم ب، ص ۸۳ -

کے بڑے گھاٹ قابو میں رہیں۔ حاکم سمرقند عبدالعزیز خان نے حملہ کیا اور اس ہندوستانی علاقے پر قبضہ کرلیا۔ اس کی آواز پر لبیک کہنے والا ایک قبیلہ مِنگ تھا۔[۱]

لفظ مِنگل یا مینگل :-

بلوچی زبان میں اسمائے ذات اور اسمائے جمع کی جمع بنانے کے لئے عموماً اسم سے گال لگاکر بنائی جاتی ہے لہٰذا جدگال کا معنی پوری جاٹ آبادی بھی ہے اور ایک جاٹ فرد بھی۔ پس مینگل (مِنگ گال) کا مطلب محض قبیلہ مِنگ (یا من) ہے۔ سندھ کا ایک مشہور قدیم شہر من نگر (منوں کا شہر[۲]) غالباً اسی قبیلہ کے نام پر تھا جس کا نام تو اب بھی موجود ہے۔ لیکن قبیلہ بے اثر و رسوخ ہے۔

مینگل، سندھ کے قبیلہ مَن کے باقیات :-

سکزیوں اور ساجدیوں کا ماوراالنہر سے تعلق مبنی بر قیاس ہے لیکن ایسی شہادت (مُطلق

---

[۱] بادشاہ نامہ۔ ببلی اوتھیکا انڈیکا۔

[۲] پیری پلس آف دی ایریتھریئن سی کا مصنف (مکرنڈل کا ترجمہ۔ اس کتاب کی تاریخ متنازعہ فیہ ہے۔ مکرنڈل ۸۰ اور ۸۹ ء کے درمیان بتاتا ہے۔ ایم رینا و ۲۴۶ یا ۲۴۷ بتاتا ہے اور ار لی ہسٹری آف انڈیا کا مصنف ص ۲۱۸ نوٹ میں لکھتا ہے "یہ کسی حد تک وثوق سے" اور ۱۰۵ ء کے درمیان کی ہوسکتی ہے") پہلی یا دوسری صدی عیسوی میں وادیٔ زیریں سندھ کو سیتھیا پکارتا ہے جو پارتھوی سرداروں کے ماتحت تھا اور جو ایک دوسرے سے برسرپیکار تھے۔ دارالحکومت مِن نگر تھا اور بڑی بندرگاہ بَبری کان تھی۔ دارالحکومت اُونچے حصّہ میں تھا۔ دریائی گذرگاہوں کی تبدیلیوں اور دریا آورده گاد سے بنے ہوئے ساحلوں کی وجہ سے ان مقامات کی نشاندہی ناممکن ہے اور اس دَور کے جغرافیائی خدوخال کی ظلمت کو چیرا نہیں جاسکتا۔

ثبوت نہیں) موجود ہے کہ نوشکی کے مینگل اس علاقے سے منسلک ہیں۔ جس میں سمرقند[1] واقع ہے۔
اوّل الذکر کی ماخذ فراموشی اور مؤخر الذکر کی ماخذ یاد داری یقیناً ایک شہادت ہے کہ وہ ماوراالنہر سے
ہونیوالی کسی بعد کی ہجرت میں آئے۔ ممکن ہے کہ جب اکثر من (یا منگ) وادئ سندھ میں چلے گئے،
جہاں انہوں نے من نگر بسایا تو انکا کچھ حصّہ نوشکی رہ گیا جہاں وہ شبانی قبیلہ بنے رہے اور اپنا تشخص
برقرار رکھا۔ اب وہ براہوئی قبائل میں شمار ہوتے ہیں[2]۔

پنجگور کے کاشانی :-

کاشانیوں کے اشگ کے پُترا سے ماخوذ ہونے کی کہانی پہلے بیان ہو چکی ہے[3]۔ اس سے
ظاہر ہوتا ہے کہ پارتھوی یا ہند پارتھوی (جنہوں نے سیستان اور اراکوشیا پر حکومت کی) ابھی تک
سیستان اور ملحقہ اضلاع میں جو اراکوشیا میں شامل تھے۔ زیرِ تہہ موجود ہیں۔ اراکوشیا میں اضلاع
پشین، کوئٹہ، قلات، خضدار اور ان کے اور مغرب میں ہلمند کے درمیان کا علاقہ مشمولہ بہ قندھار
تا قراباغ درشمال اور جنوب میں اس فاصل آب تک جو بحیرۂ عمان میں گرنے والی ندیوں کو خاران کے
خشک میدانوں میں گرنے والی ندیوں سے جُدا کرتی ہے شامل تھا۔ اس فاصل آب کے شمال کی طرف

---

[1] سمرقند کی بنیاد ایران کے کیانی بادشاہ کاؤس اور اس کی تکمیل اُس کے بیٹے سیاؤش سے منسوب
ہے۔ یہ نام شاہ یمن توبہ ابوکرب یا توبہ الاکبر کے جرنیل سُمر کی وجہ سے رکھا گیا جو ماوراالنہر کی عرب فتح کا نشان ہے۔
"شہرہائے ایران" از جیون جی جمشید جی مودی بی اے (بمبئی (۱۸۹۹) ص ۱۳۳۔

[2] جھلاوانی منگال شاید مختلف نسل پارے تھے جو نوشکوی مینگلوں کے مقتدر سردار کی وجہ سے
اس سے وابستہ ہو گئے۔ یہ اقتدار نصیر خان اوّل تک رہا جو ۱۷۹۴ کی بہار میں فوت ہوا۔ اس کے بعد
وہ اپنے آپ کو مینگل کہنے لگے۔

[3] دیکھئے باب اوّل، حصّہ چہارم۔

کاشانیوں کے گروہ اب بھی مختلف جگہوں پر آباد ہیں۔ ضلع پنجگور میں کاشانیوں کا صدر مقام شہباز قلات ہے۔ یہاں وہ ۳۵۰ ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ قلات کے قریب اسکلکو کے شاہوانیوں کی شاخ ہیں۔ اور یہ اُن کے آباؤ اجداد لڑائی کی وجہ سے ۷۰۰ خاندانوں کی صورت میں ملوکِ پنجگور کے دور میں یہاں وارد ہوئے۔ کاشانی یار[1] کاشانی اب بھی شاہوانی قبیلہ کا ایک پاڑہ ہے۔ گچکیوں کے ساتھ جھگڑوں کی وجہ سے ان میں سے اکثر چکانسر (وادئ ہلمند) میں چلے گئے[2]۔" پنجگور کے کاشانی ریوڑ اور اونٹ پالتے ہیں لیکن علاقہ شہباز میں وہ خشک فصل کی کاشت بھی کرتے ہیں۔ قلات کے سراواتی شاہوانی (جن کے ساتھ پنجگوری کاشانیوں کے مراسم ہیں) بھی دیگر براہوئی قبائل کی طرح مخلوط ہیں۔" قبیلے کا مرکزہ یعنی رمضان زئی اور علی زئی پاڑے بلوچ یا پٹھان سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن ایک اور نظریہ کے مطابق وہ کسپیئن کے پاس شروان سے آئے[3]۔" دیگر تمام پاڑے بدیشی ماخذ کے ہیں[4]"۔ شاہوانی قلات میں ۳۱۸ر۶ تھے اور سراوانی براہوئیوں میں سرفہرست تھے۔ لیکن غالباً ۱۸۳۹ کے بعد رئیسانی صفِ اوّل میں آگئے[5]۔

---

[1] بلوچستان گزیٹیر جلد ہفتم ص ص ۱۰۴-۱۰۳ - بنیاد خان کاشانی مذکور درحصہ دوم سیستان میں اس قبیلہ کا سردار تھا، اُسے ۱۸۹۸ میں افغانوں نے ایران کو جاتے ہوئے شاہ گل (ہلمند پر) مار دیا۔ اس پر اور نوتانی معتبر پر ۵۰۰۰ کران جرمانہ عاید کیا گیا تھا اس لیے کہ غالباً انہوں نے افغان ظلم و ستم کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔

[2] ایضاً، ص ۱۰۴

[3] بلوچستان گزیٹیر جلد ششم، ص ۵۲

[4] یعنی نوشکی کے ذگر مینگل ہمیر واڑی، نوشکی کے مینگل، شاہوانی براہوئی سمجھے جاتے ہیں۔

[5] دیکھئے پوٹنگر" بلوچستان اور سندھ کی سیاحت" لندن ۱۸۱۶ -

رَوایات کا اختلاف :-

مذکورہ پیروں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گزیٹر کا بیان سیستان میں مشہور کاشانیوں کے ماخذ کی کہانی کی تردید کرتا ہے۔ خواجہ عمران، اشنگ کاپترا، کاشانیوں کا اُن سے توارث اور کاشانیوں کا زیارت عمران سے گریز، یہ سب اہلِ سیستان کا جزو ایمان ہیں۔ اس قبیلے کے دو معتبرین نے جب میرے ساتھ جانے سے انکار کیا تو مجھے پیر پرست سیستان میں لازماً اس کی ٹوہ لگانا پڑی۔ قلاّت کے شاہوانیوں میں اب بھی اپنے آبائی وطن کی دھندلی سی یاد موجود ہے اور شروان اَب بھی کیسپین کے مغربی ساحل پر واقع صوبہ داغستان (جارجیا) کا ایک چھوٹا سا ضلع ہے۔ یہ قدیم سلطنت آرمینیا کا ایک صوبہ تھا جسے بارتھوی بادشاہ اَرتابانُس نے ۳۴ء میں فتح کر لیا۔ اُس وقت جرِبینی کُس کا نامزد کردہ اَرختی اُس سوم فوت ہو چکا تھا۔ تخت آرمینیا اَرساکیز ابن اَرتابانُس کو دے دیا گیا اور یوُں بارتھوی بادشاہوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ قلاتی شاہوانیوں کی روایت ان کے ماخذ کو خواجہ عمران کے قصّہ سے بھی پہلے لے جاتی ہے۔ جب اشنگ کاپترا کو کم از کم سیستان کے ایک حِصّہ پر اقتدار حاصل تھا۔[1]

سرپرہ سَردار کی تشریح :-

براہوئی اور بلوچ قبائل میں قدیم اور کسی قوت کے طاقتور قبائل کے باقیات ہیں جن کے ابتدائی مقامات ان کے بے برگ وبار موجودہ وارثوں کے مقامات سے مختلف تھے۔ سیستان کے کوہ پلنگ میں براہوئی قبیلہ سرپرہ کے کچھ خاندان ہیں۔ ریاست قلاّت میں ان کے صدر مقام

---

[1] ۱۹۰۴ میں کاشانی سیستان میں ۵۵۳ رہتے تھے۔ ان میں سے ۲۷۴ ر ۲ افغان علاقہ میں تھے۔ ان میں سے ۲۳۲ کے پاس چکانسر کے مشرق میں اِرنداسس کے مقام پر ۵۰۰ ر ۴ ایکڑ زمین تھی۔ یہ زیادہ تر بارانی تھی اور تین سالوں میں صرف ایک دفعہ زیر کاشت لائی جا سکتی تھی۔ سرحد کی ایرانی طرف ۸۰ کاشانی کاشت کار تھے۔

کردگاپ اور گرگینہ ہیں، جہاں وہ ۱۹۰۱ میں ۸۸۵ تھے۔ یہ قلات کے علاقہ سراوان میں ہیں۔ سردار امام بخش خان (۱۸۸۹ میں) نے لفظ سرپرہ کا معنی گردن زن یا قاتل بتایا کیونکہ وہ سخت جنگی رجحان کے مالک تھے"۔ وہ باہمی لڑائیوں کے لئے بدنام ہیں، اور مشہور ہے کہ وہ ایک کتے یا بلّی پر بھی لڑ پڑتے تھے۔ مُرّانی گرگینہ میں غالب ہیں۔ اور سب سے زیادہ شورش پسند ہیں[۱]۔

قلات اور افغانستان کی سرحد کے قریب ہونے کی وجہ سے یہ قبیلہ اہم حیثیت رکھتا ہے اور ماضی میں یہ مستقلاً شوراوک کے بڑیچوں سے برسرپیکار رہتا تھا۔ یہ قبیلہ نیم بلوچ اور نیم افغان ہے۔ یہ امر موجب دلچسپی ہے کہ اسی نام و معنی کا قبیلہ قدیم وقتوں میں کافی مغرب کی طرف آباد تھا۔" کچھ تھریسی قبائل موسومہ بہ سرپروئے یا قاتل آرمینیا سے اوپر گورانی اور میدیا کے قریب رہتے ہیں۔ وہ وحشی ہیں، بے لگام پہاڑتے ہیں اور اجنبی لوگوں کے سر قلم کر دیتے ہیں، جو لفظ سرپروئے کا معنی ہے[۲]"۔

دیگر براہوئی قبائل کے برعکس سرپرہ موسمی لحاظ سے میدانوں میں نہیں جاتے۔ اُن کا بڑا پیشہ زراعت ہے لیکن ان کے دو پاڑے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ پالتے ہیں[۳]۔

قبیلے کی اصلی اور موجودہ اقامت گاہ:-

سٹریبو کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرپروئے موجودہ کُردوں کے ہمسائے تھے۔ اور ان کے اور بحیرۂ کیسپئن کے درمیان رہتے تھے۔ ریاست قلات میں بھی کُردوں کا ایک

---

[۱] بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیر جلد ششم، ص ۶۵

[۲] سٹریبو، جغرافیہ، کتاب یازدہم، باب چہارم دہم۔ فالکنر کا ترجمہ۔

[۳] رودینی جو ریاست قلات کے سراوان ڈویژن میں واقع کردگاپ کا ایک اور قبیلہ یہ ۱۹۰۱ میں ۹۷۸ را تھے۔ یہ سیستان میں بھی موجود ہیں۔ جہاں ان کی تعداد ۹۴۶ نفس۔ ان کے سمال زئی اور زہروزئی پاڑے سیستان میں موجود ہیں۔

سرپرہ کے قریب ہی بستا ہے جو اب بلوچ یا براہوئی کہلاتا ہے۔ کُرد ویسے تو ساری ریاست میں موجود ہیں لیکن درہ بولان کا سرا اُن کا صدر مقام ہے۔ اس کے علاوہ جھلاوان کے مقام باغبانہ میں بھی مرکوز ہیں۔ ان کا ایک چھوٹا سا حصّہ ریاست لسبیلہ میں بھی ہے[1]۔

موجودہ سیستانی آبادی کی اندازاً درجہ بندی :۔

سیستانی آبادی کو صرف دو طبقوں میں بانٹنا ہی ممکن ہے۔ ایک طبقہ شبانی ہے اور دُوسرا زراعت کار، جو اپنے آپ کو فارسی وان کہتا ہے۔ مؤخر الذکر کے بعض حصّے ایسے بھی ہیں جو فارسی وان کہلانے کے باوجود قدیم مشرقی ایرانی نسل سے منسلک نہیں ہیں۔ شاہرکی اور سربندی[2] عربی النسل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اوّل الذکر غالباً خوارج کے باقیات ہیں جنہیں کٹّر مسلمانوں نے خلافتِ عباسیہ کے مشرقی کناروں کی طرف دھکیل دیا تھا اور وہ کرمان و سیستان میں بالادست ہوگئے تھے۔ کم از کم سیستان میں خوارج کی ایک اہم خصوصیّت ان کا پشمینہ پارچہ باقی تھا[3]۔ کورا سوتی کپڑا اب

---

[1] کُرد ایران کے صُوبہ کرمان میں آباد تھے۔ کرمان کے جنوب میں راہبران کا صدر مقام اور سردار کی رہائش گاہ تھا۔ کُردوں کو بارھویں صدی میں غُزوں نے دبالیا اور اُن کا زور جاتا رہا لیکن وہ اب بھی اس صُوبہ میں جا بجا موجود ہیں۔ راہبر کے کردوں کے لئے دیکھئے محمدؐ ابراہیم کی "تاریخ سلاجقۂ کرمان"۔ وہ سترھویں صدی کا مصنّف ہے جس نے پرانے دستاویزات سے استفادہ کیا۔ (محمدؐ ابراہیم کی تاریخ کے مؤلّف ایم تھامس ہاؤسمہ تھے۔ اور ناشر ای۔ جے۔ برل۔ لیڈن، ۱۸۸۶)۔

[2] روایت کے اعتبار سے سیستان میں شاہرکی ۹۰۰ سال اور سربندی ۳۰۰ سال پہلے آئے۔ شاید پہلے نام میں "کا" نہ ہو تو پھر یہ شرق یعنی مشرق سے ماخوذ ہے۔ خوارج اور دیگر تفرقہ پسند جو یہاں آئے یا یہاں سے اُٹھے شرقی (مشرک) کہلاتے تھے۔ خلافت کے مغربی حصّے (برائے نام) کٹّر تھے۔

[3] دسویں صدی میں سیستان پر لکھنے والے عرب جغرافیہ نگار خارجی پارچہ بافت برادریوں کا ذکر کرتے ہیں۔ دیکھئے حصّہ سوئم، باب ششم۔

بھی سیستان میں مرد ہی بناتے ہیں اور یہ صنعت شاہر کی دیہات میں بہت عام ہے۔ اس پر انیسویں صدی کے ایک سیاح ڈاکٹر فریڈرک فاربس ایچ۔ای۔آئی سی ایس نے توجہ مبذول کی جسے سیستان میں قتل کر دیا گیا۔ "یہاں کے پارچہ باف مجھے سکاٹ لینڈ کے دستکاروں جیسے معلوم ہوئے (جو اب معدوم ہونے جارہے ہیں) کیونکہ ایک جیسا کام کسی حد تک ایک ہی جیسا مزاج پیدا کر دیتا ہے۔ وہ تمام ذہین اور سیاست اور بحث و تکرار کے رسیا اور ایک انوکھے احساس مزاج کے مالک معلوم ہوتے تھے جو عام ایرانیوں سے بہت مختلف تھا"[1]۔ ڈاکٹر فاربس نے سیستان کے شمال مغرب میں کوہستانی ضلع گنا باد کے گاؤں دیلودی میں بھی پارچہ بافوں کو دیکھا ان پارچہ بافوں میں وہی خصائص تھے جو اسلام کے ابتدائی خارجی فرقہ پردازوں میں تھے[2]۔

دیگر قبائل :-

کسی وقت شاہرقی سیستانی آبادی کا بہت اہم جزو تھے لیکن ۱۹۰۴ میں وہ صرف ۲٫۳۰۰ نفوس پر مشتمل تھے۔ سربندی ۸۰۰ ، اتھے لیکن ان کا سردار بہت با اثر تھا۔ ان کے علاوہ افغان علاقہ میں واقع چکانسر میں ۱٫۰۰۰ سربندی اور ہیں جب کہ شاہرقی خالصتاً ایرانی باشندے ہیں۔ میران سیستان کا خاندان بھی عرب ماخذ کا ہے لیکن یہ قبیلہ نہیں بلکہ محض ایک خاندان ہے۔ فارسی دانوں میں کیانی، ارباب، جمالی، کمالی، پہلوان اور کاخا شامل ہیں جو سیستان کی اصلی ایرانی آبادی کے باقیات ہیں لیکن دیگر فارسی دانوں کا نسلی تعین نہیں ہو سکتا۔ ان کے نام اکثر و بیشتر اپنے اوطان اصلی سے ماخوذ ہیں۔ جیسے دِلآرام (گرشک کے مغرب میں) سے دِلآرامی، دُلختی (شارع ہرات قندھار پر دِلآرام سے ایک منزل) سے دُلختی، گرگ (بام کے قریب فہرج

---

[1] جرنل آف دی رائل جیاگرافیکل سوسائٹی، شمارہ ۱۰، جلد ۱۴۔

[2] فاربس کے ایرانی خادم سے بعد میں رالنسن کو قندھار میں پتہ چلا کہ فاربس کے جوش و خروش اور تحقیقات کو لوگ اچھا نہ سمجھتے تھے۔ قلات پر قبضہ نے اہل مکران و سیستان کو بھی خوفزدہ کر دیا تھا۔ ایضاً

کے جنوب مشرق میں) سے گرُگ، شُرگز (گرگ کے قریب) سے شُرگزیٔ اور خاراکُوہ (ہلمند پہ لنڈی محمدؐ امین سے اوُپر) سے خاراکُوہی وغیرہ ۔ ان میں سے چند جیسے پٹے لیشم، پلپلی سنادگُل، شیخ وَلیسی اور میر وَلیسی (دونو قندھار کے گرد) سنجُولی (یا سنگچُولی) جوتغ اور دیگر فارسی وان کہلانے تو ہیں یا سمجھے تو جاتے ہیں لیکن ان کا ماخذ نامعلوم ہے۔ سنچولی اور جوتغ کے اپنے مقدّم ہیں جو دیہہ باشی کہلاتے ہیں۔ جواتغ کا دعوٰی ہے کہ وہ جبل بارز سے سیستان میں آئے اور ملوک کے سپاہی رہے اور ان کا دہ باشی ملوک کا موروثی علمبردار رہا۔[1]

جبل بارز (جبل بارِز یا ٹھنڈے پہاڑ سے بگڑا ہوا) بلند سلسلۂ کوہ ہے جو زمِ شیر کے زرخیز میدانوں پر سرافراختہ ہے ۔ یہ پہاڑ قدیم ایّام سے ہی لوگوں کی پناہ گاہ یا قدرتی قلعہ تھے اور عرب فتح کے بعد خوارج اور دیگر فتنہ پردازوں کے گڑھ تھے ۔ جواتغ کے اصل پہاڑ کا پتہ چلانا ناممکن ہے لیکن ان کی جسمانی ساخت اور خدوخال وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوارج سے متعلق تھے جنہوں نے مقامی آبادی سے رشتے ناطے کر لئے تھے۔ خوارج ہمیشہ خالص عرب نہ ہوتے تھے۔ سنچولیوں کے ہاں ماخذ کی کوئی روایت نہیں یا کم از کم دریافت نہ ہوسکی لیکن غالباً وہ بھی جواتغ کے ساتھ سپاہیوں کی حیثیت سے آئے لہٰذا ان کا مقدّم بھی دہ باشی کا لقب رکھتا ہے بعض جواتغ کو میں نے دیکھا وہ پست قد تھے اور بعض کے سَر تنگ تھے ۔ کاخا فارسیٔ ان قد و قامت اور جسمانی ساخت کے اعتبار سے مشہور ہیں شاہرقی ایک علیحدہ نسل ہیں اور ان کے جسم کسرتی ہیں وہ نسبتاً سیاہ فام ہیں اور بعض میں تو سامی نسل کا چھوٹا سا سَر بھی دیکھنے میں آتا ہے۔

جواٹ اور فارسی وان :-

فارسی وانوں میں جاٹ اور دیگر قبائل بھی شامل ہیں جو ہندوستان کے گوجروں سے

---

[1] فارسی وانوں کی امن جوئی کی وجہ سے ملوک جنگجو لوگ لائے ہوں گے۔ سیستان میں ہمیشہ ایک حزب امن موجود رہا جس نے حملہ کے وقت دفاع مُلک اور ملوک کی جاندار خارجہ پالیسی کو ناکام بنا دیا۔

نمایاں مشابہت رکھتے ہیں - ان کا بیان علیحدہ ہوگا -

افغان سیستان کی آبادی :-

ہلمند کے پار افغان علاقے میں ؎۱ فارسی دان عنصر افغان اور بلوچ کے مقابلہ پر ہیچ ہے - سوائے ضلع چکانسر کے جو ایرانی علاقے سے متصل ہے - کنگ کے علاقہ میں ۰۰۰ را سربندی بھی آباد ہیں -
کنگ ڈویژن میں افغان عنصر مضبوط ہے غالباً اس لئے کہ وہ ایرانی دست درازیوں کو روک سکے - افاغنہ میں غلزئی اور ترین تعداد کے لحاظ سے کثیر اور تقریباً مساوی ہیں - ان کے بعد علی الترتیب علی زئی، سکزئی اور صیادی ہیں - ۱۹۰۴ میں غلزئی ۸۲۷ را تھے اور ترین ۸۷۱ را ؎۱ ترین مطلقاً خانہ بدوش نہیں ہیں اور صرف ۸۰ غلزئی راعیانہ زندگی گذارتے ہیں - علی زئی ۳۷۲ را تھے اور ان کے صرف ۲۵ خاندان غیر کاشت کار تھے - سکزی ۶۱۱ تھے جو سب کے سب زراعت پیشہ تھے - غیر افغان قبائل میں رخشانی غالب ؎۲ تھے - اور ۸۳۶ را نفوس پر مشتمل تھے - وہ سب زراعت پیشہ ہیں اور صرف ۴۰۰ چرواہے ہیں -

چکانسر کی آبادی :-

چکانسر کی آبادی بلوچ تھی جس میں فارسی دانوں کی کافی آمیزش تھی - یہ کل ۶۱۴ را ۲ تھے، اور سب زراعت پیشہ تھے - یہاں کے دلخفتی ۶۶۷ را ۴ تھے جو گئودار تھے یا چرواہے - صرف چار خاندان زراعت کار تھے -
لیکن ایران کے دلخفتی بلا استثنا زراعت پیشہ تھے -

؎۱ ترینوں کا اوسط سفالک انڈکس ۸۲۰۸، نیزل ۷۰۸ ،۶ اور اوسط آربٹو نیزل ۱۱۶۰۴ ہے - ترینوں، تراجیک اور بمبئی کے پارسیوں کا سفالک انڈکس گہری مطابقت رکھتا ہے - یہ بھی معنی خیز ہے کہ ترین زراعت کار اور تاجر ہیں -

؎۲ پیچھے دیکھئے آغاز باب میں -

صیّاد اور کُول :-

سیستانی آبادی کے دیگر حصّے صیّاد اور کُول ہیں۔ صیّاد سیستان کی جھیل پہ ماہی گیری اور طائر گیری پر گذارہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ توتن یا بیڑیاں بناتے ہیں جو اتنی ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ وہ جھیل کے ساحل کے ساتھ ساتھ سرکنڈوں اور گھاس پھوس کی بنی ہوئی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں پریوُن کے مغرب کی طرف شاہرستان میں صیّاد نہیں ہیں اور دیہات خالصتاً کاشتکار ہیں لیکن میاں کنگی کے جنگلاتی ضلع میں دیہہ صیّاد میں وہ ۴۸۲ تھے اور ان کا کدخدا جانی بھی صیّاد تھا (۱۹۰۴)۔ دیہہ صیّاد سکسر کے بائیں کنارے سے زیادہ دُور نہیں، صیّادک کی کچھ آبادی بھی صیّاد ہے۔ یہ گاؤں پریوُن کے دائیں کنارے کے قریب ہے اور صیّاد ہلمند کے گھاٹوں پہ بیڑیاں چلاتے ہیں۔ یہاں اُن کی تعداد ۸۰ تھی۔ اسی کے پاس گاؤں سفر میں چار پانچ صیّاد خاندان تھے۔ پریوُن کے کھوتیے ماہی گیری بھی کرتے ہیں۔ بچے اور بوڑھے ماہی گیری کرتے ہیں اور دیگر کام ہٹے کٹے لوگوں کے سپرد ہیں۔ ۱۹۰۴-۰۵ میں میاں کنگی ضلع میں صیّاد آبادی ۶۰۰ سے کم ہی تھی اور ان کی کُل تعداد ۵۰۰ را سے زیادہ نہ تھی۔ اس کے علاوہ صیّاد دیہاتیوں اور چرواہوں کو چٹائیاں[1] مہیا کرتے ہیں جو اس علاقے میں ضروری ہیں اور انکی آمدنی بڑھاتی ہیں۔ چٹائیاں دریائی گھاس کے پتوں سے بُنی جاتی ہیں، اور عورتیں، بوڑھے آدمی اور کمسن لڑکے لڑکیاں انہیں بناتے ہیں جو ماہی گیری نہیں کرسکتے یا توتن[2] نہیں چلا سکتے۔ میں نے دیکھا

---

[1] ایک آدمی زرد پتوں کا ایک گٹھا لیتا ہے اُسے چھ فٹ یا زیادہ برابر برابر کاٹتا ہے اور زمین پر رکھ کر پاؤں سے خوب مسلتا ہے حتیٰ کہ وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ پھر وہ ان کے لمبے ریشے چُنتا ہے۔ پتوں کے خول اُتارتا ہے اور انہیں ایک لمحہ میں چٹائی کی شکل دے دیتا ہے۔" اوور لینڈ ٹو انڈیا" جلد دوم، ص ص ۲۶۵ ر ۵۹۹ از سون ہیڈن۔

[2] جب مجھے اپنے مشن کے خیمہ کی چھت اور نمدوں کے نیچے بچھانے کے لئے چٹائیوں کی ضرورت پڑی

کہ صیّاد بول چال میں کافی عربی الفاظ ہیں اور جن اشیا کو وہ فارسی اور بلوچی الفاظ سے بیان کرتے ہیں ان کے بھی عربی مرادفات جانتے ہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ فارسی وانوں کی نسبت وہ فارسی کم اور بلوچی بہت ہی کم جانتے ہیں۔ ان کی روایات کے مطابق وہ عربی النسل ہیں اور یہ ان کے سانچۂ نقوش اور شکل کاسہ سے ثابت ہوجاتا ہے کیونکہ مجھے بلا پیمائش ان کے کاسہ ہائے سر فارسی وانوں سے چھوٹے معلوم ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ ان کے آبائو اجداد کوفہ سے آئے جہاں انہوں نے فرات پر وہ نیم آبی طرز حیات اپنائی جو وہ سیستان میں بھی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔[1] ان کی جھونپڑیاں چھوٹی چھوٹی کلّیوں میں بٹی ہوئی ہیں اور ہر کلّی کا اپنا اپنا کدخدا ہے۔ ہاموں کا پانی اور دلدلیں ان کلّیوں میں تقسیم ہیں جہاں وہ اپنی اپنی حدود میں کام کرتے ہیں اور اپنے کدخداؤں کو نقد محصول دیتے ہیں۔ چونکہ صیّاد اور گئودار آبادیاں غرقاب علاقے کے پانیوں اور نیزاروں پر واقع ہیں لہٰذا جھیل کے مختلف حصّے انہی کے مختلف ناموں پر پکارے جاتے ہیں۔

کُول یا زرعی غلام:-

کُول دیگر لوگوں سے بالکل علیحدہ ہیں۔ پست سماجی درجہ کی وجہ سے یہ اغلب ہے کہ وہ خرید کردہ

تو مجھے ہاموں پر ایک صیّاد گاؤں میں کہلوانا پڑا۔ چٹائیاں دو قسموں کی ہیں، سرِخانہ اور پشتِ خانہ۔ پہلی بھاری ہے، اور لمبے قطعوں یا مربعوں میں بنتی ہے اور چھت اور دیواروں کے کام آتی ہے۔ دُوسری اندر کے لئے ہیں، ہلکی ہیں اور نماز کی دری کے برابر ہوتی ہیں۔ دہقان انہیں نمدوں کی بجائے فرش پر بچھاتے ہیں۔ عربی لفظ حاثر (چٹائی) خلیج فارس کے سواحل پر مستعمل ہے جہاں چٹائیاں پیش یا نخلک سے بُنی جاتی ہیں۔ سیستانی ان سے بالکل ناواقف ہیں۔

[1] کوفہ کے شہر و ضلع میں بیشمار خارجی بغاوتیں ہوئیں اور وہ شکست کھاکر کرمان و خراسان آ گئے جہاں وہ منظم ہوگئے اور امن کو تہ و بالا کرتے رہے اور حکمرانوں کو دق کرتے رہے اور مغلوب ہونے سے پہلے خون کی ندیاں بہاتے رہے۔

یا بجنگ گرفتہ غلاموں کی اولاد ہیں جو اپنے آقاؤں کی زمینوں پر کام کرتے تھے ۔ وہ طرزِ حیات میں کاشتکار ہیں ۔ ان کا معتبر (۵۰ - ۱۹۰۳ میں) تاج محمدؒ تھا جو گورنر کا آلۂ کار تھا اور کیانیوں کو ذلیل کرنے کے لیۓ استعمال ہوتا تھا ۔ چنانچہ ملک گلزار خان کیانی کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی بیٹی تاج محمدؒ کول سے بیاہ دے ۔ یہ اس کی غیرت و ناموس پر ایسی چوٹ تھی کہ بوڑھے ملک کا دل ٹوٹ گیا[1]۔ لیکن تاج محمدؒ ایک قابل اور مستعد انسان ہے جو اپنے ذمّہ دارانہ عہدے پر پورا اُترا ہے ۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کا کارگزار رئیس ثابت ہوا ، اور اس کے حلقۂ اختیار میں نظم و نسق بہت عمدہ رہا ۔ دیگر کدخدا اُسے چھچھورا سمجھتے تھے لہٰذا وہ اپنے مُربّی کے احساسات و احکامات کا بیحد خیال رکھتا تھا ۔ وہ اس خوش بختی کا مستحق تھا ۔

اور اس کی بیوی دنیاوی اعتبار سے کبھی اتنی آسودہ حال نہ ہو سکتی اگر اُس نے اپنے ہی کسی خستہ حال افیم خور عمزاد سے شادی کی ہوتی ۔ تاج محمدؒ کی کم از کم اس بیوی سے ہونے والے بیٹے یقیناً اپنے آپ کو کیانی کہلائیں گے ۔

---

[1] ملک گلزار خان کا تاج محمدؒ کے والد سے جھگڑا ہو گیا تھا اور کول نے اُس کے بڑے دنوں میں اکی توہین کی مشتعل اور بے قابو ہو کر ملک نے اس پر گولی چلا دی اور اسے ڈھیر کر دیا ۔ پرانے وقتوں ۔ یہ ۔۔ اقعہ مخالفانہ تنقید کا موضوع نہ بنا ہوتا کیونکہ کول نے اپنے آقا کی بے حرمتی کی تھی ۔ قائن کے سردار اور گورنر حشمت الملک کو کیانی شہزادی سے شادی کی اجازت نہ دی گئی تھی کیونکہ اُس کی والدہ صرف درہ کے کدخدا کی بیٹی تھی لہٰذا بیٹے کو بھی وراثت میں اس کی پستی ملی تھی ۔ تاج محمدؒ نے حشمت الملک سے مداوا کی درخواست کی جو اُس وقت نصرت آباد میں تھا ۔ گورنر نے کیانی کے فعل پر سخت نفرت کا اظہار کیا ، امن شکنی کے لیۓ اُس پر جرمانہ عاید کیا اور خون بہا کے طور پر اُسے مجبور کیا کہ وہ اپنی ایک بیٹی کی شادی تاج محمدؒ سے کرے تاکہ خونی دشمنی ختم ہو حالانکہ یہ صرف مساوی ۔ لنسبہ لوگوں میں ہوتی ہے ۔ اُس وقت سے گورنر تاج محمدؒ کی پشت پناہ ہے اور اسے کدخدا بنا دیا ہے ۔ جس پر بالائی طبقہ ناراض ہے لیکن جزِ بزِ ہونے کے باوجود بے دست و پا ہے ۔

کُولوں کی تقسیم :-

شاہرستان میں کُول دیہات کے ایک حصّہ میں ہوتے تھے جیسے دیہہ کُول کہتے تھے ۔ یہاں اُن کی تعداد ۳۸۷ تھی ۔ دُوسرے حصّوں میں گاؤں کُولوں اور اوقاتیوں (ہوکات کے فارسی دان) میں بٹے ہوئے تھے اور یہاں وہ غالباً ۳۰۰ یا ۳۵۰ تھے ۔ دیہہ گُرگ کے ایک گاؤں میں کُول (۱۹۰۴ میں) ۱۷۲ تھے ۔ دیہہ خان محمد میں وہ کوئی ۲۰۰ تھے ۔ دیہہ اکبر شاہ نذر میں وہ ۸۶ تھے ۔ دیہہ جز نیک میں کل آبادی ۹۲۸ تھی جس کا آدھا حصّہ کُول تھا ۔ میاں کنگی کے دیہہ خانک (آبادی ۸۰۰) میں وہ غالباً ۴۰۰ تھے ۔ باقی چھوٹے چھوٹے دیہات میں تھے ۔ ۱۹۰۴ میں کُول یا زرعی غلام دو ہزار سے ڈھائی ہزار نفوس پر مشتمل تھے ۔

بختیاری اور جمشیدی قبائل :-

ملک عظیم خان اور ارباب سیف الدّین کی شہادت کے مطابق بختیاری[1] اور جمشیدی قبائل سقوط زاہدان (دسمبر ۱۳۸۳ تا جنوری ۱۳۸۴ء امیر تیمور) تک سیستان میں آباد رہے ۔ ان جنگجو قبائل کے پاس پہاڑ اور دشت تھے جو ہلمند کے ڈیلٹا کے گرد ہیں اور ان کے سرداروں کو فوجی خدمت کے بدلے یہاں زمینیں دی گئی تھیں ۔ کہا جاتا ہے کہ تیمور نے انہیں یہاں سے موجودہ مقامات پر منتقل کر دیا ۔ جب جمشیدیوں کے آغا (سردار اعظم) نے امیر افغانستان کو ناراض کر دیا تو وہ اپنے خاندان سمیت پناہ اور حمایت کے لئے سیستان آیا ۔ یہاں سے مایوس ہو کر وہ واپس اپنے ملک چلا گیا اور امیر عبدالرحمٰن کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ۔ اسے کابل بُلا لیا گیا ۔ یہ کہانی ارباب نے سُنائی ۔ مسٹر اُجفلوی کے مُطابق بختیاریوں کا سفالک انڈکس ۸۸ ہے گو اس کی تحقیقات "محدود مشاہدات پر مبنی ہونے کی وجہ سے کاملاً قابلِ اعتبار نہیں ہیں"[2] ۔ یہ دونو قبائل راعیانہ تھے ۔

---

[1] انہی کے نام پر زاہدان کا ایک دروازہ ' دروازۂ بختیاری کہلاتا ہے ۔
[2] " دی بلوچ ریس " ص ۱۱ ۔

اور ممکن ہے کہ وہ نکودری لٹیروں کا حصّہ ہوں جن کا صدر مقام روضتہ الصفا کے مصنّف کے مطابق سیستان میں تھا جہاں سے وہ یزد تک تاخت و تاراج کرتے تھے۔ آئندہ باب میں شہادت (قطعی ثبوت نہیں) پیش کی جائے گی کہ نکودری صدر مقام غالباً ہامون ماشکیل سے ملحقہ ضلع میں دہوار یا دیگوار تھا جو چودھویں صدی تک حدود سیستان میں تھا۔

سیستانی آبادی میں کمی :-

تیمور نے دارالحکومت تباہ کیا تو سیستانی آبادی بہت کم ہوگئی اور ہلمند کا پانی اور زرخیز زمین پندرھویں صدی کے اواخر اور سولہویں صدی کے اوائل سے نوواردوں کو یہاں دوبارہ کھینچنے لگی۔ جس شخص نے مجھے زاہدان کے کھنڈرات دکھائے اُس کا یہ کہنا محض ایک تمثیل نہیں تھی کہ اُس کے ہموطنوں کا خون بہہ گیا تھا اور وہ جامد و خامد اور بے حس و حرکت ہو کر رہ گئے تھے۔[ا]

ا۔ سیستانی آبادی کا مذکورہ قیاسی تجزیہ بہت مفید ہوتا اگر سیستان میں بشری پیمائش کی گئی ہوتی !

بَابِ چہارم

سیستان میں جَاٹ، گوجر اور اہیر

گواجر اور جواٹ کا ماخذ :-

اس موضوع کے مطالعہ کار اس پر متفق ہیں کہ جاٹ اور گوجر کسی راعیانہ جمعیت کے افراد تھے۔ جو ماوراالنہر سے بر آمد ہوئی اور سفید ہنوں[۱] سے منسلک، بلکہ شاید نسلی طور پر مربوط تھی اور یہ کہ جاٹ گوجروں کے ہم نسل ہیں لیکن اس نسلی تعلق کی تعریف ممکن نہیں[۲]۔ ان کے آباؤ اجداد کا اصلی وطن معلوم نہیں لیکن کرنل ٹاڈ نے انہیں وسط ایشیائی یا سیتھی ماخذ[۳] کے لوگ بتایا اور انہیں کلاسیکی مصنّفین کے سیتھی جیٹے[۴] کی اغلب اولاد قرار دیا۔ اس نظریے کو جزوی طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے اور گو اس کی کوئی ٹھوس شہادت پیش نہیں کی جاسکتی تاہم یہ قابل ذکر ہے کہ جیحوں (موجودہ سر دریا) کے پار کا کچھ علاقہ چودھویں صدی عیسوی تک جَٹا یا جِٹا کہلاتا تھا اور نقشۂ ترکستان کے ابتدائی نمونوں نے اس نام کو دوام بخش[۵] دیا۔ چودھویں صدی میں تیمور نے جٹا کے علاقہ

---

۱ ارلی ہسٹری آف انڈیا، وی اے سمتھ، ۱۹۰۸، دوسرا ایڈیشن، ص ۳۰۳۔

۲ ایضاً، ص ۳۷۷۔

۳ "اب کسی کو شبہ نہیں کہ یوریشیائی سیتھی محض ایرانی زمرہ کی بیرونی، غیر مہذب پٹی تھے۔ اور سیتھی السنہ کا ژند اور فارسی سے تعلق خاص بھی شک و شبہ سے بالا ہے" جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی، جنوری

میں کئی مہمّات کی سرکردگی کی۔ سمرقند سے کُوچ کر کے اُس کے لشکر جیحون کو پار کرتے تھے، جسے آب خجند بھی کہتے ہیں کیونکہ اسی کے پتن کو لشکر استعمال کرتے تھے۔ تاشقند میں سے بھی اکثر گذر ہوتا تھا۔ جٹا سے پرے دشت قبچاق اور مغولستان تھے اور ایک دفعہ تو تیموری لشکر کو دریائے اِرتش تیر کو عبور کرنا پڑا۔ کاروائی اسی کُل کی طرف کی جاتی تھی اور علاقے کی مضبوطی کا خاص طور پہ ذکر کیا گیا ہے[1]۔ اُن دنوں میں جٹا پہ مغل قبائل کا قبضہ تھا اور قمرالدّین (سردار دوغلات) تیمور کا مُہیب ترین دشمن تھا۔

کلاسیکی مصنّفین نے سیبتھی مسّا جوڑئے کو جیحوں پار یہ حیثیت دی ہے۔ تیمور اور جٹا فوجوں کے پہلے تصادم کے دوران ایک اور عجیب وغریب نام بھی مذکور ہے۔ تیمور جیحوں کے بائیں کنارے پر مصروفِ فتوحات تھا کہ اسے دریا کو دوبارہ عبور کر کے جٹا حملے کو پسپا کرنا پڑا۔ غنیم کا ایک دستہ بھگا کر تیمور میدان گجرات[2] میں ٹھہرا۔ یہاں سے وہ کِش کی طرف بڑھا اور دشمن ایک جٹا داروغہ کے تحت پیچھے ہٹتا گیا۔ میدان گجرات اس لئے معنی خیز ہے کہ گوا جرا اور سفید ہُنوں کے درمیان کسی دَور ابتدائی میں بہت گہرا تعلق تھا اور مؤخرالذکر نے وادیٔ جیحوں کا سارا علاقہ قبضے میں لے لیا تھا۔

١٩٠٦ء، ص ١٩٨۔

[4] مَسّا جوڑئے، مَسّا = موجودہ بلوچی لفظ مزن = عظیم لہٰذا نام کا معنی ہوا ' عظیم جٹ یا جاٹ ؟

[5] نقشہ کے تازہ ایڈیشنوں میں روسی ناموں نے ضلعوں اور جگہوں کے قدیم نام بدل دیئے ہیں، جو اب صرف انہی مشہور قصبوں کے باقی رہ گئے ہیں جو روسیوں کی فتح وسط ایشیا سے مدّتوں پہلے موجود تھے۔

[1] مختلف مہمّات علی یزدی کے ظفر نامہ میں مذکور ہیں۔ فارسی متن، ببلی اوتھیکا انڈیکا۔ کلکتہ، ١٨٨٧ء۔

[2] ظفر نامہ ۔ ص ٨٦۔

ہندوستان میں روایات :-

ہندوستان کے گواجر اپنے وطن اصلی کی تمام روایات کھو بیٹھے ہیں۔ جواٹ کا حال بھی ایسا ہی ہے لیکن پنجابی جواٹ میں ہندوستان کی طرف اُن کی آخری نقل وحرکت کی روایت موجود ہے۔ ان کا ذکر بعد میں آئے گا۔ یہ کہنا حیرت انگیز نہ ہوگا کہ جواٹ اور گواجر سن عیسوی سے ایک صدی یا اس سے زیادہ بیشتر وسط ایشیا سے آئے اور جاہل اور محض زبانی روایات پر انحصار رکھنے کی وجہ سے وہ تھوڑے عرصہ بعد سب کچھ بھلا بیٹھے جو جواٹ کو سیجوں اور گواجر کو جیجوں سے ملا سکتا تھا۔

سیستان ایک درمیانی کڑی :-

سیستان ان ممالک اور ہندوستان کے درمیان کی کڑی تھا اور سیستانی آبادی کے ایک حصّہ اور بالائی ہند کے جواٹ و گواجر کے درمیان تعلق قائم کرنا ممکن ہوگا۔ لہٰذا سیستانی آبادی کے اس حصّہ کو بیان کرنا اور پھر اسے ہندوستانی قبائل سے جوڑنا بہتر ہوگا۔ اور آخر میں ہندوستانی جواٹ کی روایات کا بیان ہوگا۔

سیستان میں جواٹ کی دریافت :-

سیستان مشن کی جائزاتی کاروائیوں کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ بار اج جواٹ ایک جزو آبادی تھے۔ اس سے میں مزید تجسّس وتفحّص سے کام لینے لگا۔ تاکہ آبادی کے جاٹ عنصر پر مزید روشنی پڑ سکے۔

جاٹ نام :-

۱۹۰۴ میں دیہہ نواب جواٹ کا گاؤں تھا اور ان کا کدخدا بھی جاٹ تھا۔ کود اور درمال کے دیہات میں بھی جاٹ آبادی تھی جو تقریباً ۷۰۰ تھی۔ یہ اپنے آپ کو جاٹ کہتے تھے۔ لیکن اغلب ہے کہ بعض دیگر نامعلوم ماخذ کے لوگ بھی اسی نسل کے ہیں مثلاً کلادی (یا کُلّوئی) پٹے لیشم، نوُری، دہاکاکی (جو اپنے کو بلوچ کہتے ہیں) سنادگل، بارُونی، پنجیکا شیخ ویسی اور میر ویسی

(جو قندھار کے ارد گرد بھی ہیں) تلّ شہر یاری: پری، سفید خاکی، سیاہ سَر (جو بلوچ کہلاتے ہیں لیکن کاشت کار ہیں) بیلہ، خمرّ، زور، قروتِ خر، خلیل، پُدنا، گتلوک، بازی، درنی، شیخ لوزی، جُز، الادو، راھدار، کرم کُشتہ، آوازی، صوفی، خضری (خزری) اور رہاز ــــ سیستانی اور پنجابی کاشتکاروں کے چہرے مہرے کی مشابہت غالباً اتفاقی نہیں بلکہ ہم نسلی کا نتیجہ ہے[1]۔

مذکورہ قبائل میں سے کلوی یا گلوی بلاشک وشبہ جاٹ ہیں۔ مہاگگی غالباً نوشکی کے جنوب مغرب کو ہجرت کر گئے جہاں ایک پست چٹانی پہاڑی پر واقع ایک گاؤں کا کھنڈر انہی کے نام پر ہے۔ مذکورہ قبائل محنتی کاشت کار ہیں اور سیستان کے مزدور طبقہ کی اکثریت ہیں۔ جاٹ فارسی دان کہلاتے اور سمجھے جاتے ہیں۔ وہ فارسی بولتے ہیں اور دیگر قبائل بھی فارسی بولتے ہیں جو غالباً جاٹ ہو سکتے ہیں۔

گئو دار قبائل :-

گئو دار یا مالدار دہ مردا، سَروُنی، کلب علی، آبل اور دُلحفتی ہیں۔ دُلحفتی دُلحق کے رہنے والے ہیں جو قندھار ہرات تجارتی شاہراہ پر واقع ہے اور دلآرام کے مغرب میں ایک منزل دُور ہے۔ سروُنی کو ایران میں سَر دِینی بھی کہتے ہیں۔ گئو دار صرف معمولی حد تک کاشت کار ہیں۔ دہ مَردا بھی کہیں کہیں زراعت کرتے ہیں لیکن ان قبائل کی دولت ان کے ریوڑ ہیں جو وہ ہاموں کے نیزاروں میں چراتے ہیں۔

کاشت کاروں کے نیزاروں میں اپنے باڑے ہیں اور وہ غلاموں یا ملازموں کے سپرد ہوتے ہیں۔ عمُوماً کاشت کار گئو دار وہی ہوتے ہیں جن کے پاس جانور کم ہوتے ہیں۔

---

[1] یہ مشابہت میرے پنجابی ماتحتوں نے دیکھی اور وہ اس پر تبصرہ کرتے رہے لیکن سیستانی فلیٹ کیپ پہنتے ہیں جو اُن کی شکل وشباہت کو ممیز کرتی ہے۔

اُن کا طرزِ زندگی :-

کاشت کار مستقل رہائش گاہوں میں رہتے ہیں لیکن مالدار کی مستقل رہائش گاہیں نہیں ہوتیں۔ وہ چٹائیوں کی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں جنہیں ہوا سے محفوظ رکھنے کے لئے چھتوں اور دیواروں کو سرکنڈوں کے گٹھّوں سے بالکل ڈھانپ دیا جاتا ہے۔ ہلمند کی طغیانی کے وقت اور ہاموں کی اُونچی آبی سطح کے دوران گئو دارہ اپنی جھونپڑیاں بلند ترین سطح آب سے اُونچی بناتے ہیں۔ پانی اترنے کے ساتھ ساتھ وہ بھی نچلی طرف آتے رہتے ہیں حتیٰ کہ سردی میں وہ ہاموں کے طغیانی پذیر حصّہ میں آ رہتے ہیں۔ اپنے جانوروں اور جھونپڑیوں کو کسی عارضی اور اتفاقی اضافہ آب سے بچانے کے لئے وہ اپنی جھونپڑیوں کے گرد مٹی کے پُشتے بنا لیتے ہیں اور کھودی ہوئی مٹی کو ان کے باہر کی طرف لگا دیتے ہیں۔ گھروں کے سامنے جانوروں کے لئے کافی خشک زمین رکھی جاتی ہے جہاں وہ رات کو آرام کرتے ہیں یا جھونپڑیوں کے احاطوں میں ہی ان کے لئے علیحدہ پُشتہ دار باڑے بنا دیئے جاتے ہیں۔ نیز ارکا رقبہ سب میں تقسیم کیا ہوا ہے۔ ان کے گرمائی، سرمائی اور معتدل موسم کے مکان سال بسال وہی رہتے ہیں اسی لئے ان کے پُشتوں پر گھاس اُگی ہوئی ہوتی ہے۔ چونکہ سرکنڈوں سے ہی جھونپڑیوں کی چٹائی بنتی ہے لہٰذا آئندہ سال کے لئے ان کے کُپ بنا لئے جاتے ہیں۔ تاکہ بوقت نقل و حرکت کام آسکیں۔

اُن کے مکانات :-

چٹائیاں تمرس کی شاخوں اور تنوں کے بڑے بڑے حلقوں کے اُوپر بچھائی جاتی ہیں جن کے سرے مضبوطی سے زمین میں گاڑے جاتے ہیں۔ چونکہ جھونپڑیاں بارہ تیرہ فٹ لمبی اور پانچ چھ فٹ اُونچی ہوسکتی ہیں اور چٹائیاں عموماً ۱' × ۴' کے ٹکڑے ہوتے ہیں لہٰذا وہ حلقوں پر بچھائی جاتی ہیں اور ان سے خوب مضبوط باندھی جاتی ہیں۔ جھونپڑی ایک چھکڑے کی ترپال معلوم ہوتی ہے۔ جو زمین پر رکھی ہوئی ہو۔ کھلا سرا یا دروازہ جنوب کی طرف ہوتا ہے اور مقابل سرے کو

چٹائیوں سے ڈھک دیا جاتا ہے اور سردی میں اُس کے اِرد گِرد اُونچے سرکنڈوں کے گٹھے رکھ دیئے جاتے ہیں اور چھپتوں کی مزید حفاظت کے لئے ان پر بھی گٹھے ڈال دیئے جاتے ہیں۔ جھونپڑیاں ملی جلی ہوتی ہیں تاکہ بادِ تند میں ایک دوسرے کا سہارا ہوں اور مزید یہ کہ شمالی اور شمال مغربی کٹیلے جھونکوں سے جانوروں کو بچا سکیں جو عموماً رات کے وقت ہوا کے رُخ پر بیٹھتے ہیں۔ کمزور یا خاص طور پر قیمتی جانور (عموماً دودھیل گائیں) رات کے وقت بوسیدہ اُونی کپڑوں یا کمبلوں وغیرہ کے چیتھڑوں سے ڈھانپ دیئے جاتے ہیں جنہیں ایک دوسرے سے سی کر کئی تہیں موٹا کر دیا جاتا ہے۔[1]

سیستانی مال مویشی :-

یہ غلاف دودھ دوہنے کے وقت یعنی آٹھ نو بجے صبح کے بعد جانوروں کو نیزاروں میں لے جانے سے پہلے اُتار دیئے جاتے ہیں۔ جانور عموماً ایرانی نسل کے ہوتے ہیں۔ جن کی کوہان برائے نام ہوتی ہے اور جن میں سے بڑے اور عمدہ جانور شکل وصورت میں انگریزی جانوروں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ یہ عموماً سیاہ اور بعض اوقات گہرے بھورے اور شاذونادر دورنگے یعنی سیاہ وسفید ہوتے ہیں۔ سیستانی جانور بہت قیمت پاتے ہیں اور افغان حکومت کی پابندیوں اور محصولات سے پیشتر قندھار، ہرات اور مشہد سے ان کی تجارت زوروں پر تھی۔ جب ملک میں امن ہوتا تو جانوروں کے بڑے بڑے گلّے چالیس پچاس بندوقچیوں کی حفاظت میں منزل بہ منزل ان شہروں کی طرف ہنکائے جاتے تھے اور راستے بھر بھی ان کی مقامی خرید وفروخت جاری رہتی۔ اب صرف مشہد کے ساتھ معمولی تجارت ہوتی ہے

---

[1] وادئ ہلمند میں کمیاب جانور جیسے گدھے اور خچر عموماً رات کو زمین دوز حصوں میں رکھے جاتے ہیں۔ کئی گز کا ایک مربّع سوراخ کھودا جاتا ہے اور تمرسک کی شاخوں سے مسقّف کیا جاتا ہے۔ اور ایک ڈھلوان راستے سے انہیں اندر لایا جاتا ہے۔

جو سیستان سے قریباً ایک ماہ کا سفر ہے ۔ جانور اب بھی قریباً اُسی قیمت یعنی ۳۰ تومان پر بکتے ہیں، جیسے ۱۸۳۹ میں فنولی کی سیاحت سیستان پر بکتے تھے۔ اُسوقت سے تجارت سُست پڑگئی ہے کیونکہ جانوروں کی تعداد کم ہوگئی ہے ۔ قحط کے بعد ۳-۱۹۰۲ کی سرمائی حیواناتی بیماری کے حملے میں سیستان کے کوئی پچھتر سے اسّی فیصد جانور اور بھیڑیں بکریاں ضائع ہو گئے اور ان کی تلافی کے لئے کئی سال لگیں گے ۔ صرف نمک خور جانور ہی سیستان میں پھل پھُول سکتے ہیں ۔ چند سال پہلے بھینسیں بھی یہاں لائی گئیں لیکن وہ اس آب و ہوا کی عادی ہونے سے پہلے ہی مر گئیں ۔

گئو داروں کی قسمیں :-

گئو داروں کی جھونپڑیاں کسی حد تک گھناؤنی ہوتی ہیں ۔ ایک خاندان کا ساز و سامان عموماً ایک چرخے ، ایک بھاری چوبی جھُولے (اکثر و بیشتر موروثی) اور آٹا پیسنے کی چکّی پر مشتمل ہوتا ہے ۔ یہ چیزیں عموماً جھونپڑیوں کے باہر رکھی جاتی ہیں ۔ اندر کے فرش پر چٹائیاں اور نمدوں اور غلافوں کے گندے ڈھیر ہوتے ہیں جو دیکھنے میں بہت جاذبیّت اور قدامت کی موروثی یادگاریں معلوم ہوتے ہیں ۔ کبھی کبھار ایک توڑے دار بندوق بھی دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی یا جھونپڑی کے ڈھانچے سے لٹکی ہوئی نظر آجاتی ہے ۔ لوگوں کی شکل و شباہت بھی جھونپڑیوں کی طرح گھناونی ہے ۔ عورتیں بہت جلد بوڑھی ہوجاتی ہیں لیکن نوجوان لڑکیوں میں بے حد آرز و انگیز حسن پایا جاتا ہے ۔ بڑی بڑی چمکدار آنکھیں، واضح خد و خال ، موٹے ہونٹ اور اکثر بالائی ہونٹ میں گڑھا ، سر کے بال کن پٹیوں اور رخساروں تک پھیلے ہوئے ، کافی بال اور تنومند جسم، وہ پردہ نہیں کرتیں ، اور اکیلی ہوں تو شرماتی نہیں ، کئی جگہ سے پھٹا ہوا گندہ بوری نما لبادہ گھٹنوں کے نیچے تک پہنتی ہیں جسے نیلا یا سُرخ رنگ دیا جاتا ہے ۔ گردن میں کچھ بھڑکیلے زیورات اور سر کے گرد ایک رنگین رُوباف ۔ اُن کی جلد بھُورے رنگ کی ہے لیکن عدم صفائی کی وجہ سے قدرتی رنگ مدھم پڑ جاتا ہے ۔ مرد ایک لمبا کوٹ پہنتے ہیں جس میں کمر کے گرد ایک پیٹی ہوتی ہے ۔ اس کے علاوہ پگڑی اور سفید

سُوتی پاجامے استعمال کرتے ہیں بشرطیکہ استطاعت ہو۔ غریبوں کا لباس سوتی لبادہ ہے جو کمر پر
پیٹی دار ہوتا ہے اور گھٹنوں کو چھوتا ہے۔

اگرچہ ان کے امیر آدمی بھی گھناؤنے ماحول میں رہتے ہیں تاہم ان کے غلاموں اور ملازموں
کے زیرِ انتظام حیوانانی اڈّوں کے حالات تو ناقابلِ تصوّر حد تک خوفناک ہیں۔ ایک اڈّے کا
مندرجہ ذیل بیان ذاتی مشاہدہ کا نتیجہ ہے۔ یہ اڈّہ چُنگ بِرنجک میں تپہ کوہلک کے اُوپر واقع ہے
جو ۱۹۰۵ میں دیکھا گیا۔ یہ باڑہ چالیس پچاس فٹ قطر کی تمرس کی شاخوں سے بنایا گیا تھا۔ ہوا کے
رُخ پر ایک ۱۰ فٹ اونچا پردہ باڑے کے دونو طرف پھیلا ہوا تھا تاکہ جانور اور چوکیدار ہوا سے
محفوظ رہیں۔ چوکیدار تین آدمی اور تین عورتیں تھیں۔ یہ سب چیتھڑوں میں ملبوس تھے جو مشکل ہی
عریانی کو روک سکتے تھے۔ دن کی دھوپ اور رات کی اوس سے بچنے کے لئے کوئی چھت
نہ تھی۔ چند دریدہ چٹائیاں ان کا بستر تھیں اور انہیں اپنے آپکو گرم رکھنے کے لئے پردے کی آڑ
میں ایک دُوسرے سے مل کر گٹھڑی بننا پڑتا ہوگا۔ ایک جل بھری کشتی میں وہ دُودھ اور مکھن
گوّ داروں کے دیہات میں پہنچاتے تھے (جو میاں گنگی میں کاشت کرتے تھے) جس دن میں
وہاں گیا اُس دن ان بدبخت چوکیداروں نے آگ بجھا دی تھی۔ قریب ترین گاؤں ۳ میل دُور تھا،
جہاں سے آگ بصد مشکل لائی جاسکتی تھی۔ انہوں نے مجھ سے دیا سلائی کی ایک ڈبیہ مانگی اور میں
نے انہیں گندھک کی دیا سلائیوں کا ایک پورا ڈبّہ دے دیا جس پر انہوں نے ایک حیرت انگیز
تشکّر و امتنان کا اظہار کیا۔ ڈھیری پر گوبر کی وجہ سے ایندھن کافی تھا کیونکہ باڑے میں گوبر ایک
فٹ گہرا تھا۔ بڑے باڑوں میں بھی یہی حال ہے لیکن وہاں گوبر سکھا کر ڈھیر کی صورت میں جمع
کر لیا جاتا ہے۔ رات دن جھونپڑیوں کے آگے آگ سلگتی رہتی ہے اور ان کے قلیانوں' اور
کھانا پکانے کے کام آتی ہے۔ چند برتن دُودھ گرم کرنے
کھانا پکانے کے لئے ہوتے ہیں جو گندے ہوتے ہیں اور یہی ایک گوّ دار گھرانے بلکہ
گھروندے کی کل کائنات ہے۔ گھی (روغن) بیچ دیا جاتا ہے یا اس کے بدلے مطلوبہ
چیزوں کا تبادلہ کر لیا جاتا ہے۔

دَہ مردا، دُلخقی، سردنی وغیرہ :-

۱۹۰۴ میں افغان علاقے میں ۸۶۳ دہ مردا گنوّ دار گھرانے تھے اور ۱۷۰ کاشتکار گھرانے جن کے کچھ جانور بھی ہوں گے۔ دُلخقی ۱۳۱۸ گھرانے خالصتاً گنوّ دار اور ۴۰ گھرانے کاشت کار تھے۔ سردنی ۲۱۹ گھرانے گنوّ دار اور ۲۰ گھرانے کاشت کار تھے۔ کلب علی کے ۶۱۸ گھرانے مالدار اور ۵۵ زراعت کار تھے۔ آبل کے ۱۴۵ خاندان گنوّ دار اور ۹۴ زراعت پیشہ تھے۔

ان اعداد و شمار میں ان قبائل کے وہ حصّے نہیں ہیں جو ایرانی دیہات کے دیگر قبائل کے ساتھ ہی شمار کر لئے گئے اور اب ان کا علیحدہ شمار ناممکن ہے۔ کُل خالصتاً گنوّ دار گھرانے ۱۹۰۴ میں کوئی ۱۱۴۱ رہے تھے۔ اگر ایک معتدل اندازے کے مُطابق ہر گھرانے کے پاس دَس جانور ہوں تو ان کے پاس ۱۱۰۰۴۳ جانور ہوں گے اور ان میں کاشت کاروں کے جانور شامل نہیں ہوں گے۔ ایک دو سال بعد سرہون ہیڈن ذکر کرتا ہے کہ ہامون سیستان کے پار اُسے ایسے گنوّ دار گھرانے ملے جن میں سے ہر ایک کے پاس ۱۰۰ جانور ہوں گے۔ سکزی گنوّ دار ان میں شامل نہیں اور ان کے پاس ایک ہزار جانور تو ضرور ہوں گے[1]۔

ہامون سیستان اور سندھ کا ڈیلٹا :-

جانور دِن کے وقت سردی میں نیزاروں میں اپنا پیٹ بھرتے ہیں اور شام تک واپس ان خشک جگہوں پر آجاتے ہیں جو ان کے رین بسیرے ہیں۔ محافظ اور چرواہے سرکنڈ دل میں اپنے بجرے چلاتے ہیں اور بچھڑے ہوئے جانوروں کو اکٹھا کرتے ہیں اور انہیں گھر کیطرف

---

[1] دیہاتی سکزیوں کے پاس بھی جانور ہیں اور وہ انہیں خشک زمین پر چراتے ہیں۔ سرہون ہیڈن شاہرستان کے پاس انہیں چرتے ہوئے دیکھ کر متاثر ہُوا" اور لینڈ ٹو انڈیا" جلد دوم ص ۲۶۵۔ زیادہ تر جانور میان کنگی اور چکانسر اضلاع میں ہیں اور نیزار ہاموں میں چرتے ہیں۔ صرف تھوڑا سا حصّہ افضل آباد کے نیزار میں چرتا ہے۔ بہار سے سیّاح نے ہاموں کو پار کیا۔

ہانکتے ہیں۔ سیستانی گئو داروں کو دیکھ کر مجھے وہ جاٹ برادریاں یاد آ گئیں جو کیتی بندر سے نیچے سندھ کے ڈیلٹا کے پست زرخیز میدانوں (اُس دریا کے اُچتو اور حیدری دہانوں کے درمیان) میں اپنے ریوڑ چراتے ہیں۔ اس سارے علاقے میں کافی کافی فاصلے پر جانوروں کے باڑے پھیلے ہوئے ہیں۔ مالداروں کے گھروندے اُونچے اور مضبوط پشتوں میں محصور ہیں، تاکہ پانی اندر نہ آ سکے کیونکہ مد کی لہریں ان میدانوں کو زیر آب کر دیتی ہیں۔ باڑے بھی اسی طرح بچائے گئے ہیں۔ مد کی لہروں کے وقت جھونپڑیوں کے جھنڈ دُور سے پانی میں ایستادہ معلوم ہوتے ہیں اور ہر ایسی بستی کے پاس ایک کشتی ہے تاکہ ایسے وقت باہمی رابطہ قائم رہ سکے۔ کیونکہ اس علاقے میں مدوجذری کھاڑیوں کا ایک جال بُنا ہوا ہے جو مختلف عرض و عمق کی ہیں اور پانی کے اُتار پر بھی خشک نہیں ہوتیں۔ زرخیز میدان دُوب سے ڈھکے ہوئے ہیں جہاں جانور ان کے زیر آب آنے پر بھی چرتے رہتے ہیں۔ ان جاٹوں کے پاس بھینسیں بھی ہیں اور بیل تو کامل مد میں کم گہرے حصّوں میں رہتے ہیں لیکن بھینسیں گہرے پانیوں میں بھی چلی جاتی ہیں۔ اکثر مشاہدے میں آتا ہے کہ بھینس کی پشت تو پانی سے باہر ہے لیکن منہ سطح آب سے نیچے ہے جہاں سے ڈوبی ہوئی گھاس کا مُچّا لیکر وہ سر پانی سے باہر نکال کر اسے چباتی ہے۔

سیستانی گئو دار قبائل کے نام گو مختلف ہیں (جیسے ہندوستانی جواٹ و گواجر کے) تاہم وہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ (جیسے مذکورہ ہندوستانی قبائل) اور عملاً وہ ایک ہی جمعیت ہیں۔ جو پاس پاس رہتی ہے اور زرعی آبادی سے بہت نمایاں طور پر مختلف ہے۔ کاشت کار فارسی بولتے ہیں اور نسبتاً مہذب ہیں لیکن گئو دار فارسی واجبی سی ہی سمجھتے ہیں۔ سوائے ان کے جو دیہات کی کاشت کار آبادی میں جذب ہو گئے ہیں۔ چرواہوں کی اپنی ہی زبان ہے، وہ بلوچی بھی اچھی طرح نہیں سمجھتے اور عموماً فارسی دان کاشت کاروں سے نچلی سطح تہذیب پر ہیں۔ گئو دار گھرانے وضع قطع اور طرز زندگی میں ہندوستان کے صوبجات متحدہ کے تحت کو ہی علاقوں کے گوجر گھرانوں سے مشابہ ہیں اور یہ ثابت کرنا ممکن ہے کہ یہ مشابہت

اتفاقیہ نہیں ہے۔ جسمانی ساخت میں بھی گنوٗ دار کاشت کاروں سے مختلف ہیں۔ وہ موٗخرالذکر کی نسبت لمبے، اکہرے جسم کے اور ہلکی پھلکی ساخت کے ہوتے ہیں۔

سندھ کے نمریا اور ان کی روایت:-

سندھ کے ضلع کوہستان میں نمریا آباد ہیں۔ یہ ٹھٹھہ مردی کا چربہ ہے اور یہ لفظ ابوالفضل کی آئین اکبری میں استعمال ہوا ہے اور سترھویں صدی تک جاری رہا۔ نمری کسی وقت ایک غارتگر لوگ تھے لیکن اب وہ شتر دار، چرواہے اور ضلع کوٹڑی میں کاشت کار بن کر پُر امن زندگی گذار رہے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ پنجاب اور ہندوستان کے گواجر سے ملتے جلتے ہیں۔ چند سال پہلے مجھے ضلع کراچی کے تھانہ بولا خان کے نمریوں سے ایک روایت ملی کہ وہ کسی وقت کسی اردو کا حصہ تھے جو ایران میں وارد ہوا، اور وہاں سے ہندوستان آیا۔ یہ اردو دو حصوں پر مشتمل تھا: ٹھٹھہ مردی اور دہ مردی۔ نمردی تو ہندوستان آگیا لیکن دہ مردی وہیں رہا۔ لہٰذا یہ نتیجہ بعید از قیاس نہ ہوگا کہ نمری روایت کے دہ مردی ہمیں سیستان کے دہ مردا میں مل گئے ہیں۔ اور یہ لوگ کسی دور رفتہ و گذشتہ میں اکٹھے زندگی گذارتے رہے اور سیستانی دہ مردا اور نمریان سندھ ہم اصل و ہم نسل ہیں۔

ان دونوں کا باہمی تعلق صرف اس روایت پر منحصر ہے لیکن روایت مزید بتاتی ہے کہ نمریوں کے سندھ میں آنے سے پہلے اُن میں دوسری دفعہ ایک تقسیم ہوئی جس سے ان کا ایک حصہ بلوچستان میں رہ گیا اور ریاست قلات کے جھلاوان ڈویژن کے براہوئی قبائل کا ایک جزو بن گیا[1]۔ سیستانی دہ مردا اور سندھی نمردی کا تعلق شک و شبہ سے بالا ہو جاتا اگر سیستانی دہ مردی کی بھی کوئی روایت ہوتی لیکن موخرالذکر کے ساتھ رابطہ اتنا گہرا نہ ہو سکا کہ ان کی روایات کی تحقیق ہو سکتی۔ وہ اتنے علیحدگی پسند اور شرمیلے ہیں اور فارسی اور بلوچی سے اتنے نابلد ہیں کہ افہام و تفہیم محال ہے

---

[1] یہ صحیح ہے۔ دیکھئے بلوچستان گزیٹئر سیریز جلد ششم ب، جھلاوان، ص ص ۸۲ و ۸۳

لہٰذا تحقیق رُک گئی۔ ویسے بھی گُنو داروں کی اکثریت افغان علاقہ میں ہے لہٰذا اُن تک آزادانہ رسائی ناممکن تھی اور اُن کی جہالت اور حجاب پر قابو پانا بجید مشکل تھا۔ لہٰذا اسپسنانی وہ مرداور سندھی نُریوں کے تعلق پر صرف سندھی روایتِ ضعیف پہ ہی اکتفا کرنا ہوگا جو مجھے مؤخرالذکر میں چند سال پہلے اتفاقیہ طور پر مل گئی تھی۔

سندھی نُری اور گوجر نو وارد :-

سندھ کے نُریوں اور پنجاب وغیرہ کے گواجر کا طرزِ زندگی ایک جیسا رہا ہے اور ایک جیسا ہے۔ جب قانون شکنی اور غارتگری بلاخوف وخطر ممکن نہیں رہی تو یہ کہنا بعید از قیاس نہ ہوگا کہ سندھ کے نُری گورجرا یا گوجر ار دو کا ایک حصّہ تھے جو ہندوستان میں وارد ہوا[1] اور جس کا ایک حصّہ کچھ وقت بعد راجپوتانہ اور گجرات میں سیاسی بالادستی حاصل کر گیا۔ اور صدیوں تک اس پر حکومت کرتا رہا۔ اس کا ابتدائی دارالحکومت بھیل مال (بھیسن مال، شری مال) تھا جو کوہِ ابُو سے کوئی ۵۰ میل شمال مغرب کو ہے۔ بھیسن مال اب ریاست جودھپور میں ثانوی حیثیت کا قصبہ ہے۔ یہی بہت سے موجودہ راجپوت قبائل اور کچھ کمتر درجے کی ذاتوں کا سرچشمہ بنا[2]۔

گوجر، جاٹ، اہیر اور گولہ :-

اس میں کسی کو کوئی شک نہیں کہ موجودہ لفظ گوجر، گوجرا (کُوچے لو بمصداق ہیون سانگ) کا باقیہ ہے جو گورجرا کی بول چال کی شکل ہے۔ گوجر ایک مشہور اور طاقتور ذات ہیں جو راجپوتانہ، پنجاب کے بعض حصّوں، صوبجات متحدہ کے شمالی ضلع اور متوسط ہند میں کافی تعداد میں آباد ہیں۔ وہ بنیادی طور پر چرواہے ہیں اور ان میں لُوٹ مار کا رجحان غالب ہے لیکن دَورِ حاضر میں

---

[1] جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی، جنوری ۱۹۰۹، راجپوتانہ اور قنوج کے گورجرا از وی اے سمتھ، ص ۵۳ -

[2] ایضاً، ص ۶۴ -

زراعت پر مرکوز ہونے پر مجبور کر دیئے گئے ہیں۔ وہ جاٹ سے گہرا رشتہ رکھتے ہیں جن سے وہ جسمانی ساخت میں بھی ملتے جلتے ہیں۔ وہ آہیر اور گولوں سے بھی منسلک ہیں۔ ایک مشہور ضرب المثل ہے کہ "جاٹ، گوجر، آہیر اور گولا چاروں لنگوٹیئے یار ہیں"۔

آبل اور آہیر :-

میرے خیال میں آبیل (ہابیل اور آبیل اسی کی مختلف شکلیں ہیں۔ سیستان میں یہ ایک بہت پرانی نسل ہے جس کے نام پر ہاموں کے اوپر کے ڈھلوان چبوترے دشت ہابیل کہلاتے ہیں۔ یہ سیستانی گنّودار وں سے بہت گہرا رابطہ رکھتے ہیں) اس نسل کا پارہ ہیں جس نے بحیرہ عرب کے شمالی ساحل کو ابھیریا کا نام دیا اور جو مذکورہ ضرب المثل کی تیسری نسل کے مورث تھے۔ یعنی ہندوستان کے آہیر[1]"۔

"تمام مبصرین (بہ استثنائے سرایچ رسلی) اس پر متفق ہیں کہ گوجر اور جاٹ غیر ملکی آبادکاروں کی اولاد ہیں اور گوجر خصائص سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے آباؤ اجداد راعیانہ اُردو تھے۔ لہٰذا یہ یقین کافی حد تک جائز ہے کہ گوجر اوسط ایشیا کے سٹیپ کے میدانوں کے راعیانہ خانہ بدوش تھے جو غالباً ہُنوں کی شکست کے بعد چھٹی صدی میں ہندوستان میں داخل ہوئے"۔

افغان اور بلوچ قبائل میں جاٹ اور گوجر عنصر :-

یہ حقیقت ہے کہ جاٹ سیستان میں موجود ہیں اور یہ اغلب ہے کہ سیستانی گنّوداروں اور ہندوستانی گوجروں کے درمیان ایک تعلق واقعی ہے جو اس سلسلۂ شواہد کی ایک اہم اور دلچسپ کڑی ہے جو ہندوستانی جاٹ و گوجر کو وسط ایشیا سے ملاتی ہے۔ جیجوں و سیحوں کا درمیانی علاقہ جبا! ہلمند کے مغرب اور گرشک کے شمال کے علاقہ زمینداور میں گوجر ہیں۔ افغانستان

---

[1] ہندوستان کا مغربی ساحل اور گجرات ان کے قدیم مرکز تھے اور ایک وقت نیپال میں آہیر خاندان بھی تھا' 'پنجاب کا نسلیاتی خاکہ' ص ۲۷۱۔

کے سابقہ مشرقی ضلع میں بھی گوجر موجود ہیں جو وادیٔ سندھ میں ہے اور اب برطانوی قبضہ میں ہے۔ جاٹ کسی وقت بلوچستان میں آباد تھے اور ضلع کیچ میں کافی طاقتور تھے اور اب بھی اس ضلع اور ایران و قلات کی سرحد سے ملحقہ خلیج فارس کے ساحل پر اضلاع براہو اور دشتیاری میں موجود ہیں۔ موجودہ بلوچ اور براہوی قبائل کا تجزیہ ثابت کرتا ہے کہ ان کی تشکیل میں جواٹ کی کثیر اور مسلّمہ آمیزش ہے۔ یہ اغلب ہے کہ جنوبی افغانستان کے کچھ افغان قبائل جاٹ ماخذ کے ہوں۔

گواجر کی ہجرت بحیرۂ کیسپئین کو :-

لیکن سیستان سے یہ قبائل صرف ہندوستان ہی نہیں آئے۔ کیسپئین پر واقع مازندران کی اشراف آبادی کا ایک طبقہ گودار (گئو دار یا گوجر کی تحریف) کہلاتا ہے۔ لیکن یہ لوگ اچھوت سمجھے جاتے ہیں[1]۔ ہندوستان میں گواجر کے متعلق جو کہاوتیں مشہور ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ ناپسندیدہ مداخلت کار سمجھے گئے۔ سر ڈینزل ابٹسن[2] کی جمع کردہ ضرب الامثال میں سے چند یہ ہیں۔

"گوجر سے ایک صحرا ہی بہتر ہے"۔ "جہاں گوجر کو دیکھو اُسے مار دو"۔ اور "جب باقی سب ذاتیں مر جائیں تو اُس وقت بیشک گوجر سے دوستی کر لو"۔ یہ اُن سے ہندوستانی لوگوں کی نفرت کی مظہر ہیں لیکن وہ اپنی زیادہ تعداد کی وجہ سے نسل کشی سے بچ گئے۔ اس کے برعکس اشراف کے گودار تو آٹے میں نمک کے برابر تھے لہٰذا وہ اچھوت بن گئے۔ جالوٹس کا صدیوں سے صدیوں سے تعلق رہا ہے۔ زما (جاٹ) اور میدنویں دسویں صدی میں خلیج فارس کے ساحل، مکران پر آباد بتائے

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، دسواں ایڈیشن، جلد ششم، ص ۵۴۳

[2] پنجاب گرافی - اوسط سفالک انڈکس ۸۲

" نیزل انڈکس ۶۸۰۱

آربٹو نیزل انڈکس ۱۲۷۰۳

گئے ہیں اور وہ اب بھی یہیں آباد ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کیسپئین پر ضلع یا صوبہ میلان میں بھی میدر ہتے ہیں۔

لیکن جاٹ مزید مغرب تک نفوذ کر گئے کیونکہ ایک شامی اُسقف اور اِنٹک نیان کی خانقاہ کے سَر براہ زینو بیئس کی تاریخ میں (جو ۳۰۰ اور ۴۰۰ کے اوائل میں ہوا) آرمینیا کی ایک ہندو بستی کا ذکر ہے[1]۔

"اُن لوگوں کی شکل و شباہت انتہائی غیر معمولی تھی۔ یہ لوگ سیاہ فام جٹا دھاری، بھدّے اور کریہہ المنظر تھے۔ ان کے پرستیدہ بتوں کی کہانی یوں ہے:- دِمتر اور کِسانے دو بھائی تھے، اور دونو ہندوستانی شہزادے۔ اُنہوں نے دیناسکی بادشاہ کے خلاف بغاوت کی اور اُس نے ان کے خلاف لشکر بھیجا کہ انہیں ختم یا ملک بدر کر دیا جائے۔ باغی بچ نکلے اور ڈلر ساکینر کی سلطنت میں پناہ گزین ہوئے جس نے اُنہیں تارن کا علاقہ بخش دیا۔ یہاں انہوں نے ایک شہر بسایا۔ وِشپ بھی اژدہا۔ پندرہ سال بعد بادشاہ نے ان دونو کو مروا دیا لیکن اُس نے جاگیر اُنہی کے تین بیٹوں کوار، میغنتی اور ہورین کو دیدی۔ کچھ عرصہ بعد یہ تینوں اپنی سکونت ترک کر کے کوہ کرگی پر چلے گئے جہاں اشیائے ضرورت کی فراوانی تھی۔ اور آب و ہوا خوشگوار تھی۔ یہاں انہوں نے مندر بنوائے جن میں کِسانے اور دمتر کے دو بُت نصب کئے اور اپنے ہم نسل ان کے متولّی مقرر کئے۔ کِسانے کے لمبے لہراتے ہوئے بال تھے اور اس کے پروہتوں نے بھی اُس کی پیروی کی لیکن حکومت نے ممانعت کر دی۔ یہ لوگ بعد میں عیسائی ہو گئے لیکن راسخ العقیدہ نہ ہو سکے اور نہ ہی اپنے آبائی مذہب کا برملا اظہار کر سکے۔ لہٰذا اُنہوں نے اپنے بچّوں کے سروں پہ گندھے ہوئے بالوں

---

[1] مطبوعہ میچی تھرسٹک سوسائٹی وینس، ۱۸۳۲، جو اس کے پانچ مختلف ادوار کے مسوّدات پر مبنی ہے۔ مترجمہ جانیر اوول، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، جلد پنجم، ص ۳۳۱، کلکتہ ۱۸۳۶۔ اقتباس کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔

کی جٹا رکھنی شروع کر دی تاکہ قدیم بُت پرستی کی یاد تازہ رہے۔"

یہ گویا جاٹوں کے آرمینیا میں درود و نفوذ کا تمثیلی اظہار ہے۔ آخر کار ۳۰۰ء کے قریب ماہِ جولائی میں عیسائیوں نے انہیں شکست فاش دے دی۔ بُت پرستوں کے ۱۰۳۸، ۶ آدمی میدانِ جنگ میں لڑے اور ان میں سے ۳۸ ،۱۰ آدمی بمعہ مہا پر وہت اُرزن (ارجن ؟) کھیت رہے۔ "بھکر، ہیر اور مان قبائل اپنے کو خالص جاٹ بتاتے ہیں اور مہا دیو (بھولا مہا دیو) کی جٹا سے ماخوذ گردانتے ہیں"[۱]۔

جٹ (جٹا) بالوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ نسبتاً سفید فام آرمینوں کے لئے کالے کلوٹے، جٹا دھاری آبادکار یقیناً بدنما اور کریہہ صورت ہوں گے۔ ان نو واردوں کے لمبے بال انہیں مشرقی اطراف کے جاٹ سے منسلک کرتے ہیں۔ اگر ہجرت سیستان سے ہوئی تو راستہ اس وادی سے گذرا ہوگا جہاں بعد میں مشہد بنا اور اُترک کے ساتھ ساتھ کیسپئین تک پہنچا ہوگا۔ بحرِ اسکے سواحل پر میدوں کی موجودگی سے ظاہر ہوتا ہے۔

آرمینیا میں ہجرت :۔

ولرساکیز یا وُغراُشگ پارتھوی شاہی خاندان کا فرد تھا جس کے تحت آرمینیا نے کوئی ۱۵۱ اور ۱۲۸ ق م کے درمیان شامی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا[۲]۔ آرمینیا میں اس بستی کا قیام ساکا قبائل کے سیستان یا ساکستان[۳] میں پہلی صدی ق م میں حملے کی مسلّمہ تاریخ کے قریب قریب ہوا اگو دار یوش کے کتبے بے ستون میں ساکا کا مآکا[۴] کے ساتھ ذکر شاید اس بات کی قطعی شہادت ہو کہ ساکا خراسان میں اس سے بہت پہلے وارد ہوئے تھے۔

---

[۱] پنجاب ایتھنوگرافی "ابٹسن"، ص ۴۳۵۔

[۲] اس بادشاہ کا دورِ حکومت ۲۲ سال بتایا جاتا ہے اور اس کی حکومت کا کیشیا سے نعیبین اور کیسپئین سے بحیرہ روم تک تھی۔" پارتھیا" از جارج رالنسن، ص ۱۲۵۔

جواٹ افغانستان و مکران و قلات میں :-

افغانستان و بلوچستان میں جاٹوں کی آباد کاری کے شواہد موجود ہیں ۔ یکچ میں جواٹ کی آمد نے اور یا اوڈ قبائل کو مزید مشرق میں دھکیل دیا یا یہ جاٹوں کے جلو میں مشرق کی طرف منتقل ہوئے ۔

قلات کے شواہد :-

ریاست قلات کا دارالحکومت سترھویں صدی میں قلات نیچارہ تھا جو موجودہ حکمران خاندان کے آزاد ہونے تک برقرار رہا[1] ۔ نیچارہ اب جھلاوان میں سب سے بڑا دائمی گاؤں ہے ۔ جس میں کوئی ۴۰۰ مکانات ہیں ۔ یہ کوہ ہربوئی کی بڑی پہاڑی راغ کی جنوبی ڈھلانوں کے نیچے واقع ہے ۔ کوہ ہربوئی قریباً نو ہزار فٹ اونچا ہے ۔ جب جاٹ یہاں آباد تھے تو نیچارہ کا سردار ایک جاٹ ہمیر تھا جس سے موجودہ قابضین نے زمینیں چھینیں ۔ نیچاری اپنی روایت کے مطابق الکوزئی افغان ہیں اور ان کا لقب الکو ان کے ساتھ ہی ہمیر جاٹ کے عین حیات یہاں پہنچا ۔ الکو کا مزار بھی یہاں ہے[2] ۔

سسی پنوں کا قصہ :-

سسی پنوں کا قصہ غالباً عربوں کی فتح سندھ کے ابتدائی سالوں کا ہے ۔ اس کے

---

[3] کیپٹن پرگیلان کے باشندوں اور ہندوستانیوں کے درمیان عجیب و غریب مشابہتیں ہیں ۔ لوگوں کی خوراک مچھلی اور چاول ہے ۔ گیلان و مازندران کی گائیں پست قد ہیں اور ہندوستان کی ادنیٰ نسل کی گایوں سے ملتی جلتی ہیں ۔ ان کی کوہانیں چھوٹی ہیں لیکن بیلوں کی کوہانیں بڑی ہیں اور یوں بالائی ایران کے بیلوں سے مختلف ہیں ۔ بھیڑیں ہندوستان کی طرح چھوٹی ہیں اور لمبی دُم والی ہیں ۔ دُنبہ یہاں نہیں ہوتا ۔ لوگ ہندوستان کی طرح بہنگی پر بوجھ اٹھاتے ہیں ۔ گزٹیر آف پرشیا ۔

[4] جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی جنوری ۱۹۰۶ ، مکران کی قدیم نسل ۔

[1] قلات اسی نام کا اختصار ہے لیکن اس کی بنیاد (موجودہ دارالحکومت) بعد کے دور کی ہے ۔

مطابق پنّوں جام کیچ کا بیٹا تھا اور جاٹ تھا۔ سندھ کے ایک تجارتی سفر میں اُس نے حسین و جمیل سسّی کو دیکھ لیا اور پھر تیرہ بختیوں کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو اس قصّہ کا موضوع ہے۔ کیچ میں میری کے کھنڈرات قدیم راجدھانی کا پتہ دیتے ہیں جو پنّوں کے والد جام آری کی اقامت گاہ تھا۔ اس جگہ کا پرانا نام فتح پور تھا۔ تیرھویں صدی میں جب مارکو پولو چین سے واپسی پر خلیج فارس کو عبور کر رہا تھا تو اُسے بتایا گیا کہ کیچ مکران میں بُت پرست اور صحرا نشین یعنی ہنود و مسلمین رہتے تھے۔ اس سے اس روایت کی تصدیق ہو گئی جو ہیں نے ۱۸۹۱ میں دریافت کی، اور جس کے مطابق کیچ کسی وقت جدگال یا جواٹ کے قبضہ میں تھا۔ کیچ کے مغرب میں دریائے دشتیاری تھا اور اُس کے مقابل سمت میں سبیلہ (چچ نامہ کا ارمان بیلہ)۔ کیچ کے شمال میں فاصل آب اور جنوب میں بحیرہ عمّان تھے۔

بلوچستان گزیٹیر سیریز کی جلدوں کے مطالعہ و استفادہ سے پتہ چلتا ہے کہ جھلاوان اور کیچ مکران کے براہوئی قبائل میں جاٹ عنصر کتنا مضبوط ہے۔

محمود غزنوی کے متعلق جاٹ روایات

پنجابی جواٹ کی روایات بہت کم اور مبہم ہیں۔ ان سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے کچھ ہرات اور غزنی سے آئے اور یہ غیر اغلب نہیں ہے کہ ہندوستان آنے سے پہلے ان کے آخری آبائی اڈے یہی ہوں۔ محمود کی شہرت اس روایت کی ذمّہ دار ہے کہ وہ انہیں غزنی سے ہندوستان لایا۔ غزنی کے لشکر مختلف نسلوں کا ملغوبہ تھے۔ سلطان مسعود کے دَور

غزنویوں کے تحت خضدار تجارتی اور عسکری لحاظ سے اہم ترین شہر تھا۔ یہ ایک قلعہ بند قصبہ تھا (تاریخ بیہقی۔ بیلی او تھیکا انڈیکا) تاکہ مکرانی حکمرانوں کو قابو میں رکھا جا سکے۔ جو غزنی کے باجگزار تھے اور جنوبی الرّخاج پر گرفت قائم رکھی جا سکے۔

ے بلوچستان گزیٹیر سیریز جلد ششم ب، ص ۲۲۱۔

میں ترکمان اور خراسانیوں کے پہلو بہ پہلو ہندوستانی (ہندو) لشکری بھی کرمان میں موجود تھے اور وہ دیگر سمتوں میں اس کی لڑائیوں میں حصہ گیر ہوئے اور وہ آخری شکست میں بھی شریک تھے جو اُسے سلاجقہ کے ہاتھوں ۹ رمضان ۴۳۱ھ (۲۳ مئی ۱۰۴۰ء) کو دندان کحد (مرو سے دو منزل دور) کے مقام پر اٹھانا پڑی۔ جب پنجاب کے گورنر نیالتگین نے سلطان مسعود کے خلاف بغاوت کی تو ترکمانوں کو اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا۔ یہ ترکمان ایک ہندو تلک کے ماتحت تھے جو ایک حجام زادہ تھا لیکن غزنوی ملازمت میں ترقی کر گیا تھا۔ اس مہم میں تلک کے منتخب کردہ ہندوستانی سپاہی بھی تھے۔ اُس وقت دریائے ستلج ہندوستانی غزنوی سلطنت کی حد بندی کرتا تھا اور گو اس کے قریب ہی جو اٹ کا ذکر کیا گیا ہے تاہم ماورائے دریا کے آزاد جاٹ کا خصوصی طور پر ذکر ہوا ہے جن کو تلک[۱] نے خطوط لکھے تھے کہ وہ نیالتگین کو گرفتار کر لیں بشرطیکہ وہ ان کے علاقے میں پناہ لے۔ انہوں نے واقعی اسے پکڑ لیا۔ پنجاب کی بیشتر جاٹ آبادی گیارھویں صدی تک اس علاقے میں اپنے پاؤں جما چکی تھی۔

ہندوستان و سیستان کے وڑائچ جاٹ اور بڑیچ افغان:۔

اُن کے ماخذ کی واضح ترین روایت جو اٹ پنجاب کے قبیلہ وڑائچ میں محفوظ ہے۔
"وڑائچ ... کے بڑے جاٹ قبائل میں سے ایک ہے۔ دور اکبری میں وہ دو تہائی ضلع گجرات کے مالک تھے گو باقیماندہ ایک تہائی کے مالک گوجر کی نسبت انہیں کم مراعات حاصل تھیں اور وہ اب بھی اس ضلع میں ۱۷۰ دیہات کے مالک ہیں ... وہ ہمیشہ راجپوت ہونے کا دعوٰی نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ ان کا مورث اعلیٰ ڈھوڈی ایک جاٹ تھا جو محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آیا اور گجرات میں بس گیا۔ جب قبیلہ طاقتور ہو گیا تو اس نے

---

[۱] کیا وہ خود بھی ایک جاٹ تھا؟ یہ غیر اغلب نہیں ہے۔ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسے یقین تھا کہ اس کے خطوط مطلوبہ اثر ضرور دکھائیں گے۔

کسی حد تک سابقہ گوجر دہ خدا یان کو زمینی ملکیت سے محروم کر دیا۔ ایک اور کہانی یہ ہے کہ ان کا مورث راجہ کرن کی اولاد تھا جو شہر کسری سے دہلی گیا اور جلال الدین فیروز شاہ نے اُسے حصار میں آباد کر دیا۔ یہاں سے قبیلہ کوئی پانچ صدیاں پیشتر گوجرانوالہ میں منتقل ہو گیا۔ وہ قریباً سب کے سب مسلمان ہیں لیکن اُن میں بہت سی ہندو رسومات جاری وساری ہیں۔ وہ ضلع لاہور میں چُھنگ یا وڑائچ کہلاتے ہیں اور اعلیٰ ترین مقامی قبائل سے رشتے ناطے کرتے ہیں[۱]۔" اس قبیلے کی روایات نہ صرف انہیں علاقۂ غزنی سے مربوط کرتی ہیں بلکہ انہیں سیستان سے

---

[۱] 'پنجاب کا نسلیاتی خاکہ' ، ابٹسن، پیراگراف ۴۳۲، ص ۲۷۔

ضمناً عرض ہے کہ تاریخ بیہقی کے مصنف نے گیارھویں صدی کے ایران و خراسان کے معاشرے کا نقشہ خوب کھینچا ہے۔ یہ ممالک گنجان آباد اور مہذب تھے ان کی آبادی کو تجارت و زراعت کا ملکہ اور چسکا تھا اور وہ کافی نفاست پسند تھی۔ وسط ایشیائی خلج قبیلہ بھی خراسان میں آکر مہذب و منضبط ہو گیا تھا۔ یہ ملہند پر واقع قلعہ بست میں آباد تھا۔ قابل کاشت زمینیں بارآور تھیں اور پہاڑ چراگاہیں تھے۔ آبادی ایرانی یا مشرقی ایرانی نسل کی تھی لیکن جاٹ بھی اپنا مقام رکھتے تھے غزنی کا شاہی خاندان بھی ایرانی تھا اور اپنا سلسلہ سبکتگین کے ذریعے ایران کے قدیم شاہی دودمان سے ملاتا تھا۔ امراء واشراف عسکری تھے اور ترک، ترک سالار افواج تھے گو وہ شروع میں سلاطین کے غلام تھے۔ جو اپنی صلاحیتوں کی بدولت سرفراز ہوئے، پہلے سپاہی بنے اور پھر سالار۔ فوج میں ترکوں اور ترکمانوں کی بھرتی عام تھی لشکری اور کشوری نظم و نسق کے شعبے الگ الگ تھے۔ مجلس شاہی کے تُرک جرنیل صرف عسکری معاملات نمٹاتے تھے۔ تاجیک یا ایرانی افسر خراج، حکمت عملی اور ملکی در و بست میں مشورہ دیتے تھے۔ وزیر ہمیشہ تاجیک یا مشرقی ایرانی نسل کا ہوتا تھا۔

ہندوستانی فوجوں کے سالار بھی ہندوستانی ہوتے تھے اور مجلس شاہی میں وہ تُرک جرنیلوں کی ہامی بھرتے تھے۔

بھی منسلک کرتی ہیں۔ کیونکہ شہر کیسرے قابل شناخت ہے اور اسے موجودہ سیستانیوں نے قدیم دار الحکومت بتایا ہے جس کے کھنڈرات نادعلی میں موجود ہیں۔ گویا کسی وقت وڑائچ اس شہر کے گرد آباد تھے جہاں آج بھی قریب ہی جواٹ کا دیہہ نواب موجود ہے۔

مزید براں لفظ وڑائچ ایک دُور دُور تک منتشر افغان قبیلہ، بڑیچ کا ہی دُوسرا رُوپ ہے۔ اب بھی نادعلی کے قریب ہی ہلمند کے ڈیلٹا کے افغان حصّہ کے ضلع چکانسر میں بڑیچ افغان موجود ہیں۔ لیکن دورِ حالیہ میں ان کا مرکز وادیٔ ہلمند رہا ہے جہاں لنڈی بڑیچی، بلالک اور دیگر زمینیں ان کے قبضہ میں ہیں۔ یہاں سے وہ شوراوک میں پھیلے اور اب شیرانیوں کے ساتھ اس پہ قابض ہیں۔ بڑیچی ضلع خاش اور قندھار کے گرد و پیش میں آباد ہیں۔

بڑیچ افاغنہ کا کردار:-

وہ زیادہ تر زراعت پیشہ ہیں اور محنت و مہارت میں تاجیک کا لگا کھاتے ہیں۔ اسی لئے افغانستان کے چوپانی قبائل انہیں حقارتاً تاجیک درجے کا سمجھتے ہیں۔ شوراوک اور ہلمند میں بڑیچ شتر پرور بھی ہیں اور ان کے جانور بلوچستان کے دورِ یلغار میں تحمّل کے لئے مشہور تھے۔ ۸۷-۱۸۸۶ میں مجھے شوراوک میں بتایا گیا کہ بڑیچ بہت عرصہ پہلے مغرب سے آئے تھے۔

بڑیچ گو اپنی مرضی سے کاشت کار ہے تاہم وہ چھاپوں سے گریزاں نہیں۔ ہلمند اور شوراوک کے بڑیچ ہمیشہ آزاد خان کے لشکر میں دستے بھیجتے تھے اور لوٹ مار میں حصّہ لیتے تھے۔ لیکن بڑیچ کبھی خالصتاً خانہ بدوش یا شبان نہیں ہوتا۔

پنجاب کے وڑائچ جاٹوں اور جنوبی افغانستان کے بڑیچ افغانوں کا ایک جیسا

ماخذ اور اُن کے ناموں، طرزِ حیات اور عادات و اطوار کی یکسانیت اس پر دال ہے کہ وہ بہت عرصہ پہلے ایک ہی قبیلہ ہوں گے۔ یہ سمجھنا بھی قرین قیاس ہے کہ اس قبیلہ کا ایک حصّہ سیستان کے شہر کبرا سے غزنی اور پھر غزنی سے ہندوستان آیا اور دوسرا حصّہ وہیں رہا جہاں ان کے آباو اجداد جٹا سے آئے تھے۔

نوٹ: میسوپوٹیمیا، ملحقہ علاقوں اور شام کے جاٹ کے لئے دیکھئے ضمیمہ چہارم۔

بَاب پنجم

کیچ اور بلوچستان سے جواٹ کی ہجرت :-

کیچ اور بلوچستان سے جواٹ کی آخری اور تازہ ترین ہجرت کی کئی وجوہات تھیں لیکن غالباً اہم ترین ملک کی مسلسل اور اضافہ پذیر خشک سالی تھی جس نے ایشیا کے کئی خطوں کو بے آباد کر دیا۔ کیچ اور بلوچستان میں بھی چشمے بتدریج خشک ہوتے گئے۔ کاریزات کے پانی کی مقدار کم ہوتی گئی اور زراعت کاری یوماً فیوماً گھاٹے کا سودا بننے لگی۔ بارش کی کمی نے چارے کی فراہمی دو بھر کر دی حتیٰ کہ ان دگرگوں حالات نے جاٹ اور براہوئی آبادکاروں کے درمیان کشمکش زیست میں ایک بحران پیدا کر دیا۔ جاٹوں کی اکثریت مشرق کی طرف سندھ میں منتقل ہو گئی۔ اور ان کا بچا کھچا حصہ وقت کے ساتھ ساتھ بلوچ و براہوئی آبادکاروں میں ضم ہو گیا — اور بسا اوقات ان قبائل کا اہم ہاڑہ بن گیا۔ بلوچستان گزیٹیر سیریز کی جلدات اس اجمال کی تفصیل بتا سکتی ہیں۔

جَاٹ براہوئی آویزش کی داستان :-

براہوئیوں اور جدگالوں (جاٹوں) کی آویزش کی داستان سے یہ صاف طور پر عیاں ہے کہ اوّل الذکر حملہ آور یا نووارد لشکر نہ تھے بلکہ وہ بلوچستان میں کافی عرصے سے آباد تھے۔ براہوئی ہیرو میر بجارہ کی والدہ مستونگ کی ایک خواجہ خیل خاتون تھی۔ سبیلا اور کچھی کے جواٹ کو براہوئیوں کے دشمن کہا گیا ہے کیونکہ انہوں نے اس کشمکش قتل و قتال میں لازماً کیچ و قلات کے جواٹ کا

ساتھ دیا۔ داستان کے مطابق یہ ایک طویل آویزش تھی اور داستان کی ادبی روایت کے مطابق اس میں متعدد قرون پر پھیلی ہوئی زنا بتوں اور جھڑپوں کو شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے جو بالآخر ایک فیصلہ کن لڑائی پر منتج ہوئیں۔

متروکہ کاریزات :-

قطعی ثبوت کے فقدان کے باوجود تاریخی اور دیگر شواہد سے یہ ثابت ہوسکتا ہے کہ گیارھویں بارھویں صدی تک کیچ، پنجگور اور خاران کے حالات موجودہ حالات سے مختلف تھے اور یہ ایک راعیانہ اور نیم خانہ بدوشانہ غیر ملکی عنصر کے علاوہ ایک بڑی مستقل، دائمی اور زرعی آبادی کے بخوبی کفیل تھے۔ کیچ کا دریائے دشت کے ساتھ کا علاقہ اب بھی قدیم کاریزات سے سیراب ہوتا ہے جو اپنا پانی دریا سے اخذ کرتی ہیں اور تحت الزمین پانی پر منحصر نہیں ہیں کیونکہ دریا کا طاس بہت وسیع ہے۔ اس طرح پنجگوری کاریزات رخشان ندی کے پانی سے رواں دواں رہتی ہیں۔ لیکن کیچ اور پنجگور کے ملحقہ علاقوں میں بہت سی کاریزات معطل ہوگئیں کیونکہ ان کا پانی کم یا بالکل خشک ہوگیا۔ جب یہ کاریزیں بے پناہ زور و زر کے صرف سے بنائی گئی تھیں تو یہ یقیناً پرآب تھیں اور ان کے سوتے دائمی تھے۔

ضلع خاران پنجگور کے شمال میں ہے جسے راس کوہ اس کے شمالی ضلع چاغی سے جدا کرتا ہے۔ اب خاران عملاً ایک صحرا ہے اور صرف کہیں کہیں بارانی کاشت ممکن ہے لیکن یہ ضلع کسی وقت بڈو ندی سے سیراب ہوتا تھا جس کی گہری گذرگاہ آج بھی اس نشیب تک دیکھی جاسکتی ہے جس میں دریائے ماشکیل اپنا سیلابی پانی گراتا ہے۔ یہ گذرگاہ پانی نے ہی بنائی تھی۔ اس ندی کے زیریں حصوں میں اب پانی صرف اسی وقت آتا ہے جب موسلا دھار بارش ہو، یا ان پہاڑوں پر برف باری ہو جہاں اس کا منبع ہے۔ پھر بھی اس کا پانی صرف خاران کے اردگرد کاشت کا ہی متحمل ہوسکتا ہے۔ لیکن میدان خاران میں ایسے بیشمار دیہات کے کھنڈرات ہیں، جہاں کسی وقت ایک زرعی (اور عین ممکن ہے جاٹ) آبادی شاداں و فرحاں تھی۔ راس کوہ کی

تنگ وادیوں میں ڈھلوان چبوترہ بچبوترہ کھیت ہیں۔ جن کو تھامنے والی دیواریں پتھروں اور کھنگروں، بڑے بڑے قدرتی قطعوں سے بنی ہوئی ہیں اور بھاری بھرکم اور جناتی ہیں۔ کوئی انسان منفعت کی توقع کے بغیر ان کی تعمیر پر محنت کرنے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ بلوچستان میں دریافت ہونے والے واحد قابل فہم کتبے راس کوہ میں گلگ اور قلعہ جالدر کے اوپر کی گھاٹی میں ملے ہیں۔ یہ عربی حروف میں چٹان کے چہرے پر کندہ ہیں۔ ان کی تواریخ دسویں اور گیارھویں صدی عیسوی سے متعلق ہیں، گویا اُس وقت یہاں تعلیم و تہذیب ایک خاص معیار پر پہنچے ہوئے تھے۔ سب آثار و شواہد موجودہ حالات سے زیادہ ساز گار طبعی حالات کا پتہ دیتے ہیں، جب بارش زیادہ اور کاشت وسیع تھی۔ ریت کی پہاڑیاں (جنہوں نے اب اس ضلع کا بیشتر حصہ ڈھانپا ہوا ہے) اس مواد، ریتلی چکنی مٹی سے بنی ہیں جو سطح زمین سے اُکھڑا ہے اور جسے مسلسل خشک سالی کی وجہ سے ہوائیں اُڑا اُڑا کر لے گئی ہیں۔ اُس وقت خاران غالباً مکران کے معدانی حکمرانوں کا دور اُفتادہ ضلع تھا۔[1]

گیارھویں صدی کا مکران :-

تاریخ بیہقی میں اس خاندان کا ذکر ہے جس سے ملک کے حالات پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے اور جس پر وہ سُلطان محمود غزنوی اور مسعود غزنوی کے وقت قابض تھے۔ "جب معدن (والی مکران) فوت ہوا تو اس کے دو بیٹے، عیسیٰ اور ابو العسکر وراثت پر جھگڑ پڑے۔ لیکن چونکہ جنگجو طبقہ اور زرعی طبقہ عیسیٰ کے ساتھ تھا لہٰذا ابو العسکر ملک سے بھاگ گیا۔" یہ ۴۱۲ھ (۱۷ اپریل ۱۰۲۱ بروز سوموار تا ۶ اپریل ۱۰۲۲ء بروز جمعہ) میں ہوا۔ ابو العسکر سیستان آیا جہاں خواجہ بو نصر خافی (ظاہراً سُلطان محمود کا مختار کار جو اُس وقت سومناتھ کی مہم پر گیا ہوا تھا) نے اُس کا پُر اعزاز استقبال کیا، وہ یہاں کچھ عرصہ رہا۔ محمود غزنوی نے سومنات سے واپسی پر اُسے غزنی بُلا لیا اور دربار میں رکھا۔

---

[1] ببلی اوتھیکا انڈیکا، کلکتہ ۱۸۶۲، فارسی متن۔

عیسیٰ بہت سیخ پا ہوا اور اُس نے قاضیٔ مکران کی سرکردگی میں ایک وفد دربارِ اعلیٰ میں بھیجا جس میں رئیس[1]، علماء و فضلاء اور زرعی عمائدین شامل تھے۔ وفد کو ایک خط بھی دیا گیا جس میں تحریر تھا کہ عیسیٰ اپنے باپ کا جائز وارث تھا اور اگر اس کا بھائی دغاباز اور مخالف نہ ہوتا تو اسے اس کا حصّہ وراثت ضرور ملتا۔ اس میں یہ پیشکش بھی کی گئی کہ اگر عیسیٰ کی ولایت کی توثیق ہو جائے تو وہ حسبِ طلب خراج دینے تیار تھا۔ یہ درخواست مان لی گئی اور مکرانی وفد کو واپس بھیج دیا گیا اور ابو العسکر کو دربار میں ہی رکھا گیا۔

معدانی ملوک اور غزنی :-

محمودؒ کے بعد اس کا جانشین مسعودؒ رے کی مہم پر گیا تو سلطنت کے والی اور باجگزار پر پرُزے نکالنے لگے۔ ان میں عیسیٰ بن معدان بھی شامل تھا۔ اُسے ہٹا کر ابو العسکر کو والی مکران بنانے کا فیصلہ ہوا۔ لیکن دیگر اہم معاملات کی وجہ سے اسے التوا میں ڈالنا پڑا۔

آخر کار اس مقصد کے تحت مکران کو ایک مہم بھیجی گئی اور اس نقل و حرکت کو تقویت دینے کے لئے قصدار کو ایک مضبوط کمک روانہ کی گئی۔ عیسیٰ نے مقابلہ کی ٹھانی اور بیچیوں، ریکیوں اور مکرانیوں سے ۲۰،۰۰۰ پیادہ اور ۶،۰۰۰ گھوڑ سوار فوج جمع کر لی۔ لڑائی کے دن غزنوی لشکر کے سپہ سالار حاجب[2] دارنے ۲،۰۰۰ چیدہ چیدہ گھوڑ سوار (سلطانی یعنی باقاعدہ ترک گھوڑ سوار) کھجوروں کے جھنڈ میں چھپا دیئے۔ فیل سوار مکرانی دس جنگی ہاتھیوں اور صف بستہ فوج کو لے کر حملے کے لئے بڑھا۔ غزنوی لشکر اس زوردار حملہ کی تاب نہ لا سکا لیکن حاجب دار نے اپنی فوجیوں کو مجتمع کیا اور آگے بڑھایا۔ مکرانی فوج کو شکست ہوئی۔ اس کا سالار بھاگ گیا۔ لیکن ایک گھاٹی

---

[1] کیچ کی موجودہ آبادی کا ایک اہم حصّہ اور کسی وقت بمپور سے شمال اور جنوب، علاقہ سرحد کا طاقتور حصّہ۔ یہ غزوں کی اولاد ہیں جنہوں نے رئیس گھرانوں میں شادیاں کیں۔

[2] ملبوساتِ شاہی کا محافظ۔

میں پکڑا گیا۔ اُس کا سر قلم کر دیا گیا۔ اُس کے پیرو مار دیئے گئے۔ چار دن تک شہر اور نواحیات میں قتل و غارت جاری رہا اور بہت سا مالِ غنیمت اور بیشمار جانور قبضہ لئے گئے۔ ابوالعسکر کو والی بنا دیا گیا اور حامہ دار ملبعہ شکر کچھ عرصہ ٹھہرا حتیٰ کہ اُس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ حامہ دار واپس آ گیا اور ابوالعسکر تادمِ آخر والیٔ مکران رہا۔[۱]

---

[۱] اس لڑائی کے میدان کی صحیح نشاندہی نہیں ہو سکتی۔ بمپور (بنقل بموجب عالم آرائے عباسی سترھویں صدی عیسوی) ملوک کیچ مکران کا بہت پشتوں تک صدر مقام رہا حتیٰ کہ ان کے مقبوضات ایرانی علاقے میں جذب کر لئے گئے اور ایرانی حکومت کے افسردہ کن اثرات کے تحت یہ خاندان زوال پذیر ہو کر ختم ہو گیا۔

فہرج یا پہرا بمپور سے چار میل دُور ایک قدیم جگہ ہے جسے اَریَن نے پُورا لکھا۔ یہاں کھجوروں کا ایک عمدہ جھنڈ ہے لیکن ایسے جھنڈ قلعہ بمپور کے گرد بھی تھے جو اب معدوم ہو چکے ہیں۔ اغلب ہے کہ فہرج یا پہرا ہی وہ میدان تھا جہاں عیسیٰ بن معدان شکست سے دوچار ہوا۔ اس صُورت میں غزنوی لشکر سیستان سے گذرا ہو گا جو اُس وقت غزنی کے تحت تھا (دیکھئے حصّہ اوّل باب دوم) خضدار کو کمک عام بغاوت کو روکنے کے لئے بھیجی گئی ہو گی۔ نیز حامہ دار کی مدد کے لیے جسے مکران کے مغربی اضلاع کے قبائل کے ممکنہ ایتلاف کی صورت میں اس کی ضرورت ہوتی۔ "۱۰۲۳ھ (یکم فروری ۱۶۱۴ء بروز منگل تا ۲۰ فروری ۱۶۱۵ء بروز جمعہ) میں والیٔ کرمان، گنج علیخان زِیک کُرد نے بمپور کا محاصرہ کیا اور ملک شمس الدین ابن ملک دینار کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اُسے اس کے بیٹوں اور افرادِ خاندان کے ساتھ اصفہان بھیج دیا گیا۔ شمس الدین ۱۰۲۷ھ (۱۸-۱۶۱۷ء) میں فوت ہوا۔ مقبرہ جلک میں ہے" - (سائیکس ایران میں دس ہزار میل کی سیاحت، ص ص ۳۴، ۲۳۳)۔

ملک دینار پورے کیچ مکران کا حاکم تھا اور اُس کی عظمت و فراست کے گُن گائے جاتے ہیں ــ "۱۰۳۰ھ (۱۶ نومبر ۱۶۲۰ء تا ۵ نومبر ۱۶۲۱ء) میں ملک مرزا شاہ عباس اوّل کے دربار گیا۔ اُس کا ملک صوبہ ٹھٹھہ اور سندھ سے ملحق تھا اور وہ مُغل شہنشاہوں کے ماتحت تھا لیکن دہلی آگرہ کے فاصلے کی وجہ

مکران کا ماضی اور حال :-

جو لوگ موجودہ مکران، اُس کی قلیل آبادی اور اُس کی بدحالی اور یبوست کو سمجھتے ہیں وہ یقیناً گیارھویں صدی عیسوی اور موجودہ صدی کے حالات کا تضاد و تفاوت دیکھ سکتے ہیں۔

جنگ جدگال کی داستان کا زمانہ :-

براہوئی جدگال جنگ کی منظوم داستان بلوچستان سیریز کی جلد ششم ب میں دی گئی ہے۔ اس کا زمانہ معقول صحت کے ساتھ چودھویں صدی کا اواخر یا پندرھویں صدی کا اوائل مقرر کیا جاسکتا ہے۔ موجودہ بعد زمانی کے سیاق و سباق میں ممکنہ قطعیت کے ساتھ کہا جاسکتا ہے، کہ اُس وقت یہاں کے حالات ایسے تھے کہ جراٹ کے مقبوضہ علاقوں کے لئے جراٹ اور اُن کے

سے وہ صرف معمولی خراج پر اکتفا کرتے تھے اور وہ اپنی گرفت آسانی سے کیچ مکران پر نہ رکھ سکتے تھے"۔ (عالم آرائے عباسی)۔ "ملک مرزا کیچ و پنجگور کے تمام ملوک بلکہ اہل ملک میں عظیم ترین تھا مٹھی بھر جاں نثاروں کے ساتھ وہ دربار اصفہان گیا اور اپنی بندگی و بیچارگی پر مؤثر احتجاج کیا جسے منظور کر لیا گیا"۔ (ایضاً)۔ ملک مرزا غالباً تھوڑے عرصہ بعد فوت ہو گیا کیونکہ اس کے فوراً بعد" ملک اختیار الدین بن فہل یعنی کیچ مکران سے دربار گیا۔ وہ ایک عظیم انسان تھا۔ اُس کی پذیرائی ہوئی اور اسے وفاداری کا انعام دیا گیا"۔ یہ ۱۰۳۳ھ (۱۵ر اکتوبر ۱۶۲۳ بروز بدھ تا ۳ر اکتوبر ۱۶۲۴ء بروز اتوار) میں ہوا۔ "غیر معمولی تحائف کے علاوہ اسے ضلع بن فہل دے دیا گیا۔ وہ بغداد کے خلاف دوسری شاہی مہم میں اپنے بندو قچیوں کے دستہ کے ساتھ ۱۰۳۵ھ (۲۳ر ستمبر ۱۶۲۵ بروز جمعہ تا ۱۱ر ستمبر ۱۶۲۶ء بروز پیر) میں بہت بہادری سے لڑا"۔ (ایضاً) پندھویں صدی (۴۲-۱۴۴۱ء) میں مطلع السعدین کے مصنف عبدالرزاق کو شاہرخ ابن تیمور نے سفیر بنا کر ہندوستان بھیجا۔ وہ کرمان آیا تو والی کو کیچ مکران (بمپور) کے خلاف مہم پر گئے ہوئے پایا۔

ہمسایوں، براہوئی خانہ بدوش قبائل کے درمیان آویزش ناگزیر تھی۔

نکودری :-

چنگیز خانی عساکر کے حملوں نے نہ صرف مشرقِ وسطیٰ کی سیاست و معاشرت کو پارہ پارہ کر دیا بلکہ ان تباہ شدہ ملکوں میں ترکوں اور منگولوں کے ایسے دندناتے ہوئے گروہ چھوڑ دیئے جو لوٹ مار پر زندہ رہتے تھے۔ نکودری اور قراؤنہ ایسے ہی لوگ تھے جو مار کو پولو کو کرمان سے گذرتے ہوئے ملے۔

ڈاکو اور قزّاق :-

یہ اغلباً شروع میں خالص ترک قبائل تھے لیکن مرورِ زمان کے ساتھ لٹیرے اور راہزن ان کے ساتھ ملتے گئے اور یہ ڈاکوؤں کے منظّم گروہ بن گئے جن میں بعض دل برداشتہ اور شکست خوردہ عرب، ماماسینی، تاجیک اور جاٹ بھی شامل ہو گئے تھے۔ بعد کے نکودری ایک مخلوط نسل بن گئے اور یہ لفظ قزّاق کا مترادف ہو گیا[1]۔

خراسان اور ان کا صدر مقام :-

یہ خراسان میں پہلی مرتبہ ۹۹-۱۲۹۸ء[2] میں نمودار ہوئے اور بہت جلد ان کا چرچا ہونے لگا۔ چودھویں صدی کے وسط تک نکودریوں کا ایک گروہ حدود سیستان میں آباد ہو گیا تھا۔ یہ لوگ خانہ بدوش تھے اور سال کا کچھ حصّہ ساحل ہلمند پر گذارتے تھے۔ تیمور اپنی پہلی سیستانی مہم کے بعد اند مال زخم کے لئے انہی کے خیموں میں ٹھہرا (حصّہ اوّل۔ باب سوم) چاہ امیر کا مشہور کنواں وادیٔ ہلمند کے اندر گلوعنہ کے قریب واقع اس قبیلے کے صدر مقام گواچگ کو قبرستان سے ملانیوالی سڑک کے اوپر ہے۔ یہ غالباً کسی نکودری سردار نے بنوایا۔ کیونکہ یہ

---

[1] قزّاق اور نکودری گھوڑ سواروں کی لوٹ مار کی جنگ کی اصطلاحات بن گئیں۔

[2] حصّہ اوّل باب سوم۔

ان دو نو مقامات کے درمیانی صحرا میں تقریباً مساوی فاصلہ پر ہے۔

ان کی تسخیر :-

سیستان سے نکودری ڈاکوؤں نے یزد اور فارس تک لوٹ مار شروع کر دی اور ان علاقوں کے لوگوں کے لئے ہوّا بن گئے۔ ان کی جارحیت کو سب سے پہلے آل مظفرؔ کے بانی نے پے در پے شکستیں دے کر روکا جو پہلے والئ یزد بنا اور پھر حاکم بن بیٹھا۔ اُس نے نکودریوں سے مسلسل جنگ آزمائی کی اور ایک معرکہ میں نکودری سردار امیر نوشیرواں اس بُری طرح زخمی ہوا، کہ جانبر نہ ہو سکا۔ قتل و غارت بند ہو گیا۔ اس کے بعد ۱۳۸۴ کے اوائل میں زاہد ان کی تباہی کے بعد تیمور نے نکودری سردار اور اس کے ساتھیوں کو مروا دیا۔ یہ سردار اپنے ضمیر کی خلش (بوجہ اس کی وفاداری بہ کیانی ملوک سیستان) کے تحت اپنے قبیلہ سمیت ہلمند کی جنوبی بستی قاران سے کیچ مکران جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ تیمور کی سپاہ نے ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر اُسے آ لیا۔ قاران کی حُلگاہ خاران کے مغرب میں ضلع ماشکیل ہو سکتی ہے یا چاغی لیکن زیادہ امکانات ماشکیل کے ہیں سپاہ کا راستہ چاہ امیر کا راستہ تھا۔

اُن کا قبائلی قبرستان گواچگ غرب خاران میں :-

مجھے ۸۹-۱۸۸۸ کی سردی میں جلک کے مغرب میں ہتو کان کے گاؤں کے قریب پہاڑیوں میں ایک وادی نوکودر نامی ملی اور تھوڑے عرصہ بعد میں گلوغہ کے قریب گواچگ کے مقابر ملوک پر گیا جو ایک بڑے قبرستان میں واقع ہیں۔ یہاں موسم زدہ بالائے زمین مزارات میں مجھے نو اہم مقبرے نظر آئے جو کم گہری کرسیوں پر ایستادہ تھے اور کرسیاں بھی مختلف الحال انسانی ہڈیوں سے بھری ہوتی تھیں اور اوپر کے گنبدیں کمروں کے فرش پر بھی قبریں بنی ہوئی تھیں جن میں انسانی ڈھانچے تھے۔ اُن میں سے اکثر مزارات بلوچوں نے لوٹ لئے تھے اور وہ مجھے مدفونین یا ان کے قبیلہ کے متعلق کچھ نہ بتا سکے سوائے اس کے کہ "وہ ملوک تھے"۔

مقابر کا بیان :-

مقابر بھٹے کی اینٹوں سے بنے ہوئے تھے جن پر گچکاری کی گئی تھی اور اُن کے نچلے حصّے محض اینٹوں کے سادہ ردّے تھے لیکن ان کا عجیب ترین حصّہ گنبد کو سہارا دینے والی بالائی منزل کی دیواروں کے کچھ حصّہ کی بیرونی آرائش تھی۔ کوئی دو دو فٹ مربّع پختہ ٹائلیں کنکریٹ کے پلستر سے جڑی ہوئی تھیں اور دیواروں کی اینٹوں کو ڈھانپتی تھیں۔ ان ٹائیلوں کے کئی ردّے تھے۔ ان پر کچّی حالت میں اُونٹوں اور گھوڑوں پر سوار مردوں کی بے ہنگم تصویریں کھودی گئی تھیں۔ جن پر ہلکی منبّت کاری کی گئی تھی۔ یہ سوار کمانوں اور تلواروں سے مسلّح تھے اور ظاہراً جنگجوؤں کے مظہر تھے۔ اس کے بعد ان ٹائیلوں کو پکایا گیا تھا۔ دُوسروں پر طاؤسوں کی تصویریں تھیں جنکی چونچوں میں سانپ تھے، یا ہرنوں کی تصاویر تھیں جن کا شکاری سرتوڑ تعاقب کر رہے تھے اور ایک پر تو ایک یک مستولی کشتی یا جہاز کی تصویر بھی تھی۔ بالائی فرش (جس پر سیڑھیوں کے ذریعے چڑھتے تھے جن کی سطحیں اینٹوں سے پختہ کی گئی تھیں) کے دروازے کی بعض قریب ترین ٹائیلوں پر چڑیوں کی تصویریں تھیں اور انسانی نقوش پا کی جیسے سیلیا نوسنے کے سینڈل پہنے ہوئے پاؤں ریت پر چھوڑتے ہیں۔ یہ کمرے کی اندر کی قبروں کی تعداد کے قریباً برابر تھے۔ ایک آرائشی ٹائیل پر ایک آدمی کندہ تھا جو بیلوں کی جوڑی کے ساتھ ہل چلا رہا تھا جو نہایت بھدّا اور بھونڈا تھا۔ لیکن قابلِ ادراک ضرور تھا۔ اگرچہ جانوروں، گھوڑوں، اُونٹوں بمعہ بچّوں، بیلوں، چیتوں اور سوار جنگ بازوں کی شبیہیں بہت عام تھیں تاہم گھریلو اشیا بھی کندہ تھیں جیسے ہتھ چکیاں جن کے ساتھ انسانی ہاتھوں کی بدنما شکلیں بھی تھیں اور انگلیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

یہ مناظر حسبِ توقع ایک نیم خانہ بدوش، غیر مہذب معاشرے کی روزمرّہ زندگی سے لئے گئے تھے جس کے لوگ شکاری اور جنگ باز تھے۔ آرائش کے لحاظ سے گلوغہ کے قریب گواچگ قبرستان کے مزار سندھ میں جنگ شاہی ریلوے سٹیشن کے قریب کی بیجا یا گلمتی قبور سے ملتے جلتے تھے۔ موخر الذکر میں مردانہ مزارات آلات اور سینڈل کے نشانات کی تصاویر

سے سجائے گئے ہیں جو پختہ ٹائیلوں کی بجائے سنگپاروں پر کھود دی گئی ہیں۔ چوڑیوں اور دیگر نسوانی زیورات کی شکلوں والے مزارات عورتوں کے ہیں۔ گلوغہ کے قریب کی قبروں پر کندہ آرائشی ٹائیلوں کے علاوہ دیگر خالصتاً زیبائشی نقش ونگار بھی ہیں۔

میں نے ۱۸۸۹ میں ایک پورا دن ان مزارات کا معائنہ کرتے ہوئے گذارا اور اپنے معائنہ کے نتائج سر ٹامس ہولڈیچ کے حوالے کئے اور ایک مقبرے کا اندازاً خاکہ بھی اپنی مختصر یادداشتوں سے نقل کر کے دیا جو ہنوز میرے پاس محفوظ ہیں۔

نکودر سردار کا مقبرہ :-

ان میں سے ایک عمارت اب بھی گنبد نوشیرواں کہلاتی ہے اور اس کی ایک آرائشی ٹائیل پر کتبہ، مزار نکودر، کندہ تھا[1]۔ یہ تاریخی حقیقت کہ نکودری سردار امیر نوشیرواں کو ضلع یزد کی لڑائی میں امیر مظفر نے کاری زخم لگایا تھا۔ اس مقبرہ کا نام بمعہ کتبہ، مزار نکودر، سے مل کر یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس کی لاش اس کے پیرو اس قبائلی قبرستان میں لے آئے اور دیگر مقابر بھی اسی کے آباؤ اجداد یا دیگر سابقہ سرداروں کے تھے جو یہاں مدفون ہوتے تھے۔

بالائی کمروں کے مزاروں کی تدفینات غالباً تقریباتی تھیں (جیسا کہ چین میں ہے) اور جب خاندانی مزار میں نئی تدفین کی ضرورت ہوتی تو سابقہ لاش کی ہڈیاں کمرے کے نیچے کی محرابوں میں منتقل کر دی جاتی تھیں[2]۔ یہ چینی رسم ہے جس کے تحت ہڈیاں قبر سے نکال کر خاکی برتنوں میں رکھ کر ڈھانپ دی جاتی ہیں اور انہیں سیمنٹ سے جوڑ دیا جاتا ہے تاکہ مرتبان مضبوطی سے بند رہیں۔ مؤخر الذکر خاندانی قبروں سے باہر رکھے جاتے ہیں تاکہ ان میں تازہ

---

[1] مزار ایک نیک یا مشہور آدمی کی آخری آرام گاہ۔ اسم معرفہ 'مزار' کا مادہ اور ہے۔

[2] یہی وجہ ہے کہ محراب ٹوٹی پھوٹی ہڈیوں سے بھرے ہوئے ہیں نہ کہ مکمل ڈھانچوں سے۔ یہ تب ہوتا جب یہ بھی قبروں کے طور پر استعمال ہوتیں۔

لاشیں دفن کی جاسکیں۔ خاران میں بھی کئی جگہوں پر ملوک کے بھٹے کی اینٹوں سے بنے ہوئے مقابر موجود ہیں جو بااثر اشخاص کے ہیں۔ شمشان کے مزارات خاران کی سلام بیگ نیابت میں ہیں اور "ان پر دو بھائیوں ہالہ اور تو ہو اور اُن کی بہن بی بی بستو کے نام ہیں جن میں سے پہلے دو براہوئی داستانوں میں مشہور ہیں کیونکہ انہوں نے جھلاوان میں براہوئی جدگال جنگ میں حصّہ لیا تھا"۔[1] واشک (خاران سے کوئی ۸۵ میل جنوب مغرب میں، دامن کوہ میں) کا پرانا قلعہ غالباً سردار کا صدر مقام تھا۔ گو اُس کے قبائلی بلوچ براہوئی دستور کے مطابق پورے ضلعے میں پھیلے ہوئے ہوں گے اور زمینیں ان میں تقسیم ہوں گی، اور ہر علاقہ کا اپنا اپنا مقامی سردار ہوگا۔

یہ مفروضہ بعید از قیاس نہ ہوگا کہ جونکودری قبائل سیستان میں آباد تھے۔ اُن کا صدر مقام موجودہ ضلع خاران میں تھا اور حکمران نوشیروانی خاندان کا لقب مشہور ڈاکو سردار امیر نوشیروان کے نام سے ہی لیا گیا ہے جو جنگ یزد میں بُری طرح زخمی ہوا، اور مرگیا۔ اور ملک دوستین اور اس کا بیٹا ملک دینار (جو میرواڑی براہوئیوں اور جدگالوں کی جنگ کے ہیرو ہیں) غالباً اسی کی اولاد تھے۔[2]

آزاد خان، نکودری سردار نوشیرواں کا وارث:-

جنگ یزد میں امیر مظفر نے لیٹرے نکودریوں کو جو زک پہنچائی اس میں ان کا سردار اور اس کے پیرو مارے گئے۔ تیمور کی مہم نے ان کا رہا سہا صفایا بھی کر دیا، اور سردار خیل اور قبائل میں رابطہ ختم ہوگیا۔ تیمور کے اقتدار نے ان کے قبائلیوں کو بھی تاخت و تاراج سے روک دیا۔ جیسے بلوچستان میں برطانوی اقتدار کے قیام نے آزاد خان نوشیروانی کی انتھک

---

[1] بلوچستان گزیٹر سیریز جلد ہفتم الف، ص ۴۹۔
[2] ایضاً، ص ۲۳

ترکناز کو روک دیا جو قدیم دور کے قزاقوں کا صحیح وارث تھا۔ ان حالات میں اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں اگر منتفرق خانہ بدوش قبائل (جو نکودری سرداروں کی ترکناز کے مہرے تھے) نے اپنے جاٹ ہمسایوں کے نسبتاً سرسبز علاقے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنا شروع کیا اور اس کے لئے لڑنا بہتر سمجھا۔

ضلع خاران کی موجودہ حالت اس اضافہ پذیر فقدانِ رطوبت کا نتیجہ ہے جو ۱۳۸۴ء میں نکودری سردار کی آخری شکست کے چند سالوں بعد شروع ہوا اور اُسوقت سے جاری ہے۔[۱]

لہٰذا براہوئی جدگال جنگ کا زمانہ چودھویں صدی کا عین آخر یا پندرھویں صدی کا عین آغاز ہے۔

گماچک کے مزارات کی لاشیں غالباً ۱۳۸۴ کے قتلام کے بعد کی آخری لاشیں ہیں۔ اُن کے ارد گرد کی عام قبریں بھی بالائے زمین ہیں۔

نکودری سردار ملوک سیستان کے اتحادی تھے اور غالباً ملوک ممپور کے بھی دوست تھے جن کے علاقوں کے درمیان ان ڈاکوؤں کی آماجگاہیں تھیں۔

ہندوستان اور ساحل کے ساتھ تجارت کے اثرات:۔

اس علاقے میں مور نہیں ہوتا لہٰذا اس کی تصویر ہندوستانی اثر کا نتیجہ ہے۔ نکودری سردار غالباً سندھ سے تجارت کرتے تھے جہاں غلاموں اور دیگر قیمتی مالِ غنیمت کے بہت پیسے ملتے تھے۔ جہاز کی تصویر اسی ساحلی تجارت کا اثر ہے۔[۲]

---

[۱] ترس کے جنگلات کا فقدان اسی خشک سالی کا نتیجہ ہے۔ اگر موجودہ حالات محض سیاسی اسباب کا نتیجہ ہوتے اور تحت الزمین نمی اور بارش مسلسل کاہش پذیر نہ رہتی تو زود رو ترس چند سالوں میں ان متروکہ علاقوں کو ڈھانپ لیتا۔ جہاں پانی اور نمی سطح کے قریب ہوں، وہاں ترس جس تیزی سے پھلتا پھولتا ہے اس کا بیان حصہ دوم اور حصہ سوم میں ہوچکا ہے۔

ٓله مقابر گواچگ کے اندر کی تستبور کا مشرقی رُخ (اور ان کے آس پاس کی قبروں کا بھی) ظاہر کرتا ہے کہ انکو دری مسلمان تھے لیکن تجہیز و تکفین کا طریقہ عجیب ہے۔ اور ثابت کرتا ہے کہ وہ تدفین کے لئے فاصلے سے لائی جاتی تھیں (کم از کم وہ جو بالائی کمروں میں دفن کی جاتی تھیں)

"مقامی بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ لاشیں سابقہ صدی کے اوائل تک اچھی حالت میں تھیں۔ ڈھانچے بستروں اور دریوں میں رکھے ہوئے تھے اور ریشم و کمخواب میں لپیٹے ہوئے تھے جو لوگوں نے اُتار لئے۔ مزاروں کے مشتملات کو کافی نقصان پہنچایا گیا ہے اور بہت سے ہیرے جواہرات اور منکے کئی سال پہلے ایک افغان فقیر نے چرا لئے۔ جس کی پیروی مقامی ریکیوں نے بھی کی۔ ایک لاش کی چوڑیاں اور کفن کے کچھ چیتھڑے حاصل کر لئے گئے ہیں"۔

"۲½ فٹ مربع محراب نمبر ۵ خاص طور پر دلچسپ ہے کیونکہ اس کی بالائی منزل میں ایک لاش محفوظ ہے جو ایک خاتون کی معلوم ہوتی ہے۔ سر کی چوٹی سے پاؤں کے انگوٹھے تک جسم ۵ فٹ ہے۔ ناک اور زیریں ناف حصوں کے سوا باقی کا ڈھانچہ موجود ہے۔ انگلیاں اور ایک کان بالکل برقرار ہیں۔ دائیں کان میں ایک نیلا دھاگہ ہے — ڈھانچہ ننگا ہے۔ مقامی لوگوں نے اسے کئی دفعہ ہلایا ہے اور کبھی اس کو سیدھا اور کبھی لیٹوا ں رکھا ہے۔ اس کے دوران معدے سے ثابت جَو بھی گرے ہیں۔

(بلوچستان گزیٹیر سیریز جلد ہفتم الف ص ص ۴۸-۴۷)

ظاہر ہے کہ تدفین سے پہلے آنتیں نکال لی گئی تھیں اور ان کی جگہ پر بھوسہ یا جَو بھر دیئے گئے تھے۔ ماشکیل کی خشک آب و ہوا میں فن حنوط کا معمولی سا علم بھی لاشوں کو صدیوں تک محفوظ رکھ سکتا ہے۔ لاشوں کی تدفین کا یہ طریقہ بے معنی ہوتا اگر لاشیں دور سے مقبرے میں نہ لائی جاتیں جو ظاہراً خاندانی مقبرہ تھا۔

۱۸۸۹ میں نشاکیل کے رکیموں نے مجھے بتایا کہ مقابر کی لاشیں تدفین کے لئے رنگین کپڑے یا کپڑوں میں ملفوف وملبوس کی جاتی تھیں۔

نکودر کا نام پنجاب میں موجود ہے۔ کم از کم ایک قصبہ نکودر نامی میں نے بھی دیکھا۔ منگول حملے کے بعد ہندوستان ہی سیستان سے بھاگنے والوں کی واحد پناہ گاہ رہ گیا۔ سلطان دہلی غیاث الدین بلبن کے جلو میں سیستانی پہلوانوں کا محافظ دستہ ہوتا تھا جب وہ باہر جاتا تھا۔ یہ لوگ بے نیام تلواروں کے ساتھ کوچ کرتے تھے۔ (سلطان بلبن ۶۶۴ھ تا ۶۸۶ھ = ۶۶-۱۲۶۵ تا ۸۸-۱۲۸۷ء حکمران تھا)

تاریخ فیروز شاہی از ضیاالدین برنی۔ ببلی اوتھیکا انڈیکا' ص ۳۰۔

باب ششم

سیستان کی آبادی اور دیہاتی برادریاں

ایک سیستانی گاؤں :-

ایک سیستانی گاؤں بے ڈھب، مٹی اور گھاس پھوس کی بنی ہوئی جھونپڑیوں کا مجموعہ ہوتا ہے جو عموماً کدخدا یا نائب کدخدا کی رہائش گاہ کے گرداگرد ہوتا ہے۔ گنبدیں، مکھیوں کے چھتے جیسی چھتوں کے بیرونی خطوط میں روشن دان ہوتے ہیں تاکہ ہوا کا گذر ہو سکے اور دھواں باہر نکل سکے۔ یہ عموماً گنبد کے عین اوپر ہوتے ہیں۔ ان سب کے دروازے جنوب اور جنوب مغرب میں ہوتے ہیں اگر گاؤں کو شمال یا شمال مغرب سے دیکھا جائے تو یہ صرف خالی دیواروں کا منظر پیش کرتا ہے جس میں چھوٹے چھوٹے مربع سوراخ ہوتے ہیں تاکہ ہوا آتی جاتی رہے اور سردی میں یہ مٹی سے بند کر دیئے جاتے ہیں۔

باغات :-

شاید ہی کوئی گاؤں اتنا غریب ہو کہ اس کے مضافات میں ایک باغ نہ ہو۔ یہ عموماً کدخدا یا کسی سید یا کسی معلم کا ہوتا ہے جو یہاں رہتا ہے اور یہ سرکاری محصولات سے مبرا ہوتا ہے۔ فاصلے سے باغات کا بھی پتہ نہیں چلتا کیونکہ اس کے ارد گرد اونچی، جیل خانے جیسی دیواریں بنائی جاتی ہیں، تاکہ اشجار ہوا کی دستبرد سے محفوظ رہیں۔ صرف جب راہگیر گھوڑے پر سوار ہو کر گاؤں میں سے گذرتا ہے تو اسے اس کی جھلک نظر آتی ہے، ایک آراستہ و پیراستہ باغ جو لوسن کی کیاریوں سے سر سبز ہے، جس میں پوست کے سفید اور ارغوانی پودے ہیں، جہاں گلاب کے پھولوں کے نرم و نازک برگ و بار ہیں، انار کے درخت ہیں، انگور کی بیلیں ہیں اور ایک کونے میں کاشتہ سرکنڈے اپنے پر پھیلائے ہوئے

ہیں جو مالک کو باڑے بنانے میں کام دیتے ہیں اور یہ سب کچھ خستہ دیواروں اور شور زدہ میدان کے مقابلے پر ایک سحر انگیز تضاد پیش کرتا ہے اور اداس اور بے کیف منظر کی تصویر میں دلفریب رنگ بھرتا ہے۔

آب رسانی :-

دیہات کو پانی کی فراہمی انہار پر منحصر ہے لیکن اگر یہ قریب نہ ہوں تو دیہاتی تالاب پر دارومدار رکھتے ہیں جو اکثر اوقات ناقابل بیان حد تک غلیظ ہوتا ہے۔ جب نہریں خشک ہوجائیں تو اُن کے پاٹ میں کنوئیں کھود لئے جاتے ہیں جو انجان مسافر کے لئے نہریں پُر آب ہونے کے بعد موت کے کنوئیں بن جاتے ہیں۔

نظام مالیہ :-

ملک حلقوں میں تقسیم ہے اور ہر حلقہ ایک کدخدا کے ماتحت ہے۔ کدخدا لوگوں کا منتخب کردہ نہیں ہوتا اور نہ ہی ہمیشہ موروثی ہوتا ہے۔ کدخدا صرف والی سیستان کے تحت ایک اجارہ دار ہے جو اپنی جگہ والی مشہد کے تحت اجارہ دار ہوتا ہے۔ والی مشہد اپنی حکومت خریدتا ہے اور خود محصولات عاید کرتا ہے۔ وہ اپنے ماتحت گورنروں کو بھیجتا ہے اور گورنر سیستان اپنی جگہ کدخدا کو نچوڑتا ہے جو اسی عمل کے تحت کاشت کار سے زیادہ سے زیادہ متمتع ہونے کی دُھن میں لگا رہتا ہے۔ لہٰذا کوئی آدمی بھی گورنر کے سالانہ نیلام حلقہ جات پر زیادہ بولی دے کر کدخدا ہو سکتا ہے لیکن موروثی کدخدا کے پاس حلقہ خریدنے کے لئے وسائل بھی ہوتے ہیں اور نو وارد کے مقابلے میں اُس کی عزت و تعظیم بھی زیادہ ہوتی ہے۔ کدخداؤں کو مالئے پر کٹوتی بھی ملتی ہے اور دیگر مراعات بھی۔

پاگو :-

دیہاتی برادری شراکت کاروں کے گروہوں میں تقسیم ہوتی ہے جو کاشت کے لئے زمین لیتے ہیں۔ ہر گروہ پاگو کہلاتا ہے۔ ان کی تعداد مقدار زمین پر منحصر ہوتی ہے جو کدخدا کاشت کے لئے مقرر کرتا ہے لہٰذا ہر قصبہ، حلقہ اور دیہات میں ان کی تعداد سال بسال بدلتی رہتی ہے۔

ماخذ اصطلاح :-

یہ بلاشک وشبہ ایک قدیم نظام ہے۔ یہ انتہائی اغلب ہے کہ لفظ پاگو لاطینی کے ابتدائی مادہ پگنی اور اسی سے ماخوذ ابتدائی انگریزی پگی سے مشتق ہو جو ایک سو کا حصّہ ہوتا ہے۔ دیہاتی دُور افتادہ برادریاں (جن سے ہمارا لفظ پگن مشتق ہُوا) غالباً کاشت کاروں کے وہ گروہ تھے جو آبائی قصبہ سے دُور زمینوں کے مالک ہوتے تھے جو تہذیب و نفاست کا مرکز سمجھا جاتا تھا جیسے میاں کنگی میں پاگو مزروعہ زمینوں پر معمولی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں اور اکثر و بیشتر شاہرستان کے بڑے بڑے قصبوں سے تعلق رکھتے ہیں جو سیستانی تہذیب و نفاست کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

پاگو کی قسمیں :-

پاگو کی دو قسمیں ہیں :- غمی یا بیگار پاگو اور تحویل۔ غمی پاگو کو کسی بھی جگہ کسی بھی زمین پر کام دیا جا سکتا ہے لیکن تحویل کدخدا کے لئے کام کرتے ہیں۔ لہٰذا انہیں زمین کی حسب منشا قسم دی جاتی ہے۔ اور وہ گاؤں کے قریب ہی رکھے جاتے ہیں کیونکہ وہ اُس کی بیگار بجالاتے ہیں از قسم مرمّت مکان اور اس کے باغ یا افیم کے قطعہ میں کام وغیرہ۔ غمی پاگو کے ذمہ نہروں کی تعمیر و حفاظت یا والی کی رہائش گاہ یا ہلمند میں بند سیستان کی سالانہ تعمیر کی بیگار ہوتی ہے۔ اس طرح مزدور اپنا کھانا خود کھاتے ہیں جس طرح ممکن ہو وہاں رہتے ہیں جہاں کام تفویض کیا گیا ہو۔ عام یا غمی پاگو چھ آدمیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ تحویل پاگو چھ سے دس آدمیوں پر مشتمل ہوتے ہیں لیکن زیادہ تر سات آدمیوں کے ہوتے ہیں۔ جب حصّہ دار خرچ کاشت برابر برابر دیتے ہیں تو محصولات ادا کرنے کے بعد باقی پیدا وار بھی برابر برابر تقسیم کر لیتے ہیں۔

مردِ مُردہ :-

افغانی سیستان میں پاگو اپنا ایک ایک آدمی گاؤں میں بیگار کے لئے چھوڑ دیتے ہیں جو کھیتوں کے کام میں کوئی حصّہ نہیں لیتا اور مردِ مُردہ کہلاتا ہے تاکہ باقی لوگ یکسوئی سے کاشتکاری کرتے رہیں۔

زمین کی فیس اور عمال :-

زمین حکومت کی ملکیت ہے اور کسی کا اس پر کوئی حق نہیں۔ ہر پاگو کو زمین لینے کے لئے زیادہ سے زیادہ ۶۰ قران دینے ہوتے ہیں۔ زمین سالانہ تقسیم کی جاتی ہے اور غمی پاگو اس کا محل وقوع بھی نہیں جانتے۔ ایسے پاگو مطلقاً کدخدا کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں اور کچھ نہیں جانتے کہ انہیں شاہرستان میں زمین ملے گی یا میاں کنگی کے دور دراز حصّوں میں۔ فیس پہلے لے لی جاتی ہے لیکن زمینوں کی تقسیم عین کاشت کے آغاز کے قریب کی جاتی ہے تاکہ غمی پاگو کو انکار کرنے بھی نہ بنے۔ تحویل پاگو کی زمین اور عملہ میں کافی لے دے ہوتی ہے جو شاید انتہائی محتاط غیر جانبداری میں بھی کسی حد تک ناگزیر ہے لیکن جو لوگ مشرق کو جانتے ہیں انہیں پتہ ہے کہ چین سے ترکی تک ملکی قوانین بہترین سے بہترین ہو سکتے ہیں لیکن انہیں نافذ کرنے کے لئے مطلوبہ محتاط غیر جانبداری کسی مشرقی ملک میں موجود نہیں۔ قواعد وضوابط کا نفاذ نافذ کنندگان کی حرص وطمع پر منحصر ہے۔ کدخدا کے تحت اہم ترین عامل انجینئر آبپاشی ہے۔ اسے ایک سے زیادہ دیہات کی نہروں کی حفاظت کرنا پڑتی ہے اور جہاں گاؤں اہم ہو اور مزروعہ رقبہ کافی ہو، وہاں تو اسے آبی گذرگاہوں کی حفاظت اور کاشتکاروں میں تقسیم آب کے لئے دن رات چوکس رہنا پڑتا ہے۔ اس کے فرائض نہروں یا تقسیم گاہوں کی صف بندی کرنا، انہیں کارآمد اور صاف رکھنا، پشتوں کی مطلوبہ مرمت سے کدخدا کو آگاہ کرنا خواہ یہ کاشت کی نہروں کے پشتے ہوں یا ہاموں اور دریا کے فاضل پانی کی نہروں کے اور اس مقصد کے لئے ہٹے کٹے مزدوروں (حشر) کو کام پر بلانا اور لگانا ہیں۔ تقسیم آب سے انجینئر کے ہاتھ خوب پیسہ آتا ہے۔ اس کی آمدنی ہر پاگو سے اناج کا حصّہ ہے جو دیگر دیہاتی عمال کو بھی ملتا ہے، اور قدیم الایام سے مقرر ہے۔ یہ اس کا سرکاری معاوضہ ہے لیکن بروقت نذرانہ اس کی خوشنودی خرید سکتا ہے۔

آبپاشی انجینئر :-

دیہاتی برادری کا یہ مفید فرد اس وقت سے موجود ہے جب سے

کاشت کاری وجود میں آئی۔ اور جہاں نہریں اور آبی گذرگاہیں ضروری ہیں۔ روسیوں کو بھی یہ انجنیئر ترکستان کے نہری علاقوں میں ایسے ہی نظر آیا جیسے عرب اور دیگر فاتحین کو۔ تجربہ نے ثابت کر دیا کہ "اپنی جہالت اور تکنیکی مہارت کی کمی کے باوجود مقامی انجنیئر محض آبائی رسم کی پیروی کرتے ہوئے اور زمین کی ضروریات کا موروثی ادراک رکھتے ہوئے اہل یوروپ سے زیادہ کامیاب تھے، جنہیں نہروں کا انتظام آزمائشی طور پر سپرد کیا گیا تھا تاکہ آریق آکسکل کا عہدہ ختم کیا جاسکے۔"[1] یہ وہ نام ہے جس سے سمرقند کے اردگرد مقامی انجنیئر پہچانا جاتا ہے۔ سیستان کے باہر اسے میر آب، سیستان میں پاؤ کار یا گاہے ماہے چہار چن اور وادئ ہلمند میں گلبہ کہتے ہیں۔ روسی حکومت کے تحت میر آب کو سالانہ فصل کے مطابق ادائیگی ہوتی ہے لیکن سیستان وغیرہ میں مسلمہ معاوضہ سے زیادہ وہ رشوتوں سے خوب ہاتھ رنگتا ہے۔ اس طبقہ کے کئی آدمی ماضی میں مناصب جلیلہ تک پہنچے کیونکہ ان کے موروثی تجربہ کے علاوہ یہ عہدہ بہت منفعت بخش بھی تھا۔ محمد تقی خان جو نادر شاہ کے وقت والئ فارس اور کوہ گیلوئیہ مقرر ہوا، شروع میں صرف شیراز کا میر آب تھا۔

کُلگر :-

پاگو کے علاوہ کُلگر بھی ہے جو معافی کی زمینوں کو کہتے ہیں۔ سیستان میں ایسی زمینیں ۱۰۰ پاگو کے مزروعہ رقبے کے برابر تھیں۔ تین چار کُلگر ایک پاگو کے رقبہ کے مساوی تھے۔ ۸۰۰ خاندان ان سے مستفید ہوتے تھے۔ یہ مالکوں کے قبضے میں ہوتے ہیں اور اُنہی کے زیرِ انتظام و کاشت۔ یہ زمینی عطیات عموماً ملاؤں اور مجتہدین کو ملتے ہیں لیکن حسن کارکردگی کے لئے بھی دیئے جا سکتے ہیں۔ یہ تحویل پاگو میں شامل ہوتے ہیں۔

---

[1] روسی ترکستان، ص ۱۶۔

افیم :-

افیم مقامی کھپت کے لئے کاشت کی جاتی ہے اور اندازہ لگایا گیا کہ پوری اسّی فیصدی آبادی اُس کی عادی ہے۔

کدخدا اور عسکری خدمت :-

تحویلی عطیات کے بدلے کدخداؤں پر عسکری ذمّہ داریاں ہیں۔ وہ گھوڑے یا خچرّ (اور میاں کنگی میں جمّباز اُونٹ) رکھتے ہیں۔ جس پر وہ اپنے رشتہ داروں اور متوسّلین کو سوار کراتے ہیں جو ملک کی عام ملیشیا پولیس ہیں۔ یہ بھرتی ۱۹۰۴ میں عاید کی گئی، اور ۵۰ مسلّح آدمیوں کی طبلاع ملی۔ ان کا اسلحہ بوسیدہ اور بیکار ہوتا ہے۔ سیستان کے ذمّہ دس ہزار (۱۰٫۰۰۰) توڑے دار بنادیق ہیں اور آخری دفعہ ان کا اجتماع اُس وقت ہوا جب خاران کا آزاد خان سیستان پر حملہ کرنے والا تھا لیکن اُس نے نہایت عقلمندی سے اپنے سوار پیرووں کو نہروں میں اُلجھانے اور وادی ہلمند میں چکانسر کی نذر ہونے سے بچا لیا۔ پاگوں کی تعداد سے سیستان کی کارآزمودہ آبادی معلوم ہوسکتی ہے جو ۰۵-۱۹۰۴ میں شاہرستان اور میاں کنگی کے لئے قریباً ۱۳٫۷۲۰ ہو گی۔ لیکن اس آبادی کے لئے پرانا سرانا اسلحہ بھی نہیں ملتا تھا۔

مالیہ :-

مالیہ جنس میں لیا جاتا ہے اور زمین کے استعمال کا عوضانہ ایک تہائی ہے لیکن ان کے علاوہ باقیماندہ پر عشر بھی لیا جاتا ہے جسے مقامی طور پر وہ نیمہ کہتے ہیں۔ گویا ہر غمی پاگو کی کاشتہ زمینوں کی کُل پیداوار کا ۲/۵ یعنی چالیس فیصدی ہوتا ہے۔ یہ تحویل پاگو کو اپنی مزروعہ زمین کی مجموعی پیداوار کا قریباً نصف لگان دینا ہوتا ہے۔ دُوسرے لفظوں میں باجگزاری کے معاملہ میں تحویل یا گوغمی پاگو سے بہتر حالت میں نہیں البتہ میعات، قسم زمین اور محل و قوع کے اعتبار سے ضرور بہتر ہے اور اس کے لئے عموماً محتاط کاشتکار ہی لئے جاتے ہیں۔

کدخدا کا معاوضہ :-

اس کے علاوہ کدخدا ہر پاگو سے ۳۰ سیستانی من غلّہ بھی لیتا ہے۔ قدیم دَور میں یہ ۵۰ من ہوتا تھا۔ یہ اس کے معاوضہ کا ایک حصّہ ہے۔

مالیہ اندوزی بصورت جنس :-

مالیہ اندوزی غلے کی تقسیم پر مبنی ہے جو ہر پاگو کے پڑ پر کی جاتی ہے۔ افغانستان میں اور برطانوی منتظمین اسے بٹائی کہتے ہیں۔ اس نظام کے نقصانات واضح ہیں لیکن ایران جیسے یا کسی بھی مشرقی ملک میں اس سے پیدا ہونیوالی برائیاں بہت زیادہ ہیں اور یہ دیہاتی عمّال کو ناجائز آمدنی کا خوب موقع دیتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک ہر فصل پر ہر پاگو سے اپنا حصّہ لیتا ہے۔

دیگر دیہاتی کارکن :-

ان کے علاوہ دیہاتی برادری کے دیگر غیر کاشت کار، پیشہ وَرانہ اور صاحب علم مفید کارکن بھی ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک کو ہر پاگو مقررہ مقدار کے مطابق غلّہ دیتا ہے۔ جیسے حجّام جرّاح کو ۵ من اور لوہار کو ۲۰ من۔ ملّا کا حصّہ علیٰحدہ ہوتا ہے جو پیدائش، اموات اور شادی پر کام آتا ہے اور تعلیم بھی دیتا ہے۔

کرائے کے بیل :-

اگر ہل کے بیل کرائے کے ہوں تو غلّے کی بعد منہائی پیداوار کا ایک تہائی کرائے میں چلا جاتا ہے۔ یہ تمام قانونی اور دیگر اخراجات کے بعد عملی پاگو کے افراد کے پاس کوئی ۱/۵ یا بیس فیصدی بچتا ہے جو وہ آپس میں بانٹتے ہیں۔

نقد ادائیگی :-

نقد ادائیگی صرف زمین لینے کی فیس ہے جو کدخدا کو دی جاتی ہے اور سَر نسخی کہلاتی ہے۔ اس کے علاوہ گندم اور جَو کی گہائی کے لئے اگر جانور کرائے پر لئے جائیں تو اس کی بھی معمولی سی نقد

ادائیگی ہوتی ہے۔ یہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ ہر پاگو اوسطاً کوئی ۷۰ ایکڑ زمین کاشت کرتا ہے۔

زمین کی سلب قوت :-

مذکورہ نظام کے تحت سیستانی زراعت کا مقصد زیر کاشت زمین سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا ہے۔ گاؤں کے قرب وجوار کی زمینوں کے سوا کھاد کا کسی کو پتہ بھی نہیں۔ چرواہوں کو اجازت دی جاتی ہے کہ وہ غیر مزروعہ زمین پر اپنے ریوڑ بٹھائیں تاکہ اُن کا گوبر گھروں کے کوڑا کرکٹ وغیرہ سے مل کر کم از کم بنائیں کی زمینوں کی کھاد بن سکے۔ شاہرستان اور میاں کنگی ہیں سالانہ ۵۶۰ ر ۱۵۹ ایکڑ زمین یا کوئی ۲۴۸ مربع میل رقبہ زیر کاشت ہوتا ہے۔ اگر ناقابل کاشت رقبہ جو کمزور زمین یا سطح آب سے اُونچائی (بوجہ ریگزار یا کھنڈرات یا ہوا زدگی یا دریائی گذرگاہوں (صرف پریوں اور اس کی گذرگاہیں تیس مربع میل رقبے پر بصورت طغیانی محیط ہو جاتی ہیں) کی وجہ سے قابلِ استعمال نہیں ہوتا۔ نکال دیا جائے تو شاہرستان اور میاں کنگی کا ایک تہائی سے بھی کم رقبہ ہر سال زیر کاشت ہوتا ہے۔ اور یہ بھی اُس وقت ممکن ہوتا ہے جب کاشتہ زمینوں کو دو سال کے لئے غیر مزروعہ چھوڑا جاتے۔ اس سے نہری آبپاشی یا طغیانیوں کی گاد کسی حد تک اس کی روز افزوں کمزوری کو روکتی ہے اور اس کی قوت کو بحال کرتی ہے۔

سائنسی ذرائع کا استعمال :-

اگر ہلمند پر ایک بیراج بنا دیا جائے اور نہروں سے سائنسی آبپاشی ہو تو ۵۰۰۰ مربع میل کا رقبہ پانی سے مستفید ہو کر زیر کاشت لایا جا سکتا ہے۔ تیمور کی آوردہ تباہی سے پہلے ایک بیراج یعنی بند رستم کی موجودگی سیستان کی تہذیب آشنائی کا واضح ثبوت ہے۔ اس کے ابتدائی حکمران یقیناً ایک سائنسی نظام آبپاشی کی خوبیاں سمجھتے تھے۔ ایسے بیراج کی تعمیر ہلمند کی گاہے گاہے خشکی کا بھی مداوا کر سکتی ہے کیونکہ ۱۹۰۲ میں جب ڈیلٹا محروم آب رہا تو بھی دریائی پاٹ میں چہار برجک کے نشیب تک پانی موجود تھا۔

افغانی سیستان :-

افغانی سیستان کے ضلع کنگ میں ایسے دائمی دیہات ہیں جن میں زیادہ تر افغان کاشتکار آباد ہیں۔ ان میں غلزئی بھی شامل ہیں جو میر ولیس کے دنوں سے سیستان میں موجود ہیں جب اس نے موت سے کچھ عرصہ ہی پہلے قندھار ایرانیوں سے لے لیا تھا اور سیستان پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس ضلع میں بھی زمینی آبپاشی کا انتظام ہے لیکن چکانسر (جہاں گورنر رہتا ہے) کا علاقہ صرف قدرتی رطوبت سے سیراب ہوتا ہے۔

اندازہ لگایا تھا کہ ۱۹۰۴-۰۵ سے چھ سات سال پہلے یہاں کوئی ۴۰,۰۰۰ ایکڑ رقبہ غیر مزروعہ ہو گیا تھا لیکن یہ زیادہ تر حکومت کی پالیسی کا نتیجہ تھا جس کے تحت بلوچوں کو ہرات کے شمال میں ضلع بادغیس میں منتقل کر دیا گیا اور انہیں وہاں زمینیں بھی دے دی گئیں۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ امیر بادغیس میں سنی آبادی قائم کرنا چاہتا تھا (اور بلوچ ہمیشہ سنی ہوتا ہے) جو شیعہ ہزاروں کے درمیان رہے۔

شاہرستان کے حلقے :-

شاہرستان کے حلقوں کی تعداد معلوم نہ ہو سکی جو نظم و نسق زمین کے لئے بنائے جاتے ہیں یہاں ہم مرکز حکومت سے بہت قریب تھے لیکن پریون کے پار لوگ زیادہ متعاون تھے۔ میاں کنگی ضلع حلقوں میں تقسیم ہے جو ٹھیکہ داروں کو گورنر کے حق مالیہ اندوزی کے بدلے دیدیئے جاتے ہیں۔

میاں کنگی کے حلقے :-

اس ضلع میں صیادک حلقہ (۱۹۰۴-۵ میں) سردار خان جہان خان سنجرانی کا اجارہ تھا۔ یہ حلقہ جنس کی صورت میں ۴۰۰ خروار غلہ (گندم اور جو برابر برابر) سالانہ اور ۱۲,۰۰۰ قران سالانہ نقد ادا کرتا تھا۔ سردار کو ۶۰ خروار کی چھوٹ دی جاتی تھی اور اس کے تین مختاروں کو دس دس خروار کی چھوٹ ملتی تھی۔ اس حلقہ میں کلگروں کی پیداوار پانچ حصوں میں تقسیم ہوتی تھی۔ سرکار کے دو حصے اور کاشتکاروں کے تین ہوتے تھے جن میں سے وہ کدخداؤں، دیہاتی حکام اور

کمین لوگوں کے وظائف ادا کرتے تھے۔

دیہہ دوست محمدؒ :-

اس علاقے کا لگان ۱۰۰۰ خروار گندم اور جو اور بیس ہزار قران سالانہ نقد تھا۔ دوست محمدؒ سرُونی (جواب مرفہ الحالی کی وجہ سے قزلباش کہلاتا ہے) اجارہ دار کو ۹۳½ خروار کی چھُوٹ ملتی تھی جس کے بدلے وہ دو گھوڑ سوار اور ایک جمباز (شتر سوار) بھی رکھتا تھا۔ ہر گھوڑ سوار کو دس خروار اور شتر سوار کو پانچ خروار غلہ سالانہ ملتا ہے[1]۔ اس کے علاوہ دوست محمدؒ کو پُورے ضلع کنگی میں چرائی محصول کا حق بھی ملا ہوا تھا۔

برُج میر گُل :-

سالانہ ۵۶۰ خروار گندم و جو اور ۵۰۰۰ قران نقد کا لگان، اجارہ دار کو ۴۰ خروار کی چھُوٹ۔

جہان آباد :-

۴۰۰ خروار گندم و جو اور ۳۰۰۰ قران سالانہ کا لگان۔

ٹپلگی :-

۲۶۰ خروار گندم و جو اور ۶۰۰۰ قران سالانہ کا لگان۔ اجارہ دار کو ۷۰ خروار چھوٹ کے بدلے ۴½ گھوڑ سوار اور ۲ جمباز رکھنے ہوتے ہیں۔

گرُگرُی :-

اس حلقے کا سالانہ لگان صرف ۶۰ خروار گندم و جو اور ۸۰۰ قران نقد ہے، دو گھوڑ

---

[1] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گھوڑ سوار کو شتر سوار پر فضیلت حاصل تھی۔ یہ ایک پرانی ریت ہے اور غنیمت کی تقسیم بھی اسی نسبت سے کی جاتی ہے۔ آزاد خان مرحوم کے چھاپوں میں بھی اسی پر عمل کیا جاتا تھا اور وہ پیدل ہونے کی وجہ سے صرف آدھا حصہ ہی لے سکتا تھا۔

سوار رکھے جاتے ہیں اور چھوٹ ۲۰ خروار تھی۔

پدائی :-

دُر محمد سُرونی اور میر حاجی محمد اس حلقہ کے مساوی شراکت کار اور ذمہ دار ہیں۔ سالانہ لگان ۲۰۰ خروار گندم و جَو اور ۲۰۰۰ قران تھا۔

دولت آباد معہ خامک :-

سالانہ لگان ۱۰۰۸۰ قران اور ۳۵۰ خروار تھا۔ تاج محمد کُول چونکہ متعدد دیہات میاں کنگی کا اجارہ دار تھا لہٰذا اُس نے ان کے دو حصّے کر دیئے۔ ایک تہائی دولت آباد اور دو تہائی خامک کے تحت تھے۔ سالانہ لگان بھی اسی نسبت سے تقسیم ہوتا تھا۔

نہروں پر کام :-

نہروں پر کام سرکاری بیگار ہے لہٰذا کارکن اپنی روٹی کھاتے ہیں اور بلامعاوضہ کام کرتے ہیں۔ ہر ماگو ایک ایک آدمی دیتا ہے۔

ایرانی علاقے کے دیہات :-

ڈیلٹا کے ایرانی حصّہ میں ۳۸۶ گاؤں تھے بشمولہ بر میاں کنگی (جہاں کے اکثر گاؤں پنڈ نہیں بلکہ پنڈ درے ہیں بوجہ تعداد مکانات اور عارضی نوعیت مکانات) ان میں سے صرف تین کی آبادی ۵ سو سے زیادہ اور ۲ کی تقریباً تین سو سے پانچ سو تک تھی جبکہ دیگر محض پنڈ درے تھے۔

افغان علاقے کے دیہات :-

سرحد پار افغان علاقے میں صرف ضلع کنگ میں دائمی گاؤں تھے اور گورنر کی رہائش گاہ چکانسُر کے سوا کاشت کار محض بھونڈی عارضی جھونپڑیوں کے گروہوں میں رہتے ہیں جن میں سے بعض مٹی اور گھاس پھوس کی جھونپڑیاں زیادہ مستقل نوعیت کی ہیں۔

گاؤں کا رقبہ :-

سرحد کے ایرانی طرف گاؤں کا اوسط زمینی رقبہ تین مربع میل سے کم ہے ۔ گنگ علاقہ میں بھی قریباً اتنا ہی ہے ۔ ضلع چکانسُر میں اوسط نکالنا گمراہ کُن ہے اس لیے کہ اس ضلع میں بہت بڑے بڑے علاقے کھنڈرات سے ڈھکے ہوئے ہیں جو صرف وافر بارش و برفباری میں ہی کاشت کئے جا سکتے ہیں اور سیستان میں ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے ۔ سارو تار کے کھنڈرات ۵۰۰ مربع میل پر پھیلے ہوئے ہیں جہاں انسان زندہ نہیں رہ سکتے ۔

مَردم شماری :-

ایرانی اور افغانی ڈیلٹوں کی پانچ چھ دفعہ مردم شماری کرائی گئی اور اوسط نتائج گوشوارں میں درج کر دیئے گئے ہیں ۔ یہ حتیٰ الامکان صحیح ہیں ۔ کیونکہ مردم شماری کے جو باضابطہ طریقے ترقی یافتہ ممالک میں مروّج ہیں وہ ایک غیر ملک میں اختیار نہ کئے جا سکتے تھے ۔

جہاں تک ممکن ہوا مشن سے منسلک جائزہ پارٹی کے ماتحت عملہ کو کام میں لایا گیا ۔ جائزہ کاروں کو دیہات کی ابجدی فہرستیں اور نمبر زدہ صفحات کی بیاضیں دی گئیں اور انہیں حکم دیا گیا کہ وہ اپنی تحقیقات اسی مقام تک رکھیں جہاں سے وہ ایرانی اور افغانی حکام کی گرفت میں نہ آئیں ۔ ایک وقفہ دیا گیا ' دیہات کو از سرِ تقسیم کیا گیا اور ہر شمار کنندہ کو مختلف دیہات اور بیاضیں دی گئیں ۔ اس عمل کے تکرار کے بعد آخری نتائج کا مقابلہ میں نے کیا ۔ افغان علاقے میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا لیکن یہاں مقامی ملاؤں کے توسط سے یہ کام انجام تک پہنچا ۔

خاندان شماری :-

چونکہ فرداً فرداً اور مفصّل شمار ناممکن تھا لہٰذا خاندان شمار کئے گئے اور افراد خاندان کی اوسط میں نے خود نکالی ۔ ایرانی فارسی دانوں کی دیہاتی برادریاں اور ضلع چکانسُر کے علاقہ گنگ میں (جہاں افغان آباد ہیں اور مستقل دیہات ہیں) ہر گاؤں کے گھرانوں کا شمار کیا گیا ۔ یہ گاؤں مکانات مسکونہ پر مشتمل ہیں ۔ علیحدہ علیحدہ خاندانی رہائش گاہیں جن میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک احاطہ

منسلک ہے جہاں مویشیوں کے اصطبل، ایندھن اور چارے کے کمرے اور انسان وحیوان کی ضروریاتِ زندگی اور آلات رکھے جاتے ہیں۔ فارسی لفظ "خانہ" ان مکانات کے لئے بھی مستعمل ہے اور خاندانوں کے لئے بھی۔ لہٰذا گاؤں میں مکانات کی تعداد غلطیوں کے احتمال کے باوجود ایک دیہاتی برادری کے خاندانوں کی تعداد متعین کر دیتی ہے۔

تغیّر پذیر آبادی :-

اکثر دیہات کے ساتھ چرواہوں کے گھرانوں کی تھوڑی سی آبادی بھی منسلک ہوتی ہے۔ یہ لوگ چٹائی کی جھونپڑیوں یا کمبل کے خیموں میں گاؤں کے مضافات میں رہتے ہیں لہٰذا آسانی سے قابل شمار ہیں۔ یہاں بھی ہر خاندان کا اپنا اپنا خیمہ یا چھپّر ہوتا ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ ہر فارسی دان یا گڈریا شادی کرانے کے بعد علیحدہ مکان دار بن جاتا ہے اور اس کے والدین کسی غیر شادی شدہ بیٹے (بشرط موجودگی) کے ساتھ رہنے لگتے ہیں۔ بیٹیاں شادی کے بعد اپنا خاندان چھوڑ دیتی ہیں اور دیگر خاندانوں میں ضم ہو جاتی ہیں۔

ایک خاندان کی اوسط تعداد :-

چالیس پچاس خاندانوں کے مشاہدے کی بنا پر افراد خاندان کی اوسط ۳ء۴ نکلی[1]۔ اسی کو (۴.۳) پورے ملک پر منطبق کیا گیا۔ یہ غالباً صحیح ہے اس لئے کہ اونچے طبقے کی دونوں اصناف کی افیم خوری، متعفن زندگی اور شہوت پرستی کی وجہ سے ان کے خاندان بہت مختصر ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں مشاہدات زرعی مزدور طبقوں تک محدود رکھے گئے جو سیستان میں بھی دیگر مقامات کی طرح بالائی طبقوں کی نسبت کثیر العیال ہوتے ہیں۔

ایرانی اور افغان علاقے میں خاندانوں کی تعداد :-

نتائج ماخوذہ سے ۵-۱۹۰۴ میں سیستان کی خاندانی آبادی حسب ذیل تھی :-

---

[1] بلوچستان میں ۱۹۰۱ کی مردم شماری کے مطابق ایک گھرانے کی اوسط ۵.۴ تھی۔

ایرانی علاقہ	زرعی	شبانی
شاہستان	۱۳،۷۸۷	۱،۸۳۵
میاں کنگی	۵،۵۴۱	۲۳۲
	۱۹،۳۲۸	۲،۰۶۷
افغان علاقہ		
ضلع کنگ	۳،۶۲۰	۱،۸۸۴
چکانسُر	۲،۳۸۰	۳،۱۵۰
	۲۵،۳۲۸	۷،۱۰۱

اس طرح ہلمند کے ڈیلٹا میں خاندانوں کی کل میزان ۳۲،۴۲۹ تھی اور یوں کل آبادی ۱۳۹،۲۹۴ تھی۔

آبادی فی مربع میل :-

سرحد کی ایرانی طرف ۰۵-۱۹۰۴ میں آبادی فی مربع میل چھبیس خاندان یا ۱۱۱ نفوس تھی اور افغان علاقے میں سولہ خاندان یا ۶۹ افراد تھے۔

سیستان کی کل آبادی :-

سیستان کی کل آبادی نکالنے کے لئے ضروری ہوگا کہ ایرانی علاقہ کے جنوبی ڈیلٹا کی اندازاً آبادی اور قلعہ فتح اور چہار برجک (افغان) اضلاع کی آبادی کو جمع کر لیا جائے۔ ان اضلاع میں کل زرعی اور راعیانہ آبادی ۵،۱۲۰ خاندانوں یا ۲۱،۵۵۲ نفوس پر مشتمل تھی جس میں راعیانہ آبادی جزو اعظم تھا۔ اس طرح ۰۵-۱۹۰۴ میں سیستان کی کل آبادی ۱۶۰،۸۴۶ ہوئی۔

آبادی کی تقسیم :-

ہلمند کے ڈیلٹا میں آبادی کی تقسیم یوں تھی جس[1] کی ایرانی طرف ۹۱،۹۹۸ نفوس اور افغان

[1] 'سرحد بلوچستان' میں صفحہ ۲۲۴ پر یہ غلطی سے صرف ڈیلٹا کی آبادی بتائی گئی ہے۔

علاقہ (صرف کنگ اور چکانسر اضلاع میں) ۴۷،۲۹۶ نفوس تھے۔

ضمیمہ جات ایک اور دو میں ایرانی علاقے کی آبادی کے اعداد وشمار قریہ بہ قریہ دیئے گئے ہیں اور ڈیلٹا کے افغان حصّہ کی زرعی وراعیانہ آبادی کے قبائل کے خاندانوں کی اندازاً نفری کا خلاصہ دیا گیا ہے۔

نتائج تقریباً صحیح ہیں:۔

یہ نتائج قطعی طور پر صحیح تو نہیں ہیں لیکن حالات اور تحقیق کی نوعیت کے تحت ان کی صحت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ احتیاط برتی گئی اور یوں یہ نتائج بیحد محتاط اور آزادانہ تحقیق کی وجہ قریباً صحیح سمجھے جا سکتے ہیں۔

آبادی کے تغیّرات:۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیستانی تاریخ کے مختلف ادوار میں یہاں کی آبادی بڑھتی اور گھٹتی رہی ہے۔ وقائع نگاروں نے آبادی کی کمی کو ہمیشہ اس تاراج سے منسوب کیا ہے جو ۱۳۸۴ء میں تیموری فتح کے بعد سے ملک پر مستولی ہو گیا۔ سولہویں صدی کے اوائل سے اٹھارھویں صدی کے وسط تک ایرانی حاکمیت کے تحت ملوک کیانی کا دور بیرونی اور اندرونی امن کا دور تھا لہٰذا آبادی میں قدرتی طور پر بھی اضافہ ہُوا۔ اور آبادکاروں کی آمد کی وجہ سے بھی۔ ایران اور خاندان ملوک کے زوال و انحطاط کی وجہ سے ملک کو ضعف پہنچا حتیٰ کہ ۱۸۷۲ء میں سر فریڈرک گولڈ شمٹ کے اندازے کے مطابق ڈیلٹا کی آبادی صرف ۴۵،۰۰۰ رہ گئی۔

تیمور سے پہلے کی آبادی:۔

ہر قسم کے کھنڈرات اور ہر نوع کی متداولہ روایات کی بنا پر میرا اندازہ یہ تھا کہ تیموری حملہ (۸۴-۱۳۸۳) سے پہلے آبادی کم از کم ڈھائی لاکھ ہو گی اور غالباً ۰۵-۱۹۰۴ کی آبادی سے دوگنا ہو گی۔

ضمیمہ نمبر ایک

(الف)

سیستان کے اضلاع شاہرستان و میاں کنگی کی دیہاتی آبادی اور پاگوں کا خلاصہ

ایرانی علاقہ

۰۵-۱۹۰۴

شاہر

نمبر	گاؤں کا نام	پاگو		خاندانوں کی تعداد	
		غمی	تحویل	کاشتکار	غیر کاشتکار
۱	اکبر عباس	۱۲	۲	۸۸	۲۴
	عباس کور	۳	۱	۲۴	۱۵
	عباس خان	۳	۱	۴۰	-
	آدمی	۲۱	۱/۲	۳۱۰	-
۵	افضل آباد	۱۰	۲	۷۶	۱۵
	آغائی	۵	۳	۷۴	-
	اکبر آباد	۶	۲	۵۲	۲۲
	اکبر جعفر	۴	۱	۴۰	-
	اکبر شاہ نذر	۲	-	۲۰	-
۱۰	اخوند ملا غلام	۲	۲	۲۵	-
	علی آباد نمبر ایک (سید)	۲۱	۹	۱۹۸	۵۰
	علی آباد نمبر دو (زاہدان)	۹	۳	۷۶	-
	علی اکبر نمبر ایک	۳	۱	۲۷	-
	علی اکبر نمبر تین	۱	-	۸	-
۱۵	علی اکبر نمبر دو	۳	۳	۴۰	۲۴
	علیاری	۲	۱	۹	-

ستان

کدخدا	باشندوں کے قبائل
پُردل خان سربندی	اَندی، سیخوُلی (شیخوُ یا سنگولی)
سلطان شاہرتی	گرُگ اور سفید خاکی
محمد امیر جمالزئی	میرشکار اور رصافی
میرقاسم (میر)	پُدنا، سیخوُلی اور دلاّرامی۔ صرف چار کلگر کوئی تحویل نہیں۔
ملاّحسین (ارباب)	ارابیب
آغائی (ارباب)	ارابیب اور غداہ
فیقر، میرشکار	میرشکار، زَور اور پنجک
محمد امیر، سربندی	سربندی اور زَور
مرزا حیدر، کیانی	کوُل
میر بیگ، سربندی	تحاویل محمد کاخا اور غنی پاگر میر بیگ گرگ اور ملاّعلی کے تحت
سید علی	
میرقاسم	شیخ تلز، سیخوئی
ابراہیم دباسی، جورتغ	جورتغ اور خضری
چلنگ کے ماتحت	میرشکار
پُردل خان، سربندی	گرگ، شہریاری، رہاز
محمد حیدر، فرآط	ملاّ شاہی، کچھ کمبل کے خیموں میں رہتے ہیں۔

	الٰہی	۵	۱	۳۲	-
	الاصوفی نمبرایک	۳	۱	۲۶	۶
	” نمبر دو	-	۵	۳۴	-
۲۰	اللہ آباد	۸	۲	۶۴	۲۰
	علی جعفر	۴	-	-	-
	آسس	۴	۱	۶۰	-
	آسس قاضی	۳	-	۱۸	۶
	آواز	۳	-	۲۴	-
۲۵	بچاؤرہ	۳	-	۳۵	-
	بانک	۶	۱	۴۴	۵
	بہرام آباد	۲۴	-	۱۴۴	۳۶
	بختی	۶	-	۹۴	-
	بالاخانہ	۱۰	۲	۷۶	۳۰
۳۰	بولئی	۱۲	۳	۱۶۰	-
	رازی	۳	۳	۶۰	-
	بُنجار	۳۰	۱۰	۵۲۴	-
	بُرج افغان	۸	۳	۱۱۲	-
	بُرج محمد خان	۲	-	۱۴	-

غلام، شہریاری	شہریاری اور زور
چلنگ کے ماتحت	خضری، میر شکار
محمد مہدی، کاخا	زوری، بیلے، کمالی، الاصوفی
ارباب حیدر	کاخا اور رباز
جزنیک کے تحت	جزنیک سے کاشتہ
غلام تمر آبادی، مسگر	راہدار، گلوی
تاج محمد، پری	پری
فقیر محمد، خمر	ادادی
نوابخان گور گیج، حیدر علی ناہروئی	ایک پاگو حیدر علی کے تحت، شریف آباد رخشانی، عزمہ (بلوچی)
محمد، کاخا	زور
تاج محمد کول	سرگازی، گرل - آدھی پیداوار سرکار کو اور آدھی کدخدا کو دو سواروں کے بدلے ۔
حیدر علی خان ناہروئی	بجلائی، زور، دلآرامی
محمد مہدی کاخا	سرگازی اور کاخا
آغائی میر دیس	میر دیس، سید، جر، ابول
خانی جو تیغ	بازی
میر امیر ابن میر عباس	خمر، سنادگل، غدہ اور میر
شیر علی خان سنجرانی	حاجی رس، میر، غلزئی
تاج محمد گول	کریم کشتہ، حیدری، زور

۳۵ برج سربند	۴	-	۲۴	۱۴
چاہ نیمہ	۶	۱	۱۸	۵
چارخامی	۲	-	۱۲	۸
چلنگ	۳	۴	۲۰۰	-
چنگ مرغن	۳	-	۳۲	-
۴۰ دراگی	۲	۲	۲۰۰	-
داؤدی	۲۰	۱۰	۲۶۰	۶۴
دولت آباد	-	۳۰	۲۴۰	۱۰۰
دیہہ امیر	۳	-	۱۸	۵
دیہہ عسکری	۶	-	۸۶	-
۴۵ دیہہ ارباط	۱۵	۵	۲۱۰	-
دیہہ درانی	۱	-	۱۲	-
دہ باشی دیہہ	۴	۱	۶۲	-
درویش (دیہہ)	-	۳	۲۶	-
دشتک	۶	۲	۵۰	-
۵۰ دیہہ غزمہ	۱	-	۹	-
دیہہ گرگ نمبر ایک	۴	-	۴۰	-
دیہہ گرگ نمبر دو	۲	-	۹	-

محمد محسن خان شاہرتی	شاہرتی
سفر بلوچ	بلوچ، پانچ پاگر فارسی دانوں کے، لیکن صرف تین اس میں رہتے ہیں۔ باقی کفتارگی میں رہتے ہیں۔
حسین آباد، پلپلی کے ماتحت	پلپلی
درویش، میرشکار	میرشکار، راہدار، سربندی
غلام شاہ، شاہرتی	شاہرتی، پدنا
دادشاہ، ارباب	ینجیکا، ارباب، زمین اونچی لہٰذا لوگ شیطان اور دیہہ مرزا میں کاشتکاری کرتے ہیں۔
فقیر، خمر	کروت خار، خمر، سوداگر، دکاندار اور مسگر
پُردل خان، سربندی	سربندی۔ جاگیر
ابراہیم آباد کے تحت	نُوری اور پری
حیدر علی خان، ناروئی	غزمہ، ناہروئی (عسکری بلوچی)
علی اکبر ارباب عسکری	میر اور ارباب
سردار سید خان، نواب	ناروئی، کریم دادزئی (بلوچ)
صداقی کے تحت	شہریاری (غلزئی)
سید حاجی	سید (غوری کے تحت) اور میر کھنڈر، شاہرتی
شریف آباد کے تحت	غزمہ
مرزا حیدر، قائنی	کُول
گرگ علی، گرگ	گرگ

	دیہہ حاجی	-	۱۵	۱۱۰	-
	دیہہ خان نمبر ایک	۳	-	۱۸	۸
۵۵	" " نمبر دو	۳½	۱	۴۲	-
	دیہہ خضری	۳	۱	۲۶	۹
	" کاکڑ	۱	-	۹	-
	" کرتی	۴	-	۲۱	-
	" خالقداد	۸	۶	۸۴	۳۲
۶۰	" کُول، جنوب مغربی	۱۵	-	۹۰	۳۵
	" " شمال مشرقی	۱۱	۲	۱۰۰	-
	" خان محمد	۴	-	۲۸	-
	" کُنڈل	۳	-	۳۰	-
	" ابراہیم	۲	۱	۱۶	-
۶۵	" پیران	۵	۲	۶۴	-
	" پُڈنا	۳	-	۱۸	-
	" مشہدی سارنگ	۲	-	۲۲	-
	" نوُ	۲	-	۱۰	-
	" مرزا	۳	-	۱۸	۵
	" نواب خان	۹	۳	۸۰	-
	" جعفری	۱	۱	۱۴	۶

علی اکبر، سراونی	سراونی، دہ مردا
محمد، کاخا	راہدار، غذہ
سعد اللہ، میر شکار	زُور، میر شکار
چلنگ کے تحت	خضری، میر شکار
خواجہ احمد " "	زروازئی (افغان ؟) کاکڑ
بُنجبار " "	اُرماگئی (خُرماگئی ؟)
سید علی	
تاج محمد کُول	کُول (نصرت آباد کے جنوب مغرب میں)
محمد مہدی، کاکا	کُول، اوقاتی
تاج محمد کُول	جلال آباد کے تحت
خواجہ احمد کے تحت	رخشانی، کاشانی، گورگیج
پُردل خان، سربندی	سربندی
محمد مہدی، کاخا	زُوری، بلیدہ، کامہ اور اُلاصُوفی
پُردل خان، سربندی	پُدنا
امیردہ باشی، جورتیغ	شیخ
محمد حیدر، سیاہ سر	سیاہ سر
تاج محمد کُول	مرزا
نواب خان، گورگیج	گورگیج، شاہرستانی، راشکی
غلام صدّاقی	شہریاری، سنادگل

	دیوانہ (۱)	۴	۱	۳۲	۹
	دیہہ رسول	۲	-	۱۲	۴
	" شیخ (۱)	۳	-	۱۸	۹
۷۵	دیوانہ (۲)	۳	۱	۲۶	۶
	دیہہ شیخ (۲)	۲	۱	۲۲	-
	" سیاہ سر (۱)	۳	۱	۲۶	۹
	" " " (۲)	۳	۱	۳۰	-
	فتح اللہ	۵	-	۳۰	۸
۸۰	غوری (۱)	۱۲	۵	۱۰۲	۵۶
	" (۲)	-	۱۷	۱۰۲	-
	گزبار	۹	۳	۷۵	-
	غلام علی	۴	۱	۵۲	-
	غلام خان	۳	-	۴۶	-
۸۵	حمزہ آباد	۳	-	۱۸	۶
	حسین آبادی	۴	۱	۳۰	۹
	حسین عبداللہ	۱	-	۱۶	-
	حسین آباد پلیلی	۶	۲	۴۸	۲۸
	حسین آباد (شہر)	۴۰	۱۴	۵۰۰	-

محمد، کاخا	دیوانہ اور سرمدی (بلوچ)
غلام، شہریاری	رسول زئی (بلوچ یا براہوئی)
فقیر، خمر	شیخ
غلام حیدر رجالزئی	دیوانہ
داؤدی کے تحت	خمر، شیخ دلیسی
غلام شہباز، خمر	" ، سیاہ سر
احمد خان، نوتانی	ملا شاہی، پری
محمد حیدر، خراٹ	سیاہ سر، سرگازی
امیردہ باشی، جوتنغ	جوتنغ اور سید
سید حاجی	"
علی مراد، بندھانی	دہ مردا، شیخ دلیسی، بندھانی
میر مرتضیٰ، عرب	عرب، دلآرامی
شریف آباد کے تحت	گورگیج، عیدوزئی (مامسینی)
سہ کوہا کے تحت	وہی سہ کوہا والے
واصلان کے تحت	وہی واصلان والے
سعد اللہ، میرشکار	میرشکار
مرادی، پلیلی	پلیلی، سرونی
محمد مہدی کاخا اور محمد حیدر خراٹ	خراٹ، کاخا، سیاہ سر، سرگازی، ہتلہ (جاٹ؟)

۹۰	حُسَینہ	۷	-	۶۶	-
	حسین رئیس	۳	-	۲۶	-
	حسن جعفر	۳	۱	۲۶	۷
	حسین باقر	۱½	-	۱۹	-
	حسین خان	-	۲	۱۳	-
۹۵	حسین مشہدی	۳	-	۲۶	-
	حسین محمد	۲	-	۲۰	-
	ابراہیم آباد	۸	۱	۵۴	۴۰
	ابراہیم کچال	۱	۱	۱۴	-
	اسماعیل، خمرؒ	۷	۳	۶۶	۱۸
۱۰۰	ابراہیم محمدی	۲	-	۱۸	-
	عیسیٰ	۶	-	۷۲	-
	اِسکل	-	۲۵	۲۰۵	-
	عزّت	۲	-	۱۴	-
	جبّار (۱)	۵	۱	۳۳	-
۱۰۵	جہانگیر (۱)	۴	۱	۲۴	-
	جنائی (۲)	۵	۴	۱۱۶	-
	جلائی	۷	-	۴۲	۱۰
	جلال آباد	-	-	۸	-

حُسَینہ، سرحدی بلوچ	زَور، سَرحدی
پُردل خان سربندی	غذہ
غلام مسکر تمر آبادی	راہدار
محمد کاخا	شہر یاری، راہدار
سید خان ناہروئی	زرد ازئی (افغان ؟)
سعداللہ، میرشکار	میرشکار، راہدار
ناظر والی کوہ دیاگیا	گوریج
سَیف علی سَربندی	نُوری اور پری
چلنگ کے ماتحت	بڑیچی (افغان)
علی شہر یاری	راہدار، شہر یاری
حاجی دان، قائنی	محمدی
محمد اکرم، ساکزئی افغان	راز، پُنجیکا
میر امیر	گلوی جاٹ، ٹھاکر، پَنجیکا، میر
سردار صیاد خان، نواب	گوریج، اللہ داؤ
میر امیر	سنادگل، زَوری
"	پَنجیکا، آہنگر
امیر جہانگیر، بامیری	بامیری (بلوچ)، دلآرامی
محمد علی، سیاہ سَر	کرَدت خار، الاری، جوتیغ، سیاہ سَر
-	کریم گشتہ، حیدری زَوری

	جمال آباد	۸	۲	۶۴	۱۶
۱۱۰	جوتغ	-	۴	۲۴	۸
	جُوبخش	-	۸	۴۸	۳۰
	جُتان	۱	-	۵	-
	جُزنیک	۲۱	۱۵	۲۱۶	۸۰
	قلعه باز (قند)				
۱۱۵	(مشموله به تندورک)	۹	۲	۶۶	-
	قلعه کهنه	۳۰	۱۰	۲۴۰	۷۰
	قلعه نو	۲۵	۸	۳۰۰	-
	قلعه نو (نو و کهنه)	۱۳	۲	۱۹۰	-
	خدنگ (نو و کهنه)	۱۴	۱	۱۳۰	-
۱۲۰	خامک	۱۲	۵	۱۰۲	۴۵
	خمرّ (فراری)	۱۰	۱	۶۸	۱۸
	کچیان	۱۷	۱	۲۶۰	-
	خواجه احمد	۵	۴	۸۰	-
	خداداد	۱	-	۱۲	۲
۱۲۵	کنگ	۸	۱	۵۴	۲۰
	کوشا (شیب)	۱۴	۶	۱۲۰	۸۰
	کوشا (بالا)	۸	۲	۶۰	۴۵

علی اکبر، گلوی	راہدار، گلوی
محمد مہدی جوتغ	سیاہ سر، جوتغ
ناظر والئی سیستان	غدہ، شہریاری، میرشکار
بازی کے تحت	بازی
تاج محمد کُرل	رامرودی (رئیس) شاہرق، کُرل
علی مراد سیاہ سر	سیاہ سر اور بلوچ
سید علی	
سید محمد	
محمد مہدی کاخا	گز براور بولائی کی طرف۔ سناوگُل، کاخا، پنجبیکا۔
سلطان میر حسین، عرب	عرب، بارُونی، پری، سفید خاکی
مہدی خان، قزاق	سیاہ سر، شاہرقی، کُرل، پری
مُرادی، خمرّ	شیخ دلیسی، خمرّ
درویش خان، کیانی	سرگازی، دلآرامی
سید خان نواب، سردار	ناہروئی، راشکی
میر جعفر خان سربندی	شہریاری، تلرّ، سربندی
جزنیک کے تحت	باوری، خلیل
میر جعفر سربندی	شہریاری، تلرّ، سربندی
شیر محمد خان، شبزئی	سرگازی، غلزئی

	پکولک	۵	-	۳۰	-
	کربلائے حسین	۳	-	۱۸	۵
۱۳۰	کربلائی	۴	-	۲۴	۸
	کرباسک	۴	۲	۳۶	۵
	کرامی	۳	-	۱۸	۶
	قاسم آباد	۱۲	۵	۱۸۰	-
	کلوخی	۴	-	۳۰	-
۱۳۵	کُرد	۱۰	۷	۱۷۵	-
	کلب علی	۴	۲	۵۸	-
	کمک	۱۱	۱	۲۰۰	۶۰
	کربلائے اصغر	۶	۲	۵۴	-
	گفتارگی	۴	۱	۳۴	-
۱۴۰	کمالی	۱۰	۱	۶۸	۲۲
	لالُو	-	-	-	-
	لُپ	۶	۴	۴۸	۲۲
	لَنک	۷	۲	۵۶	۳۴
	لطف اللہ	۷	۱	۱۸	-
۱۴۵	ملک حیدری	۲	۷	۷۲	-
	منصوری	۵	۲	۸۴	-

قلعہ کہنہ کے تحت

حاجی محمد علی، سیاہ سر	سیاہ سر
میر بیگ، سربندی	سربندی، کریم کشتہ
شیخ رضا، کاخا	سیاہ سر، کاخا
علی، شہر یاری	شہر یاری
میر قاسم	ملاّ، میر، پنجیکا
جہانگیر خان مرادقلی	مُرادقلی
میر بیگ، خمر	پٹی پشم (جاٹ ؟) شیخ نوری، پری
جان محمد، پٹی پشم	کلب علی، پٹی پشم
محمد جان خان، قزاق	
میر قاسم	بیلر، مُرادقلی
نور محمد، شیخ حسینی	شیخ حسینی (بلوچ)، فارسی دان
مہدی، بندھانی	جُر کمالی، بندھانی
	بے آباد
داؤدی کے تحت	شاہداد، خمر، کروٹ خار
پُردل خان، سربندی	پری، خلیل، سیاہ سر
حسینہ (دیہہ) کے تحت	سرحدی، زور
میر شیر، میر	شیخ نوری، میر، جوتغ
مرادی، پلپلی	راہدار، پُدنا، زوری

	مرزا غلام	۱۰	۳	۷۵	-
	محمد آباد	۱۶	-	۹۶	۴۴
۱۵۰	محمد اعظم	۴	۱	۵۲	۱۱
	محمد دادی	۲	-	۱۸	-
	محمد خان	۵	۱	۵۰	-
	محمد سفر	۱۰	۲	۸۰	-
	محمد شاہ اکرم	۵	۱	۱۰۷	-
۱۵۵	ملّا عبداللہ	۳	-	۳۲	-
	ملّا علی	۸	۲	۷۰	-
	ملّا رشید	۲	-	۲۰	-
	ملّا رستم	-	۱	۸	-
	محمد اکرم	-	-	۲۲	-
۱۶۰	نے گرد	۳	-	۵۰	-
	نصیر آباد، خوجہ	۱۰	۲	۷۶	۲۵
	نصیر آباد، سید	۵	۲	۴۲	۱۴
	نیاز بیگ	۷	-	۵۲	-
	نور محمد کوہی	۳	-	۲۷	-
۱۶۵	نوبہار	۴	-	۳۵	-
	نور محمد	۱	-	۱۰	-

مرزا اُرہ، اوقاتی	اوقاتی، سلیمانی
میر درویش، سیّد	سرگازی، نوری، پری
محمد عظیم، میر شکار	گلوی (جاٹ)
میر قاسم، میر	جورتغ
محمد خان، شیخ حسین	شیخ حسین، غزمہ، گورگیج (بلوچ)
محمد امیر خان جمالزئی	جمالزئی (بلوچ) غدہ
شریف آباد کے تحت	عسکری، غزمہ، ناہروئی (بلوچ)
ملا عبداللہ شیخ	ملا، شیخ، سنادگل
غلام ملا علی	گلوی (جاٹ؟) سنادگل
ملا رشید کاشانی	کاشانی، عیدوزئی (بلوچ)
ملا رستم دلآرامی	دلآرامی
محمد اکرم، ساکزئی افغان	ساکزئی
درویش، زَور	زَور، میرشکار
خوجہ، پُدنا	پُدنا، دُرنی
میر محمد، سیّد	سیاہ سر، سنجرلی
میر شیر، میر	جورتغ، کُرد، مراد قلی
شریف آباد کے تحت	رخشانی، بلوچ
غلام علی، آہنگر	شاہرتی، آہنگر
نور محمد، قائنی	نصرت آباد کا معرب

	نواب	۴	۲	۶۴	-
	پیرداد	-	۱	۴۰	-
	پلکی (نشیب)	۷	۱	۵۰	۱۱
۱۷۰	پلکی (بالا)	۸	-	۴۸	۱۶
	کپشت دشت	۶	۲	۵۲	۲۲
	راہدار	۱۲	۱	۸۶	-
	رستانی	۳	۱	۵۰	-
	صداقی	۶	۲	۵۲	۳۲
۱۷۵	شہریاری	۴	۱	۳۶	-
	شمس آباد	۶	-	۶	-
	شاہرستان	۷	-	۹۴	-
	شاہرخ	۱	-	۱۲	-
	شاہیان	۳	-	۱۴	-
۱۸۰	شریف آباد	۱۲	۵	۲۶۰	-
	شاہ گل	۲	۱	۳۴	-
	شاہرق	۵	۱	۸۰	-
	سفر	۲	-	۱۴	-
	سعداللہ	۲	۱	۱۲	-
۱۸۵	سہ قلعہ	۵	۲	۵۴	-

داد، جاٹ	جاٹ (براج)
نوابخان، گوریج	ایک پاگو کاشتکار، باقی گندار
سید علی	شاہرقی
〃 〃	-
محمد غلام علی خان	کاخا، پلپلی
حمزہ، راہدار	راہدار، کمالی
آغا جان، دہ باشی	سیخولی، دہ باشی
غلام، شہریاری	شہریاری، غلزئی افغان
حاجی دامن، قائنی، پیشکار	شہریاری، راہدار
علی آباد کے تحت	
اکبر خان، گوریج	کیال (جاٹ؟) راشکی، دہ مُردا
چاکنگ کے تحت	میر شکار وغیرہ
محمد حیدر، خرّاط	ملّا شاہی
حیدر علی، ناہروئی	سادگل، غزمہ (بلوچ) میر شکار اور پٹی لشم
شریف آباد کے تحت	بڑیچی (افغان)
جزنیک کے تحت	شاہرقی، رامرودی وغیرہ
پشت دشت کے تحت	کاخا، پلپلی
مُرادی، پلپلی	پلپلی
عباس جہانگیر، بامری	مراد قلی، بامری

	بسہ کوہا	۱۴	۶	۱۳۲	۸۰
	سیاہ خان	۲	-	۳۰	-
	سیاہ مرد	۲	-	۷	-
	سیخولی	۹	۳	۷۸	۲۴
۱۹۰	شیر دل یا زنیل	۴	-	۲۴	۸
	صُوفی	۳	-	۳۵	-
	سلیمان	۱	-	۲۰	-
	سوختہ	۱۰	۴	۸۴	۱۸
	شیطان	۴	۲	۴۵	-
۱۹۵	صفدر	۴	۱	۳۲	۶
	تقی	۵	۱	۳۸	۶
	تاغازی	۸	۲	۶۴	۲۰
	تاج محمد نُوری	-	۵	۳۰	-
	تلّہ	۳	۱	۳۶	-
۲۰۰	تلُفک	۳	-	۲۵	-
	طُوطی	۱۵	۵	۲۱۰	-
	تمرآباد	۱۰	۲	۶۸	۲۸
	واصلان	۲۰	۱۰	۱۸۰	۴۰
	ورمال	۲۰	۵	۱۶۰	۷۲

پُردل خان، سربندی	سیاہ سر، خلیل
سیاہ خان، ناہروئی	کاشانی اور ناہروئی
سیاہ مرد، سرحدی (بلوچ)	سرحدی (بلوچ)
سیّد رضا	سپخولی، نوری
شیر دل، سرحدی	راہدار، سرحدی، بلوچ
محمد امین، جمالزئی	صُرفی
سلیمان، ناہروئی	ناہروئی (بلوچی)
سیّد علی	-
میر جعفری، سربندی	ارباب، خاراکزئی
محمد حیدر، خرآط	میر
محمد طوطی، کاخا	کاخا، تقی
محمد مہدی، کاخا	کاخا، سرگازی
جز نیک کے تحت	گُول، شاہرقی، رامرودی
پُردل خان، سربندی	تکرہ
درویش، خمّر	باروتی، خمّر
محمد، کاخا	کاخا، راہدار، زَور
غلام، مسگر	کروت خار، راہدار، قلوک
جہانگیر خان	پری، قزاق، شاہرقی، سیاہو وغیرہ
محمد غلام علی، کاخا	کاخا، جاٹ، شاہرقی

۲۰۵	یار محمد	۴	۲	۳۶	۵
	زاہدان	۳	۲	۶۵	-
	زنیل دادی	۳	۱	۲۶	-
	زنیل قاسم	۱	۱	۱۴	۶
	زیارت گاہ	۲	-	۱۲	۴
۲۱۰	ذوالفقاری	۳	-	۱۸	۴
	زبردست خان	۱	-	۱۳	-
	زمان خان	۱	-	۲۰	-
	زیارت بی بی دوست	-	۳	۳۰	-
		غنی	تحویل	کاشتکار	غیر کاشتکار
	کل میزان	۱۲۳۴	۴۴۴½	۱۳,۷۸۷	۱,۸۳۵

شیخ رضا، سیاہ سر	سیاہ سر
محمد شریف خان، نوتانی	پنجیکا، نوتانی
اسماعیل خمرؔ کے تحت	راہدار، میر شکار
سید داؤد، سید	یازی
میر مہدی، قزاق	جوزتغ

زبردست خان گوریگیج	گوریگیج
نواب خان، گوریگیج	گوریگیج، شاہرستانی
میر قاسم گوریگیج	اوقاف زیارت

میاں

نمبر	گاؤں کے نام	حلقہ	پاگو: نمی	تحویل	ٹکگر	خاندان: کاشتکار	غیر کاشتکار
	عباس جعفر	مُلگی	۱	-	۱	۱۸	-
	عباس رامرودی	بُرج میرگل	۹	-	۴	۹۲	-
	آغاجان	سیادک	۱	-	۱	۱۱	-
	اخوند	"	۲	۱	-	۲۵	-
۵	اکبر جُہار	دیہہ دوست محمد	۱/۲	-	۱	۱۳	-
	عَلیان	جہان آباد	۱	-	-	۱۲	-
	اللہ داد	بے آباد					
	علی	جہان آباد	۱	-	۳	۱۸	-
	علی خان	دیہہ دوست محمد	۱	۱	۲	۲۰	-
۱۰	علی عیسیٰ (رِچ)	" " "	۱	-	-	۷	-
	علی جان	جہان آباد	۳	-	۲	۳۲	-
	علی جنگی	بے آباد					
	علی مردان	نور محمد	۱	-	۲	۱۶	۶
	امیر	دیہہ دوست محمد	۱	-	۲	۱۶	-
۱۵	امیر گرگین	جہان آباد	۲	-	۱	۲۵	۸
	امیر شاہ گُل	سیادک	۲	۱	۲	۷۲	-
	اصغر	"	۱	-	-	۹	-

کنگی

کدخدا	قبائل
عباس جعفر، کروت خار	کروت خر اور سراونی (سرونی ؟)
شیر دل، سرونی	پُدنا اور رامرودی (رئیس)
آغا جان، شاہرقی	شاہرقی اور گلباچہ (بلوچ ؟)
محمد حسن، پہلوان	پہلوان (فارسی دان)
اکبر سُہار، سیاہک	جو تیغ، سیاہک
علیان، باجے زئی	باجے زئی (بلوچ ؟)
کدخدائے جہان آباد	
یوسف اسلام، بڑتیچ	عرب اور غزمہ (فارسی دان)
دیہہ دوست محمد کے تحت	سارونی، محمد زئی (بڑتیچ ؟) اور دہ مردا رخشانی
علی جان، خمرّ	خمرّ اور شاہرقی (فارسی دان)
نور محمد، سرونی	کاشانی، زہروزئی (بلوچ)
دیہہ دوست محمد کے تحت	میر شکار اور خوگاری (بلوچ ؟)
امیر، گرگین	دہ مردا
امیر، غلزئی	غلزئی (افغان) صیاد اور سارونی
اصغر، سنادگل	سنادگل (فارسی دان)

	عطا محمد	سیارک	۱	-	۲	۱۹	-
	آزاد	دیہہ دوست محمد	۱	-	۳	۱۲	-
۲۰	اُزرو	جہان آباد	۱	-	۱	۸	-
	بُرج میرگُل	بُرج میرگُل	۴۰	۸	۴۰	۲۵۰	۱۹
	بُنی (۱)	〃	۵	-	۲	۶۶	۲
	بُزی (۲)	〃	بے آباد				
	چکّل (کریم کشتہ)	〃	۲	۱	-	۳۲	-
۲۵	چارِی	جہان آباد	۲	-	۳	۱۱	-
	دیہہ دوست محمد	-	۱۴	۱۲	۱۰	۹۷۶	۲۰
	دولت آباد (معہ شیخ)	-	۶	۱	۲	۹۴	۲۰
	دلیسی - قدیم)					۱۶+	۳
	درویش محمد	پدائی	۱	۱	۱	۲۸	-
۳۰	فقیرا	جہان آباد	۵	۱	۱	۶۵	-
	فقیر	دیہہ دوست محمد	۱	-	۱	۱۰	۵
	فقیران	بُرج میرگُل	۳	-	۱	۳۵	۳
	فقیر محمد	دیہہ دوست محمد	-	۲	-	۲۶	-
	فقیرا	〃	۱	-	۲	۲۲	-
۳۵	گجر	پُلگی	۱	-	۲	۱۳	-
	غزمہ	جہان آباد	۳	-	۲	۱۶	-
	غزمہ بُرجی	پوکاک	۱	۱	-	۳۸	-

عطا، بہادی	بہادی (بامری بلوچ)، سیاہ سر (فارسی دان)
آزاد، دہری دہ زری	دہ زاری (بلوچ ؟)
ازرو، نوتانی	نوتانی (بلوچ)
شیر دل سرونی	سرونی، ارجنی (جاٹ؟) بوزی، گرگ (فارسی دان)
"	بُرزی (فارسی دان)

"	کریم کُشتہ (فارسی دان)
جان محمد سنجولی	چاری (فارسی دان)
دوست محمد سرونی	شولہ کندو اور دیہہ مختار، آبادی بسید مخلوط
تاج محمد کُرل	۸ کیانی گھرانے اور باقی کُرل اور پُدنا (فارسی دان)۔ شیخ دلیسی کوئی سوگز دُور، کُرل اور شیخ دلیسی (فارسی دان)
کدخدائے خطامت	شیخ اور سراونی
جان محمد فقیرا	دہ مردا، فقیرا (فارسی دان) میش مست (جاٹ ؟)
دیہہ دوست محمد کے تحت	سرونی
بُرج میر گُل کے تحت	فقیرانی (فارسی دان)
دیہہ دوست محمد کے تحت	پُدنا (فارسی دان)
مشہدی علی	فقیرا (فارسی دان)
پلگی کے تحت	بوری (بلوچ یا جاٹ ؟)
غلام شاہ جوتغ	جوتغ اور عزمہ (فارسی دان)
سادات علی آباد	زَوری (جاٹ) اور مرادقلی (فارسی دان)

نمبر	نام	مقام					
	عزمہ زنیل	پرکاک	۲	-	۱	۲۴	-
	گنگو زار	-		بے آباد			
۴۰	غلام دادی (دشتی)	جہان آباد	۳	-	۴	۲۴	-
	گلزار اکم	نور محمد	۲	-	۲	۱۹	۲
	گرگری	گرگری	۸	-	۶	۸۵	-
	غلام خان (۱)	سیادک	-	۱	-	۱۶	-
	غلام خان (۲)	دیہہ دوست محمد	۱	۱	۱	۱۱	۵
۴۵	گل بیگ	جہان آباد	۱	۱	۱	۲۰	-
	گل شاہ	دیہہ دوست محمد	۱	-	۲	۱۸	-
	گل محمد	پدائی	۱	-	۱	۲۰	-
	حاجی	حاجی	۱۰	۲	۴	۱۰۴	-
	حاجی خمر (۱)	دیہہ دوست محمد	۱۰	۲	۳	۸۰	۵
۵۰	" " (۲)			بے آباد			
	حاجی کریم	خاک	۲	-	-	۳۰	-
	حسن حسین	جہان آباد	۱	۱	۱	۱۳	-
	حسن ابراہیم	سیادک	۲	۳	۳	۲۴	-
	حسین دلاور	"	۱	-	-	۱۶	۳
۵۵	حسین رحمان			بے آباد			
	حاجی	دیہہ دوست محمد	۱	-	-	۴۰	-

سید علی ؟	غزمہ (فارسی دان)
غلام وادی دشتی	بزی، جوتغ اور غزمہ (فارسی دان)
نور محمد (ٹھیکہ دار)	رخشانی (بلوچ) اور سرونی
آغا خان سربندی	سیاہ سر، بزی، جوتغ اور سربندی (فارسی دان)
شاہ گل شاہرقی	شاہرقی، عطیہ بہ شمس الدین شاہرقی
دیہہ دوست محمد	دوست محمد سرونی کی زوجہ کی جائداد
گل بیگ سپرزئی	سپرزئی (سفرزئی) اور سرحدی (بلوچ)
گل شاہ ناہروئی	ناہروئی (بلوچ)، شیرزئی (بلوچ) الاداؤ (فارسی دان)
گل محمد شیخ	شیخ (جاٹ ؟) المعروف بہ فارسی دان
علی اکبر بنجاری	شیخ (جاٹ ؟) موسومہ بہ فارسی دان
حاجی خمرؔ	ناہروئی، شیرزئی (بلوچ) الاداؤ
حاجی کریم، علی احمد	علی احمد (فارسی دان) مشمولہ بہ ۱۷ یا ۱۸ اگنودار خاندان
حسن، غزمہ	دوسرا نام نثار احمد ہے۔ غزمہ (فارسی دان)
حسن، خاشی	خاشی (فارسی دان)
حسین دلاور، جوتغ	جوتغ (فارسی دان)، گل بچہ (بلوچ)
حاجی خمرؔ	سرونی، چیت بند (فارسی دان ؟)

	حسین علی خان	سیادک	۱	-	۱	۲۰	-
	ابراہیم محمدی	گرگری	۱	-	۳	۱۴	-
	ابراہیم فقیر	دیہہ دوست محمد	۱	۱	۲	۹	-
۶۰	عیدو (۱)	سیادک	۱	-	۳	۲۲	-
	عیدو (۲)	جہان آباد	۱	-	-	۸	-
	عیسیٰ خان	سیادک	-	-	۴	۹	-
	ابراہیم	دیہہ دوست محمد	۱	-	۳	۱۸	۱۳
	عیسیٰ لجتی	سیادک	۱	-	-	۸	-
۶۵	جہان آباد	جہان آباد	۸	۵	۱۰	۱۲۵	-
	〃 (قدیم)	بے آباد					
	جہانگیر خان	سیادک	۲	-	۳	۱۲	-
	جنگی خان	〃	۱	-	۱	۱۴	-
	جان بیگ	پوکاک	۴	-	۱	۳۵	۷
۷۰	جان محمد	بے آباد					
	جمالدین	سیادک	۳	-	-	۲۲	-
	جُمّاں	دیہہ دوست محمد	۱	-	۷	۲۵	-
	جُمّاں زنیل موسیٰ	〃	۳	-	۲	۳۵	-
	جُمّاں گل	شیخ ویسی	۳	-	۲	۲۴	-

حسین علی خان	معتبر خرّم، لوگ خرّم (فارسی دان)
گرگری کے تحت	بازئی، جوتیغ (فارسی دان)
ابراہیم فقیر	معتبر سرونی، لوگ مورائی (بلوچ ؟)
سیاوک کے تحت	رخشانی (بلوچ)
عیدو، قُطخیل	قُطخیل، گُنذار بھی ہیں
عیسیٰ خان پہلوان	پہلوان (فارسی دان)
ابراہیم بُراق زئی	رخشانی اور بُراق زئی (بلوچ ؟)
عیسیٰ لجبّی	لجبّی (جاغی کے پاس سے - تاجیک ؟)
علی اکبر اوقاتی	عرب، خمّر (اوقاتی فارسی دان)، ارجن (جاٹ ؟)

جہانگیر، ریکی	خیاری (فارسی دان) ریکی (بلوچ)
جنگی خان، سیاہک	شاہرقی، سیاہک (فارسی دان)
جان بیگ، پہلوان	پہلوان (فارسی دان)، سیّد علی

جمالدین غلام کدگ	غلام کدگ (؟)
جمعہ خان	سرغلزئی (فارسی دان)، زہروزئی (بلوچ)
زین الموسیٰ	شیرزئی (بلوچ ؟)
میر درویش، شیخ ویسی	میرشکار، کردت خار (فارسی دان)

نمبر	نام	مقام					
۷۵	کوز	بے آباد					
	کامخان	سیاوک	۱	—	۱	۱۱	-
	خانسوری (۱)	پلگی	۱	-	۱	۱۸	-
	" (۲)	برج میرگل	۱	-	-	۹	-
	خامک	دولت آباد	۱۰	۱۱	۵	۲۰۰	-
۸۰	کربلائے گلزار	سیاوک	-	-	-	۱۱	-
	کرم	دولت آباد	۱	-	۲	۱۴	-
	کریم کشتہ	دیہہ دوست محمد	۷	۱	۲	۸۴	-
	کڑی	بے آباد					
	قتامک	پدائی	۵	-	۲	۲۸	۴
۸۵	کنڈل (۱)	بنجار	۲	۱	۱	۳۴	-
	" (۲)	جہان آباد	۱	-	۲	۱۳	-
	قربان علی (ریگ بازار)	"	۱	-	۲	۱۱	-
	کوکی	خامک	۳	۱	-	۴۰	-
	للّہ	سیاوک	۲	-	۳	۲۲	-
۹۰	لشکران (۱)	"	۱	-	۲	۱۲	۳
	" (۲)	پدائی	۱	-	۲	۱۳	-
	لچ بمعہ محمد کریمداد	دیہہ دوست محمد	-	-	-	۴	۲۳
	دہپلوان ۲		-	-	-	۳	۸
			۲	-	-	۲۲	-

کام خان	کریمداد زئی (بلوچ)
ٹیکگی کے تحت	خان سُوری (فارسی وان)
بُرج میرگُل کے تحت	"
میر علی اکبر	تاج محمد گُول کا نائب۔ گُول اور خمر (فارسی وان)
کربلائی گلزار	۵-۱۹۰۴ میں تشکیل ہوئی برائے کاشت
دولت آباد کے تحت	شیر زئی، کریمداد زئی (بلوچ ؟)
دیہہ دوست محمد کے تحت	کریم کشتہ، ارابیب (فارسی وان)

در محمد سرونی	گرگ (فارسی وان)، سرونی
حاجی علی اکبر (بُنجار)	جرُ، کروت خار
کندل (رودینی)	رودینی (بلوچ)
قربان علی، سپرزئی	شاہرقی (فارسی وان)، سپرزئی (سفرزئی۔ بلوچ ؟)
موسیٰ عالم، ناہروئی	ناہروئی (بلوچ) فارسی وان نامعلوم
للّٰہ، ملک زئی	ملک زئی (؟) شیخ حسین (بلوچ)
لشکر خان	رودینی (بلوچ)
پدائی کے تحت	میر شکار (فارسی وان)، سرونی
دیہہ دوست محمد کے تحت	میر شکار (فارسی وان)، سرونی، پہلوان (فارسی وان)، محلگی (جاٹ ؟)

	لطفی	جہان آباد	۱	-	۱	۹	-
	ملکی	ملکی	۲	۱	-	۱۳	-
۹۵	مردان	شیخ ولیسی	۲	-	۳	۱۲	-
	مارگو (۱)	پلگی	۲	-	۲	۲۰	-
	〃 (۲)	〃	۲	۱	-	۳۰	۶
	ملک	بے آباد					
	میران (ملا عبداللہ)	دیہہ دوست محمد	۳	۱	-	۲۸	۵
۱۰۰	مرزا خان	جہان آباد	۴	-	۱	۳۹	-
	محمد عبداللہ	〃	۱	-	۲	۱۴	-
	محمد (دیہہ)	پلگی	۱	-	۱	۱۶	۱
	محمد رضا	دیہہ دوست محمد	۱	-	۳	۱۴	۳
	محمد قاسم	جہان آباد	۱	۱	-	۲۰	-
۱۰۵	محمد سکندر	دیہہ دوست محمد	۱	-	۴	۱۸	۴
	محمد جنگی	بے آباد					
	ملا حسین	ملا حسین	۲	۱	۲	۱۵	۱۶
	〃 حاجی	〃	۶	۲	۶	۵۰	-
	ملا در محمد	نور محمد	۱	-	-	۸	-
۱۱۰	مختار	شیخ ولیسی	۲	-	-	۱۴	-
	مرادی	بے آباد					

لطفی، دہ مردا	دہ مردا (فارسی دان)
عبداللہ جمالزئی	جمالزئی (بلوچ ؟)، پہلوان (فارسی دان)
ابراہیم، شیخ ویسی	کاخا، شیخ ویسی (فارسی دان)
پلنگی کے تحت	سرگازی (فارسی دان)، ارجنی (جاٹ)
"	سنادگل، دلآرامی (فارسی دان)

دیہہ دوست محمد کے تحت	شیخ (فارسی دان)
مرزا خان، مُرادقلی	مُرادقلی، بُرزی (فارسی دان)
عبداللہ، کریم کُشتہ	کریم کُشتہ (فارسی دان)
محمد، گرگ	گرگ (فارسی دان)
محمد رضا، ساسولی	ککگی (جاٹ)، ساسولی (بلوچ یا براہوئی)
جہان آباد کے تحت	سنادگل، محمد قاسم (فارسی دان)
محمد سکندر، رودینی	رودینی اور ریکی (بلوچ)

غلام سراونی	کاخا، بُرزی (فارسی دان)، سروِنی
ملا حسین، کاخا	کروت خار، میرشکار
نور محمد	سروِنی
ابراہیم، شیخ ویسی	گلری، اُلاداد (فارسی دان، جاٹ)

	مُری	گرگری	۱	-	۲	۸	-
	منصور خان	سیاوک	۱	-	-	۱۵	-
	محمد خان قلندر	-	۲	-	۲	۱۵	-
۱۱۵	محراب (دیہہ)	بے آباد					
	میر بیگ	میر بیگ	۳	۲	۱	۳	-
	نجف	برج میر گل	۱	-	۱	۹	-
	نوروز	پُلگی	۲	۱	-	۹	-
	نور محمد (۱)	دیہہ دوست محمد	۱	-	۲	۱۲	-
۱۲۰	نور محمد (۲)	نور محمد	۹	-	۳	۸۴	۴
	نیک محمد	سیاوک	۱	-	-	۹	-
	پدائی	پدائی	۹	۳	۵	۱۱۵	-
	پہلوان (۱)	پُلگی	۲	۱	۱	۳۳	-
	پسند خان	سیادک	۲	-	۱	۲۲	-
۱۲۵	پیران	پدائی	۱۰	۴	۳	۹۶	۴
	پُدنا	دیہہ دوست محمد	۳	۳	۴	۶۲	-
	پلگی	پلگی	۱۰	۵	۶	۱۳۰	۱۵
	رحیم داد	دیہہ دوست محمد	۲	۶	۲	۵۶	-
	رسول خان	جہان آباد	۱	۱	۱	۱۸	-

گرگری کے تحت	اوقاتی (فارسی وان)
منصور خان	خروتی پل زئی (افغان)
محمد خان، قلندر	رخشانی (بلوچ)

غفار، قائنی	صیاد، خمر، تحویل میر غفار قائنی
برج میر گل کے تحت	خانسوری (فارسی وان)
نوروز، غلزئی	غلزئی اور فرح کے دیگر افغان
نور محمد، محکگی	محکگی (جاٹ؟)
نور محمد، سرونی	شیخ (فارسی وان)، محمودی (؟)، سرونی
نیک محمد، عیسیٰ زئی	عیسیٰ زئی (بلوچ؟)
در محمد، سرونی	صیاد، عزمہ، بُزی (فارسی وان) سرونی
پلگی کے تحت	پہلوان (فارسی وان)
پسند خان، محکگی	محکگی (جاٹ؟)
در محمد سرونی اور عباس پُدنا	پُدنا (جاٹ)، سرونی۔ ہر ایک کی دو تحویل
امیر سرونی	پُدنا (فارسی)، سرونی
محمد شریف سرونی	کُرتی، شاہرتی، شیخ نور، شیخ (فارسی وان) سرونی
رحیم داد، سرونی	سفرزئی (بلوچ) ارجنی (جاٹ؟)، سرونی
رسول خان بلیہ	بلیہ (جاٹ؟)

۱۳۰	رستم	سیاہک	۱	-	۱	۱۱	۱
	سفر مراد	〃	۲	-	-	۲۷	-
	سپرزئی	جہان آباد	۳	-	۲	۲۸	-
	سفر (دیہہ)	دولتاباد	۱	-	۳	۱۶	-
	صیاد	سیاہک	۱۱	-	۶	۱۱۲	-
۱۳۵	سیاہک	〃	۹	۵	۱۰	۱۰۵	-
	سید علی شاہ	〃	۱	-	۲	۱۴	-
	سکندر (دیہہ)	برج میرگل	۲	۱	-	۲۴	-
	شہاب خان	بے آباد					
	صاحب خان (۱)	دیہہ دوست محمد	۱	-	-	۸	-
۱۴۰	〃 (۲)	سیاہک	۳	-	-	۳۲	-
	شاہ دوست	دیہہ دوست محمد	۱	۱	۱	۲۰	-
	شاہ دوست عالم	〃	۲	-	۱	۹	-
	شاہ گل	برج میرگل	-	۲	۲	۲۰	۲۵
	شاہرخ	جہان آباد	۱	-	۱	۹	-
۱۴۵	شمس الدین	سیاہک	۱۱	-	۳	۱۲۴	-
	سرگازی	〃	۲	۱	-	۲۶	-
	شاہ مراد	-	۲	-	۲	۱۸	-
	شاہرقی (دیہہ)	پُگی	۶	۱	۳	۷۸	-

آہن، دہ مردا	کریم کشتہ (فارسی دان)، دہ مردا
سفر مراد	ولی داد زئی (؟)
نور محمد، سپرزئی	سپرزئی (بلوچ ؟)
دولت آباد کے تحت	سناوگل، صیّاد (فارسی دان)
جانی، صیّاد	صیّاد (فارسی دان)
خان جہان خان	سنجرانی، رخشانی (بلوچ)، دہ مردا
سید علی شاہ	خاشی (فارسی دان)
برج میر گل کے تحت	پہلوان (فارسی دان)

صاحب خان، ناہروئی	ناہروئی (بلوچ)
صاحب خان	پہلوان (فارسی دان)
شاہ دوست، دوری	دوری (زمینداور کے ؟)، سرونی
شاہ دوست عالم	سرونی، دہ مردا
شاہ گل، مرادقلی	شیرزئی (بلوچ ؟)، مرادقلی (فارسی دان)
شاہرخ، شاہرقی	مرادقلی، شاہرقی (فارسی دان)
شمس الدین خان	سنجرانی، پہلوان، میر (فارسی دان)
علی اکبر، سرگازی	سرگازی (؟) ارجنی (جاٹ ؟)
شاہ مراد	عالم خیل (؟)، گلوی (جاٹ ؟)
مردان، شاہرقی	شاہرقی، بُزی (فارسی دان)

	شریف (۱)	دولت آباد	۱	-	۱	۱۰	-
۱۵۰	″ (۲)	بے آباد					
	سرونی (۱)	جہان آباد	۱	-	۲	۲۲	-
	″ (۲)	دیہہ دوست محمد	۲	-	۳	۱۸	-
	سنادگل	بے آباد					
	شیخ ویس	شیخ ویسی	۷	۲	-	۸۷	۴
۱۵۵	شیخ (دیہہ)	بے آباد					
	شیر محمد (۱)	ٹلگی	۱	-	۱	۱۹	-
	سنگو (۱)	علی اکبر بنجاری	۱	-	۲	۱۸	-
	سنگو (۲)	بے آباد					
	سہراب (۱)	دیہہ دوست محمد	۱	-	۲	۱۵	-
۱۶۰	″ (۲)	سیادک	۱	-	۱	۱۲	-
	سرخ (دیہہ)	بے آباد					
	شاہسوار	دولت آباد	۲	-	-	۲۰	۴
	شیر محمد (۲)	برج افغان	۱	-	۲	۱۵	-
	سرفراز خان	″	۱	-	۲	۲۰	۲
	صداقی	خاک	۱	-	۱	۱۸	-
	تاج محمد (۱)	دیہہ دوست محمد	۳	۱	-	۷۰	-

شریف دازدری	دازدری (فارسی دان)
حسین محمد، شیخ	شیخ (فارسی دان)، سرونی
غلام، سرونی	سرونی
ابراہیم، شیخ ولیی	شیخ ولیی، گنوُداروں کے ۴ گھرانے
شیر محمد، گشادزئی	گشادزئی (سرحدے، بلوچ)
عالم، کرّی	کرّی (فارسی دان)
سہراب خان	اجباری (بلوچ، مامائینی ؟)
کریمداد، میاندادزئی	سپرزئی (بلوچ ؟) میاندادزئی (؟)
شاہسوار	میرشکار، بزی (فارسی دان)
شیر محمد، سنجولی	سنجولی (فارسی دان) ارجنی (جاٹ)
سرفراز خان شاہرتی	پہلوان اور شاہرتی (فارسی دان)
تاج محمد، سرونی	سرونی
دیہہ دوست محمد کے تحت	سرگازی (فارسی دان)، سرونی

	تاج محمد (۲)	″	۱	-	۲	۱۱	-
	طاؤس	″	ـــــــ بے آباد ـــــــ				
	یار محمد (۱)	سیادک	۸	-	۹	۹۲	-
۱۷۰	″ (۲)	جہان آباد	۱	-	-	۸	-
	یوسف (۱)		ـــــــ بے آباد ـــــــ				
	″ (۲)	جہان آباد	۱	-	-	۸	-
	ولی (دیہہ)	دولت آباد	۲	-	۱	۲۰	-
	میزان میاں کنگی :		۴۱۰½	۱۰۵	۳۲۲	۵,۵۴۱	۲۳۲
	+ شاہرستان :		۱,۲۳۴	۴۴۴½	-	۱۳,۷۸۷	۱,۸۳۵
	(تحویل پاگو میں کلگرشامل ہیں)						
	میزان کُل ایرانی علاقہ :		۱۶۴۴½	۵۴۹½	۳۲۲	۱۹,۳۲۸	۲,۰۶۷

۱۹۴ پورے پاگوں کا زیر کاشت رقبہ (تقریباً) : ۱۵۳,۵۸۰ ایکڑ

۳۲۲ کلگروں ″ ″ ″ : ۵,۰۰۰ ایکڑ

کُل رقبہ زیر کاشت ۵-۱۹۰۴ : ۱۵۸,۵۸۰ ایکڑ

: ۲۴۷۰۸ مربع میل

تاج محمد ساسولی	ساسولی، زخشانی (بلوچ)
یار محمد، دازوری	دازوری، موسے زئی (بلوچ)، صیاد
یار محمد، دہ مردا	دہ مردا
یوسف، رودینی	رودینی (بلوچ)
دولت آباد کے تحت	اَلاداؤ (جاٹ)

ضمیمہ نمبر ایک

(ب)

سیستان کے اضلاع گنگ وچکانسر کی آبادی کا خلاصہ

افغان علاقہ

۱۹۰۴ - ۵

ضلع گنگ میں خاندانوں کی آبادی کا خلاصہ

(۱) افغان قبائل

نام قبیلہ	کاشت کار	غیر کاشت کار
برک زئی	۲۰	-
اچکزئی	۵۶	-
اسحاقزئی (سکزی)	۲۶۵	-
نورزئی	۹۶	-
دہ باشی (؟)	۱۵	-
بڑیچ	۴۰	۱۵
علی زئی	۳۱۹	۲۵
غلزئی	۴۲۵	۲۰
خگاری	۳۴	-
ترین	۴۳۵	-
بابی	۱۳۰	-
فراحی	۴۰	-
سادات	۱۸۸	۹
میزان	۲,۰۶۳	۶۹

دیگر قبائل

دہ مردا	-	۵۱۵
محلکی	۳۵	-
سنجرانی	-	-
سپرزئی	-	۲۵۸
سرگازی	-	۱۵
گل بچہ	-	۶۵
رخشانی	۴۲۷	۱۰۴
سمالزئی	-	۱۰
شیرزئی	۲۶۵	-
زہروزئی	۵۰	۱۰
سیدزئی	۸۰	-
کاشانی	۲۰۴	۲۱
سرونی	-	۲۱۹
موسیٰ زئی	-	۲۶
بدوزئی	-	۲۰
نوتانی	۶۶	۱۲۵
بیلہ	-	۱۳
سربندی	۲۲۵	-

رودینی	-	۲۲
اجباری	۳۴	-
اسحاقزئی	-	۵
قطخیل	-	۱۸
کُنده	-	۱۰
کرائی	-	۱۵
آبیل	۹۶	۳۱۵
ریکی	۳۵	۱۹
یامری	۶۰	-
میزان :	۱,۵۷۷	۱,۸۰۵
کل میزان ضلع کنگ :	۳,۶۴۰	۱,۸۷۴

پاگوں کی ملکیت :

افغان	عمی	۱۷۳	تحویل	۸۳
بلوچ	عمی	۳۵	تحویل	۳۶
فارسی دان	عمی	۹۱	"	۳۵
سادات	"	۱۵	"	۸
میزان :		۳۱۴		۱۶۲

ضلع چکانسر میں خاندانوں کی آبادی کا خلاصہ

نام قبیلہ	کاشت کار	غیر کاشت کار
کاشانی	۱۸۸	۱۳۹
توتانی	۱۹۴	۱۰۶
تاجیک	۶۰۸	-
کلب علی	۵۵	۶۱۸
دہ مردا	۱۷۰	۳۴۸
دلخفتی	۴	۱,۳۱۸
آبیل	۹۴	۲۲۶
محکگی	۱۲۰	۱۰
ناہروئی	۴۲	۷۸
زخشانی	۵۸	۳۰
رئیسانی	-	۴۰
گورگیج	۶۰	۴
موسیٰ زئی	۷۶	-
ریکی	۸۰	-
عیسیٰ زئی	۶۶	۹۰
برٹیچ	۱۰	-
اجباری	۱۰	۷۶

گلاب زئی	۲۰	۲۰
گوڑھ	۱۰	-
گدُخیل	۲۴	-
سارونی	۲۰	-
زہروزئی	۷۰	-
براہوئی	۱۰	-
بلوچ	۱۲	-
شبوزئی	۱۲	-
کُندہ	۵۷	-
کریمدادزئی	۵۵	۱۵
اُزبکزئی	۱۴۰	-
ملک زئی	۳۰	-
شیخ ولیسی	۱۲	-
سالاڑی	۲۱	-
لجتی	۴۰	۳۲
گل بچہ	۱۲	-
میزان :	۲,۳۸۰	۳,۱۵۰

کُل میزان :

ضلع چکانسر :	۲۳۸۰	۳۱۵۰
ضلع کنگ :	۳۶۴۰	۱۸۷۴
کُل میزان افغان علاقہ :	۶,۰۲۰	۵,۰۲۴

چکانسر ضلع کے پاگر :

غمی	۲۵۴	تحویل ۱۱۹
+ ضلع کنگ کے غمی	۴۱۴	تحویل ۱۶۲
میزان :	۶۶۸	۲۸۱

زیرِ کاشت رقبہ (تقریباً) : ۶۶,۴۳۰ ایکڑ

: ۱۰۸,۶ مربع میل

(۱۹۰۴-۵)

ضمیمۂ دوّم

بلوچ اور براہوی

ضمیمۂ دوئم

بلوچ اور براہوی

گذشتہ ابواب میں اصطلاحات بلوچ اور براہوی اتنی کثرت سے استعمال ہوئی ہیں کہ اس معمّہ کو حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے کہ بلوچ اور براہوی کیا ہیں ؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا قطعی جواب نہیں دیا جاسکتا اس لئے کہ دونو اصطلاحیں مرور زمان کے ساتھ اپنی وہ نسلیاتی معنویت کھو چکی ہیں جو ابتدا میں ان اصطلاحات کے ساتھ وابستہ ہوئی۔

بہتر ہوگا کہ پہلے بلوچ پر غور کر لیں کیونکہ بلوچوں کے متعلق (بلوچستان میں) عام طور پہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ براہوئیوں سے پہلے وارد ہوئے۔ اس کا ذکر بھی مفید ہوگا کہ بلوچستان گزیٹیر سیریز کی جلدات اور "بلوچ نسل" میں اس پہ کیا نتائج اخذ کئے گئے ہیں کیونکہ ان دونو کے مصنّفین نے موضوع کا بہت محنت سے مطالعہ کیا ہے لیکن اس سے بھی پہلے یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ اُن تواریخ نے اس موضوع پہ کیا روشنی ڈالی ہے جو ان قبائل کے اصلی وطن بلکہ اوطان و ممالک کے متعلق ہیں۔

بلوچ قبائل کی زبان بلوچی کہلاتی ہے اسے تکنیکی لحاظ سے ہند و اور پائی السنہ کے آریہ زمرہ کی ایرانی شاخ سے منسلک قرار دیا جاتا ہے۔ اسے محض ان قبائل کے بولنے کی وجہ سے بلوچی کہا گیا ہے۔ ورنہ اسے یہ نام دے کر کسی قدیم زبان سے ممیز کرنا غالباً غلط ہوگا۔ بلوچی کو سیستان کی فارسی دان آبادی بھی بولتی اور سمجھتی ہے اور ایک محتاط تحقیق غالباً یہ ثابت کر دے کہ موجودہ ایران کے اکثر قبائل

اسے بولتے اور سمجھتے ہیں۔ بلوچی قدیم ایرانی خاندانوں کی دُور دراز تک پھیلی ہوئی سلطنت کا اثر باقیہ ہے جن کا اختیار و اقتدار سنِ عیسوی کے آغاز سے پہلے اور بعد بہت وسیع خطۂ ارض پر مستولی تھا۔ اس زبان کی مغربی حد نامعلوم ہے لیکن اس کی مشرقی حد دریائے سندھ کا طاس ہے جو اس طرف قدیم ایرانی سلطنتوں کی سرحد تھا۔ بلوچی بولنے والے قبائل اس زبان کو وادیٔ سندھ اور پنجاب میں بھی لے گئے ہیں جہاں وہ منتقل ہوئے۔ یہاں بلوچی مقامی زبانوں (جیسے جدگالی اور سندھی) سے کچھ اس طرح خلط ملط ہوئی کہ کیچ اور مکران کے باشندوں کے لئے ناقابلِ فہم بن گئی جو صحیح قدیم بولی بولتے ہیں[1]۔

یہ حقیقت کہ تمام بلوچ جو خلط ملط مشرقی یا خالص مغربی بولی بولتے اور سمجھتے ہیں۔ بجائے خود اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ وہ ایرانی ماخذ کے ہیں۔

بلوچ بہت قدیم ایام سے سلطنت ایران کے طول و عرض میں گھوڑسوار اور راعیانہ قبائل کی حیثیت سے جانے پہچانے ہیں اور ان کی آبادی جوار بھاٹا کا منظر پیش کرتی رہی ہے۔ فردوسی

---

[1] چند سال پہلے میٹرکولیشن سرٹیفکیٹ لینے والوں کیلئے مشرقی اور مسخ شدہ بلوچی کا مطالعہ لازمی تھا۔ اور کامیاب ہونے پر انہیں انعام ملتا تھا۔ اُن دنوں خالص مغربی بولی بولنے والے کو ممتحن بلوچی فہم نہ سمجھتے تھے۔ مغربی بلوچستانی کیلئے مشرقی بولی کو سمجھنا کتنا مشکل تھا اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ۱۸۹۱ میں بگٹی گورکھا دستہ کے کمانڈنگ افسر نے مصنف سے پنجگوری سردار سے ملاقات کا انتظام کرنے کی فرمائش کی۔ افسر مذکور کراچی میں بلوچی کے بورڈ آف اگزامینرز کا صدر رہا تھا۔ اس موقعہ پر افسر مذکور نے سردار محمد علی خان گچکی کے سامنے سرحد سندھ پر بولی جانے والی بلوچی میں نہایت اعلیٰ قسم کی تقریر کی۔ گچکی سردار مصنف کی طرف مڑا اور دست بستہ سرگوشی کی: "صاحب! کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ آنجناب مجھ سے کیا فرما رہے ہیں"؟ اور مصنف کو کیپٹن کی پوری تقریر کا مغربی بولی میں ترجمہ کرنا پڑا۔

نے اپنی عظیم رزمیہ شاہنامہ میں بلوچوں کو عساکر خسروان میں کوچ و بلوچ کے لقب میں شامل کیا۔
جس کا مطلب یہ تھا کہ گیارھویں صدی عیسوی میں ایک ایسی روایت موجود تھی جو قدیم بھی
سمجھی جاتی تھی اور ایک تاریخی حقیقت کی حامل بھی۔ اس عظیم رزمیہ کے ماخذ اب تو صرف جزوی
طور پر معلوم ہیں لیکن اغلب ہے کہ فردوسی کے دور میں وہ سب موجود تھے اور اس نے ان
سے استفادہ کیا۔ مزید براں فردوسی نے مسلّمہ اور رائج الوقت روایات کو قلمبند کیا جو
تیرھویں صدی کے اوائل کے ہلاکت بار منگول حملوں کے وقت ختم ہو گئیں۔

بلوچ قبائل کی تنظیم ہمیشہ سے وہی رہی ہے جو کلاسیکی مصنّفین نے سیتھی قبائل کی بیان
کی ہے جو مغربی ایشیا کے بیشتر حصے پر چھا گئے تھے بلکہ مشرقی یوروپ کو بھی اپنے شکنجہ میں لے
آئے تھے۔ اب یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ قبائل آریہ یا مشرقی ایرانی نسل کا بیرونی اور کم مہذب
غول تھے لہٰذا موجودہ بلوچ اس قدیم غول کا حصّہ ہیں اور یہ رشتہ ڈیرہ غازیخان اور ڈیرہ
اسماعیل خان کے بعض منتخب نمونوں کی بشری پیمائش سے واشگاف ہو جاتا ہے۔ ایم اجفلوی نے
۶۰ تراجیک کے کاسۂ ہائے سر کا مذکورہ بلوچوں سے مقابلہ کیا تو ایک حیرت انگیز مناسبت و
مشابہت پائی گئی۔ دونو کا زیادہ سے زیادہ انڈکس ۹۵ یا ۹۶ تھا۔ بلوچوں کا نیزل انڈکس
۶۸۰۸ پایا گیا۔ لہٰذا جہاں تک سر کی شکل کا تعلق ہے بلوچوں کو طویل الراس ایرانیوں میں
شمار کرنا ہوگا نہ کہ صغیر الراس اعراب یا ہندوستانیوں میں[1]۔

بلوچ قبیلے کی تشکیل اس انداز کی مظہر ہے جس سے یہ خانہ بدوش قبائل نامعلوم قرون سے
دیگر نسل پاروں کو اپنے میں جذب کرتے رہے ہیں۔
"بلوچ قبیلے کی تنظیم براہوئی تنظیم سے ملتی جلتی ہے[2]۔

---

[1] "دی بلوچ ریس" ایشیاٹک سوسائٹی مانوگراف، جلد چہارم از لانگورتھ ڈیمز، لندن
۱۹۰۴، ص ص ۱۱ ر ۱۲۔
[2] بلوچستان گزٹیر سیریز جلد ششم الف، ص ۳۲۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک براہوئی قبیلہ افغان قبیلہ کی مانند رشتۂ خون پر منحصر نہیں بلکہ مشترکہ سُکھ اور دُکھ پر مبنی ہے گویا دوسرے لفظوں میں یہ اُن ذمّہ داریوں سے عبارت ہے جو انتقام اور ہم نسلی کی بجائے کثیر النّسلی سے عاید ہوتی ہیں۔ ایک مرکزہ کے گرد مختلف الماخذ گروہ مشمولہ بہ افغان، جاٹ اور آزاد شدہ غلام تک ہنگامی ضروریات کے تحت جمع ہوئے اور ایک قبیلے کی شکل میں مستحکم ہوگئے۔ قبیلے میں نوواردوں کے داخلہ پر کوئی پابندی نہ تھی۔ جونہی ایک فرد اس میں داخل ہوا وہ دائمی طور پر اس کے دُکھ سُکھ میں شریک ہوگیا۔ پھر اپنا جوہر دکھانے کے بعد اُسے قبائلی زمین کا ایک ٹکڑا دیکر قبائلی فلاح و بہبود میں شریک کرلیا گیا جس کے بدلے اُس پر قبائلی ذمّہ داریاں عاید ہوگئیں۔ پھر اس شرکت پر باہمی رشتوں ناطوں سے مہر تصدیق ثبت کر دی جاتی تھی[۱]۔"

مرور زمان کے ساتھ ساتھ جبریّت حالات کے تحت اپنے اصلی قبائل سے ٹوٹنے والے افراد یا خاندان، کُرد، لوُر، تُرک، جاٹ، عرب (اور شاید منگول بھی) اور تاجیک ان خانہ بدوش بلوچ قبائل میں شریک ہونے گئے جو ایک خاص علاقہ میں متمکّن تھے یا ان کے آس پاس ہی خیمہ گزیں یا صحرانورد تھے اور تھوڑے ہی عرصہ بعد یہ نووارد اس کُل کا جزو سمجھے جانے لگے۔ بلوچ کا شروع میں کوئی بھی نسلی مفہوم ہو لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ زائل ہوگیا۔ اور لفظ بلوچ مخلوط النّسل خانہ بدوشوں پر منطبق کر دیا گیا۔

کوچ و بلوچ یعنی خانہ بدوشوں کی اصطلاح بہت عرصے سے رائج ہے۔ فردوسی نے اس سے ایران کی تغیّر پذیر آبادی مراد لی ہے۔ دسویں صدی عیسوی میں صوبہ کرمان (نوشیرواں کی موت کے ۶۵ سال بعد فتح کیا گیا) کی آبادی کُردوں، بلوچوں، جاٹوں اور قُفص قبائل پر مشتمل تھی۔ جاٹ عنصر بہت جلد اپنے امتیازی خصائص چھوڑ کر ایک طرف زرعی آبادی میں جذب

---

[۱] ایضاً جلد ششم ب، ص ص ۷۱، ۷۲۔

ہو گیا۔ اور دُوسری طرف ممکنہ طور پر کوچ و بلوچ میں ضم ہو گیا لیکن کُرد اور قُفص باہمی طور پر بھی الگ رہے اور زرعی آبادی سے بھی۔ محمدؒ ابراہیم نے کرمان کے سلجوقی حکمرانوں کی تاریخ میں اس واقع کو خوب واضح کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ دونو قبائل صوبہ کرمان کے مخصوص حصّوں میں متمکّن تھے۔[1]

قفص کے پاس وہ علاقہ تھا جو جُرفت کے جنوب سے شروع ہو کر مکرانات پر پھیل کر ساحل سمندر تک جاتا تھا۔ وہ وحشی لوگ تھے اور شمال میں خراسان تک اور مغرب میں فارس تک تاخت و تاراج کرتے تھے۔ کثیر التعداد اور جنگجو ہونے کی وجہ سے وہ کرمان کے دیالمہ کے قابو نہ آئے تھے اور درفرید اور سرپزاں کی گھاٹیوں میں معین الدین ابوالخیر دیلمی کو شکست دیدی تھی اور اس کا ایک ہاتھ بھی جاتا رہا تھا۔

ملک کاورد سلجوقی نے حصول کرمان (۱۰۴۵ء کے قریب) کے بعد مذکورہ درّوں اور بحیرۂ عمان کے درمیان کا علاقہ ان لوگوں کو دے کر انہیں مطمئن کیا۔ لیکن جب کرمان کے پہاڑی اضلاع کے وسائل اس کے پیرو کاروں کی ضروریات پوری نہ کر سکے تو اُس نے قفص کو مغلوب کرنے کا منصوبہ بنایا جو اس وقت بارجان کے پہاڑی علاقہ میں مقیم تھے۔ ایک تقریب شادی پر اُن کے سردار اور ان کے پیرو جرفت میں جمع تھے کہ ملک نے ان پر اچانک حملہ کر کے ان تمام کو مار دیا، اور ان کا ایک بچّہ بھی زندہ نہ چھوڑا اور یوں کاورد سلجوقی نے گرم سیر یا کرمان کے زیریں اضلاع پر قبضہ کر لیا۔ اس تاریخ میں قفص کا مزید

---

[1] سلاجقۂ کرمان کی تاریخ" از محمدؒ ابراہیم مطبوعہ ایم تھامس ہاؤسمہ، لیڈن، ای جے۔ برل ۱۸۸۶ء۔
گو محمدؒ ابراہیم نے سترھویں صدی میں لکھا۔ تاہم اُس نے افضل کرمانی کی تاریخ سے استفادہ کیا جو بارھویں صدی کے اواخر میں لکھی گئی جب ملک دینار، غز سردار نے کرمان پر قبضہ کر لیا تھا۔

ذکر نہیں ملتا۔[1]

اس کے بعد صرف کوچ و بلوچ کا ذکر ملتا ہے۔ ص ۱۵۴ پر انہیں کاتب کی غلطی سے کوچ و بلوچ کی بجائے کرج و بلوچ کہا گیا ہے۔ یہ کرمان کے گرم سیر میں تھے۔ قلعہ راسُو خان ان کے قبضے میں تھا۔ کرمان کا غز حکمران (ملک دینار) انہیں زیر کرنے کے بعد منُو جان کی طرف بڑھا۔ کوچ و بلوچ کا آئندہ ذکر ہرمز کے حکمران کے اتحادیوں کے طور پر آتا ہے۔ وہ ملک کے شمالی حصہ (جُرفت کے قریب) میں مقیم بتلائے جاتے ہیں جہاں وہ کاورد شاہ سلجوقی کے دَور میں متمکن تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوچ و بلوچ میں کسی قدیم دَور کے منتشر کردہ قفص بھی شامل ہوں اور جب غزوں نے اس صُوبے کو تہ و بالا کر دیا تو اغلب ہے کہ کُرد، عرب، جاٹ اور تاجیک نسل پارے بھی اپنے مدارج سے گر کر اور دفاعی تقاضوں کے تحت ان خانہ بدوش قبائل یعنی کوچ و بلوچ میں آملے ہوں جو اپنی مخصوص قبائلی تنظیم اور زُود حرکت انداز زندگی کی بدولت غز فاتحین کے خلاف اپنا تحفّظ کر سکتے تھے یا ان سے پہلو بچا سکتے تھے۔

غز حملے منگولوں کے زیادہ وحشت ناک حملوں سے کچھ ہی عرصہ قبل ہوئے اور بلوچ (جو اُس وقت تک ایک نسلی ملغوبہ بن چکے تھے) مزید مشرق کی طرف اضلاع میں منتقل ہونے لگے یعنی لاشار، مگس، سِب، سوران، وِنگ، بامپُور کے گرد ڈومبک اور مغربی اضلاع کیچ و بلیدہ وغیرہ۔ یہاں سے وہ کچھ عرصہ بعد سندھ میں ہجرت کر گئے لیکن یہ حقیقت کہ یہ قبائل اپنے قدیم نام اب کھو چکے تھے اور انہی اضلاع سے منسوب ہو گئے تھے جہاں وہ اب قابض تھے، اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ایک نسلی ملغوبہ تھے جسے کسی ایک مشترکہ نسل سے منسوب نہیں کیا جا سکتا تھا اور جو محض خانہ بدوش یا صحرانورد یا جہاں گرد یعنی ان علاقوں کے کوچ و بلوچ

---

[1] ممکن ہے کہ ضلع بُشکرد کے موجودہ باشندے اور ضلع رفنجان کے خفبائی انہی کی اولاد ہوں۔

کہلانے لگے تھے۔

صُوبہ کرمان کے مشرقی ترین علاقہ یعنی سرحد میں غز عنصر آج بھی موجود ہے جہاں کے موجودہ یار احمدزئی، گمشادزئی وغیرہ (جو آج کل دامنی یا سرحدی قبائل کہلاتے ہیں) یقیناً غزوں کی اولاد ہیں اور انہی لاقانونی، قزّاقانہ اور حریفانہ جبلّتوں اور اسی پست سطح تہذیب کا مظاہرہ کرتے ہیں جو ان کے غز آباؤاجداد کا خاصہ تھیں۔ ۱۸۸۹ میں مَیں دزک میں تھا تو مجھے اہل خراش نے بتایا کہ سرحدی سب کے سب غز تھے۔ رئیس جو کسی وقت سرحد میں ایک بہت زبردست قبیلہ تھے جس کے باقیات کیچ اور سیستان میں آج بھی موجود ہیں اور جن میں آج بھی جسمانی ساخت کے کئی ایرانی خصائص برقرار ہیں، اپنے کو غز بھی کہتے ہیں اور رئیس بھی۔ دامنی اور ناہروئی (جو عرب ہونے اور بغداد کے قریب نہروان سے ماخوذ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں) بھی بلوچوں میں شمار ہوتے ہیں[1]۔

بلوچوں کے منظوم قصّوں میں شام اور ترک جنگ آزماؤں کی طرف اشارات اس بات کے مظہر ہیں کہ بلوچ قبائل کا کچھ حصّہ لازماً عرب خوارج، شیعانِ علیؓ، یزید بن مہلّب کی باقیماندہ فوج (جو ۲۴ اگست ۷۲۰ء کو اپنے سالار کی موت پر ساحل کرمان کی طرف بھاگ گئی تھی) اور بعد میں غز نوواردوں[2] سے ماخوذ ہے۔

بلوچوں کا رند قبیلہ جو بعد میں ہندوستان چلا گیا تھا شاید خوارج کی اولاد تھا۔ لیکن پنجگور اور جلک میں مجھے اس لفظ کی ایک اور وجہِ تسمیہ معلوم ہوئی۔ جن بلوچ قبائل کو اپنے ترک

---

[1] کرمان میں غزوں کو اتابک فارس سعد بن زنگی نے دبایا لیکن وہ موجودہ دامنی قبائل کی طرح لوٹ مار کرتے رہے۔ حتیٰ کہ ایک خوارزمی فوج نے زوزان کے ملک رضی الدّین کے تحت کرمان پر قبضہ کر لیا اور چند ہی سال بعد منگولوں نے اسے دبوچ لیا۔

[2] دیکھئے ص ص ۷، ۸ "قلات" از جی۔ پی۔ ٹیٹ، کلکتہ، ۱۸۹۶ء

آقاؤں کے ظلم وستم کی وجہ سے زمینیں چھوڑنی پڑیں، وہی اصل رند تھے جنہیں بلوچی میں رِندگنتھا کہتے ہیں۔ جلاک اور ماشکیل کے ریگی انہی تارک الزمین بلوچوں میں شامل تھے لہٰذا وہ اپنے آپ کو رند شمار کرتے ہیں۔ گویا رند[1] کی محض ایک سیاسی اہمیت تھی۔

تُرک ستمگار غز، خوارزمی لشکر، منگول، تیمور کے جانشین یا قراقونیلو ترکمان ہو سکتے ہیں جنہوں نے پندرھویں صدی کے وسط سے سولھویں صدی کے اوائل تک کرمان پر قبضہ جمائے رکھا۔ بلوچوں کا سندھ میں ورود ان کی اپنی روایات کے مُطابق جام نظام الدین سمّہ کی زندگی میں ہوا جو ۲۹، نومبر ۱۴۶۱ء کو جام سنجر کا جانشین بنا۔ اور ۹۹-۱۴۹۸ء میں کسی وقت فوت ہُوا۔

لیکن بلوچ صوبہ کرمان تک ہی محدود نہ تھے بلکہ خراسان میں کافی علاقے پر پھیلے ہوئے تھے۔ روضتہ الجنّت فی الاوصاف مدینتہ الہرات کے مصنّف کے مُطابق وہ تیرھویں چودھویں صدی میں ہرات کے شمال میں بادغیس کی طرف آبادی کا ایک کثیر التعداد اور خانہ بدوش حصّہ تھے۔ اَب بھی افغانستان کے ضلع زمینداور کی آبادی میں بلوچ ایک غیر اہم عنصر نہیں ہیں۔ ضلع خاش میں ۵-۱۹۰۴ میں بلوچوں اور براہوئیوں کی تعداد کچھ کم نہ تھی۔ ان کا کچھ حصّہ رضاعی اور شستاوا کے دیہات میں آباد تھا جہاں کرائی اور بلوچ (اوزبکزئی) دونو رہتے تھے۔ کرائیاں رضاعی کا معتبر شاہ نذر خان تھا اور شستاوا کے اوزبکزئیوں کا معتبر کوئی اکبر نامی شخص تھا۔ ۵-۱۹۰۴ کے خاش کے مالدار، راعیانہ قبائل میں مندرجہ ذیل گروہ شامل تھے:-

---

[1] "رنود داد باش" بمعنی فتنہ انگیز و راندہ قانون فارسی کی ایک مشہور ترکیب ہے۔ رند یا رنڈ بد نام ہندوستانی لفظ رُنڈی (ایک راندۂ معاشرہ عورت، طوائف) کا مادہ ہے، نیز دیکھئے 'قلات' کلکتہ ۱۸۹۶۔ لفظ رند صرف 'مصالحت گریز' کے معنی دیتا ہے اور اس کی کوئی نسلی معنویت نہیں۔

بہرام زئی براہوئی (۱۰۶ خاندان) شاہکزئی (۳۷ خاندان) کرانی براہوی (۱۸۵ خاندان) لوارزئی (۴۵ خاندان) اسحاق زئی (۷۴ خاندان) اور رُنک بلوچ (۳۷ خاندان) گویا کل ۹۵۵، انفوس تھے۔

کہا جاتا تھا کہ مذکورہ براہوی قبائل اصل میں ماماسینی قبیلے کے حصے تھے جن کا صدر مقام پنجگور کے جنوب مشرق میں جیسبری کے مقام پر ہے۔

اعنیع خاش میں براہوئی قبائل کو براہوکی کہا جاتا ہے۔

بلوچوں کا ماخذ متعین ہو سکتا ہے لیکن براہوئی" ایک عقدہ لاینحل ہے — وہ بلاشک وشبہ اپنے موجودہ وطن میں نسبتاً بعد میں وارد ہوئے لیکن اُن کی زبان کو ڈاکٹر گریرسن نے دراوڑی السنہ میں سے ایک بتایا ہے۔

براہوئی میانہ قد، چوڑا چکلا اور قوی ہوتا ہے جس کا چہرہ تیکھا، رخساروں کی ہڈیاں اُبھرواں اور آنکھیں لمبی اور تنگ ہوتی ہیں۔ اُس کا ناک پتلا اور نوکدار ہے۔ اس کا انداز بے تکلف اور کشادہ ہے۔ اگرچہ وہ چُست، جفاکش اور زمین نورد ہے تاہم وہ جنگ آزما کی حیثیت سے بلوچ کا ہم پلّہ نہیں ہو سکتا۔ البتّہ وہ ایک اچّھا سکاؤٹ ہے۔ چند مستثنیات کو چھوڑ کر براہوئی خسیس، بخیل، حریص اور پرلے درجے کا کاہل ہے۔ وہ لوٹ مار کرتا ہے، لیکن چوٹا نہیں، انتقام جُو ہے لیکن دھوکے باز نہیں اور عموماً مذہبی تعصّب سے مبرّا ہے۔ اُس کی انتہائی جہالت ملک بھر میں ضرب المثل ہے: "اگر تم نے کبھی جاہل بھوت اور پہاڑی چھلاوے نہیں دیکھے تو آؤ براہوئی کو دیکھ لو!"

اُن کا دعویٰ ہے کہ "وہ سیستان سے آئے" اور اُن کا پست تہذیبی معیار اُنہیں غز قبائل کے باقیات ہونے کی طرف ایک واضح اشارہ ہے جو وسط ایشیا سے اخراج کے بعد

---

[1] بلوچستان گزٹیئر سیریز جلد ششم ب، ص ۱۰۲۔

افغانستان و کرمان میں پھیل گئے تھے۔ صوبہ کرمان میں غز تاخت و تاراج کے بیان کے لئے محمد ابراہیم کی تاریخ سلاجقہ کے آخری حصّہ کا ترجمہ ضروری ہوگا۔ کرمان کو تہ و بالا کر دیا گیا اور زرعی آبادی اُن کے استحصال سے تنگ آکر زمین چھوڑ گئی اور ہمسایہ ممالک میں بھاگ گئی جن پر ان وحشیوں کا زور نہ چلتا تھا۔

موجودہ اکثر نام نہاد براہوئی، قبائل دیگر مشہور اور قدیم ماخذات کے ہیں مثلاً ماما سینی لُور ہیں (بلوچستان میں محمد حسنی کہلاتے ہیں) میر واڑی عرب آباؤ اجداد کا دعوٰی کرتے ہیں جو عمان سے آئے یا وہ مختلف نسل یا پروں کا ملغوبہ ہیں جو خونی عداوت کی ذمّہ داریوں سے قبائل بن گئے۔ جھلاوان کے مینگل اس کی بیّن مثال ہیں۔ وہ مسلّمہ ایرانی، افغان اور جدگال (جاٹ) ماخذ کے لوگ ہیں۔ مردوئی کلفت جدگال ہیں جو ضلع کراچی کے تھانہ لُولاخان اور تونگ کے بیبرانی، حملانی اور لوہارانی جوام (موسومہ بہ نُرپا) کے مورث اعلیٰ، جام آری کے چوتھے بیٹے، جام بادین کی اولاد ہیں۔ جن قبائل کا ماخذ کسی مشہور و معروف نسل سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ اُنہیں شاید اصلی براہوئی مرکزہ یا ہیولے قرار دیا جاسکتا ہے جیسے جھلاوان میں زہری قبائل کا کچھ حصّہ اور سراوان میں رودینی۔ ریاست قلّات کے اس ڈویژن کے براہوئی قبائل[1] کو نہایت واضح طور پہ دیگر ماخذات سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا یہ کسی نسلی مفہوم میں براہوئی نہیں ہیں۔

لیکن اگر یہ اصطلاح محض سیاسی معنوں میں لی جائے یعنی اس سے مراد پہاڑی قبائل اور ان کے سرداروں کا اشتراک و ادغام ہو تو پھر لفظ براہوئی کا معنی مرد کوہستانی یا پہاڑ یا معقول معلوم ہوتا ہے۔ سندھ میں لفظ براہوئی عموماً قلات کے پہاڑی باشندوں کیلئے استعمال ہوتا ہے اور یہی غالباً اس لفظ یا نام کی ممکنہ تشریح ہو سکتا ہے۔

لیکن وہ لوگ جو مغرب کی طرف سے آنے کا دعوٰی رکھتے ہیں کس طرح ایک ایسی زبان بولنے لگے ہیں جو "دراوڑی السنہ کی ہم اصل" ہے۔ لیکن جس نے "نہایت بے تکلفی سے فارسی، بلوچی، سندھی اور دیگر ہمسایہ زبانوں کے بدیشی سرمایۂ الفاظ کو جذب کرلیا ہے لیکن

---

[1] دیکھئے فہرست قبائل در جلد ششم بلوچستان گزیٹیر سیریز و نیز در "ہندوستان کے لوگ" از سر ہربرٹ رسلی۔

اس کے در آنے کے باوجود اس کا نظام صرف و نحو قائم و دائم ہے[1]" ـــــ ایک ایسا سوال ہے جس کا کم از کم فی الحال کوئی حل ممکن نظر نہیں آتا۔

---

[1] بلوچستان گزٹیئر سیریز جلد ششم ص ۴۰۔ اگر ان نو واردوں نے یہ زبان اپنے موجودہ وطن میں سیکھی اور اپنائی تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے لیکن موضوع پر موجودہ معلومات کے پیش نظر اس میں بین سقم ہیں۔ براہوئی غالباً اسی معنی میں استعمال ہوا جس معنی میں رِند ہوتا تھا یعنی پہاڑی قبائل کا اتحاد و اشتراک برائے سیاسی مفادات و دفاع۔ براہوئی زبان کو کُرد گالی کہا جاتا ہے۔

نوٹ :-

سراوان کے براہوئی قبائل مندرجہ ذیل ہیں :-

(۱) رئیسانی (۲) شاہوانی (۳) بنگلزئی (۴) محمد شاہی (۵) سرپرہ (۶) کُرد (۷) لہڑی۔ (۸) لانگو (۹) دہوار ـ ان میں سے پہلے ماخذ ضلع سبی کے احمدون کے سپین ترین افغان ہیں، شاہوانی (دیکھئے حصہ چہارم باب سوم) بلوچ اور افغان ماخذ کے ہیں اور محمد شاہی بعض مقامی روایات کے مطابق قدیم ترین سراوانی ہیں جن کا مرکزہ محمد شاہ نامی مورث سے منسوب ہے۔ گو بعد میں دیگر بلوچ بھی ان سے آملے۔ سرپرہ کے لئے دیکھئے حصہ چہارم باب سوئم۔ کُرد ایرانی کُردوں کی شاخ ہیں۔ لہڑی ڈومبکی بلوچ ہیں جن سے دیگر بلوچ اور رندھی آملے ہیں۔ لانگو ہمیشہ ماتحت سمجھے گئے ہیں اور جاٹ ماخذ اور زراعت پیشہ ہیں۔ ملتان کے لنگاہ سے متعلق ہیں۔ دہوار تاجیک ہیں جن سے دیگر لوگ آملے ہیں۔ (بلوچستان گزٹیئر جلد ششم ص ۴۹) یہ قبائل صرف سیاسی لحاظ سے براہوئی ہیں نسلی لحاظ سے نہیں۔

(جی۔ پی۔ ٹی)

ضمیمہ سوم

تواجیک بخارا

ضمیمہ سوئم

تواجیک بخارا

"تواجیک وسط ایشیا کے تمام قصبوں کے اصلی باشندے ہیں۔ یہ فقرہ بخارا اور اسکی تواجیات پر لکھی جانیوالی تمام جغرافیائی کتب اور ان کے سفر ناموں میں موجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اس کا کچھ علم نہیں۔ جیسا کہ مذہب کے باب[1] میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ نہ صرف اغلب بلکہ ناقابل انکار ہے کہ تواجیک نے بخارا کے کچھ اور لوگوں کی جگہ لی ہے جو غالباً تاتار منگول تھے۔ اگر تواجیک مغرب کی طرف سے آئے ہیں یعنی خراسان کے اوپر سے تو انہوں نے تاتاریوں کو مشرق اور شمال مشرق، یعنی ماوراالنہر اور کوہ الطائی کی طرف دھکیل دیا ہے۔ اور یہیں سے تاتاری (اوزبک)

---

[1] "بخارا کی قدیم ترین آبادی سے عام طور پر ایرانی یعنی موجودہ تازیک مراد ہیں جن کے خالص ترین نمونے پامیر کی بخاری وادیوں میں نظر آتے ہیں۔ چینی ذرائع کے مطابق خیوا، بخارا اور ترکستان میں پہلے آریہ رہتے تھے اور تاتاری منگول نسل بعد میں وارد ہوئی۔ لیکن یہ حقیقت کہ تاتاری منگول لوگ (جو اب وسط ایشیا کے حکمران ہیں) اپنی آمد پر آریہ قبائل سے ملے، اس امکان کو رد نہیں کرسکتی کہ آریہ اپنی آمد پر یہاں قدیم ترین تاتاری باشندوں سے ملے جو تاتار منگول حملے سے مدتوں پہلے فاتح آریوں نے جذب کرلئے تھے۔ اور خود تہذیب کے مشل برادر بن بیٹھے تھے۔ آریوں کے پہلو بہ پہلو غیر آریہ آبادی بھی موجود تھی اور اوستا میں تو موخر الذکر کا کئی مقامات پر ذکر کیا گیا ہے۔ آریہ غیر آریہ ممالک سے زردشت کی مدد سے لڑے

دوبارہ نمودار ہوئے جب اُنہیں تاجیک سلطنت کے اندرونی اور بیرونی انتشار نے موزوں موقعہ فراہم کیا کیونکہ اسلام کی آمد سے بہت پہلے ساتویں صدی ہی میں ہی اوزبک اس علاقے پر قابض ہو چکے تھے اور وہ اب بھی قابض ہیں"۔

لیکن تاجیک بخارا کے قدیم ترین تاریخی زراعت کار ہیں جنہوں نے اس کی ثقافت کو متاثر کیا اور جو اب بھی ثانوی حیثیت کے باوجود اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ نخلستانوں کی

یعنی نسلوں کی جنگ ہوئی جس میں آریہ فتحیاب ہوئے لیکن اوستا اس جنگ کو بہت قدیم وقت سے منسوب کرتی ہے۔

"بخارا میں پارسی مذہب کو بدھ مت اور عیسائیت کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلی صدی میں بدھ مت کے یہاں کافی پیرو ہوگئے اور ورودِ اسلام کے کافی عرصہ بعد بھی بدھ مورتیاں بخارا کے بازاروں میں فروخت ہوتی رہیں۔ عربوں نے آمد پر یہاں زر و سیم کی مورتیوں سے مزین منادر دیکھے جن کے دروازوں پر دیو مالائی اشکال کندہ تھیں۔ اسلام سے پہلے عیسائیت بھی وسط ایشیا پہنچی اور ۴۲۰ء میں مرو میں ایک اسقف اعظم اور ۵۰۳ تا ۵۲۰ میں سمرقند میں ایک اسقف اعظم تھا جن کے حلقۂ اثر میں بڑے بڑے مذہبی اجتماعات ہوتے تھے جو تیرھویں صدی تک جاری رہے۔

"عربوں کی آمد اور آریوں کے قبولِ اسلام سے پہلے ہی آریہ' ترک خانہ بدوشوں (کافر یا بدھ مت یا شامانیت کے پیرو) کے حملے کے بعد حکومت بخارا سے محروم ہوگئے تھے جو شمال سے جیحوں اور سیحوں کے ممالک پر حاوی ہوگئے تھے۔ انہوں نے دوسری صدی میں بلخ تباہ کیا اور چھٹی ساتویں صدی میں وہ سیلاب کی طرح بخارا پر چھاگئے اور آریوں کو یکسر بے دست و پا کر دیا۔ ۶۶۶ء میں عربوں نے بخارا میں آمد پر یہاں ترکوں کا دور دورہ پایا اور وہ ربیع ابن الحارث کے تحت یہاں اسلام بزور پھیلانے لگے"۔

('امیر بخارا اور اس کا ملک' از او۔ اولف سین لندن' ولیم ہائن مین' ۱۹۱۱'
ص ۳۶۵)

آبپاشی اور باقاعدہ زراعت (جو اوستائی عقائد کے لحاظ سے مویشی پروری کی طرح مقدس ہے) ثقہ روایت کے مطابق انہی کی آوردہ ہے۔ وہ بخارا کے اہل ذہانت تھے اور ہیں اور اب بھی اپنے آپ کو بخارا کے اصلی باشندے اور اوزبکوں کو غاصب سمجھتے ہیں۔ جنہوں نے نخلستان بخارا کوہ الطائی کے شمال مشرق سے اور ترکستان سے ہتھیا لیا ہے اور تواجیک کو مشرق کی طرف ترا تے گیں اور پامیر کی وادیوں میں دھکیل دیا ہے جہاں وہ اب بکثرت آباد ہیں۔ یہ روایت اس حقیقت کے عین مطابق ہے کہ تواجیک بہت بڑی تعداد میں افغانستان و بلوچستان میں آباد ہیں۔ یہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ ترکوں نے دوسری صدی میں بلخ کو تباہ کر دیا اور اگر یہ حملہ کارگر تھا تو اغلب ہے کہ تواجیک ترک دباؤ کے تحت مغربی پامیر کی تنگ اور فرومایہ وادیوں میں آنے پر مجبور ہوئے ہوں جہاں ایک زراعت کار طوعاً وکرہاً ہی آتا ہے۔ عرب حملے اور توسیع اسلام کے دوران تواجیک کو مزید مشرق کی طرف ہٹنا پڑا، لیکن وہ اپنے قدیم اوستائی مذہب یعنی نار و نور کے عقیدے پر کاربند رہے اور پامیر کی تنگ وادیوں میں بھی اسے برقرار رکھا جنہیں قدرت نے فلک بوس پہاڑوں سے قلعہ بند کر رکھا ہے"۔[1]

"تاجیک بخارا میں بھی اپنی قومیت پر فخر و مباہات کرتا ہے اور اب بھی اپنے وطن سابقہ یعنی خراسان (خور = سورج اور استان = خطہ، خطۂ خورشید یا مشرق) کی سرحدوں کو یاد کرتا ہے۔ تواجیک نے معروف ترین اساتذہ، مدبرین اور عمال پیدا کئے ہیں۔ ملا قریباً سب کے سب تاجیک ہیں۔ دانشوری تواجیک سے ہی مخصوص ہے لیکن ان میں بھیانک ترین برائیاں بھی ہیں۔ نخلستان بخارا میں تراجیک اکثریت میں ہیں۔ زرافشاں کی گذرگاہ کے درمیانی خطہ میں بھی وہ کافی تعداد میں ہیں۔ بخارا کے ایک بہترین پہاڑی صوبہ، قراتگین میں وہی آبادی

---

[1] "دریائے قند کی وادی میں نرے پہاڑی تاجیک یا گلتشہ آباد ہیں۔ میں جتنے پہاڑی تواجیک سے ملا، اُن میں سے کوئی بھی لفظ گلتشہ نہ سمجھتا تھا۔" ایضاً، ص ۲۲۔

کا سبز وا عظم ہیں۔ ان کے علاوہ وہ دَرواس، روشان، شُغنان، گران اور داخن کے صوبوں میں بھی آباد ہیں اور تخارستان شیر آباد میں وہ کہیں کہیں گروہوں کی صورت میں ملتے ہیں۔ ان کے مقابلے پر اوزبک حصار، کرشی، شہر سبس، کتن، ہسر، کرکی، چرجوئی، چرکتشی، قلاب وغیرہ کی آبادی کا اہم حصہ ہیں۔ بخارا میں تراجیک کی تعداد کا اندازہ کل آبادی کا ایک تہائی ہے"۔

"لفظ تاجیک کا معنی عرب[1] ہوسکتا ہے اور کچھ مقامی لوگ خود کہتے ہیں کہ وہ بابل سے یہاں آئے۔ یہ واقعی درست ہے کہ ہجرت کی پہلی صدی کے آخری ۲۵ سالوں میں حجاج کے تحت اہل بیت پر بہت ظلم ڈھائے گئے لہٰذا ان کے بہت سے افراد ماوراالنہر بھاگ آئے اور وہاں مقامی آبادی سے خلط ملط ہوگئے۔ لہٰذا عین ممکن ہے کہ بعض تراجیک اپنا شجرۂ نسب ان پناہ گزینوں اور اُن کے واسطے سے آنحضورؐ سے ملائیں جس کی وجہ سے وہ سیّد یا سیّت کہلاتے ہیں۔ یہاں تک تو یہ روایت قرین قیاس ہے لیکن اس سے آگے اسے محض خیال آرائی ہی کہا جاسکتا ہے۔ افغانستان میں تاجیک کو دہقان (کسان) یا دہوار (قصبے کا مکین) کہا جاتا ہے لیکن بخارا میں یہ القاب تراجیک کے علاوہ تمام کاشت کاروں اور خانہ گزینوں کے لئے بھی استعمال ہوتے ہیں"۔

"لیکن اگر ہم تمام ایرانی النسل باشندوں کو اس بنا پر تاجیک کہیں کہ بخارا کا ہر ایرانی اپنے

---

[1] چند عرب جو بخارا میں رہتے ہیں، اوّلین فاتحین کی اولاد ہیں جو یہاں اسلام کے نقیب تھے یا تیموری جلوداروں کی اولاد ہیں۔ وہ وادی زرفشاں میں سمرقند کے قریب اور بخارا میں دَردَدسی کے قریب خطہ گرگان اور امو دریا پر اُبلیک کے قریب رہتے ہیں۔ پہلے وہ قدیم انداز کے خیموں میں رہتے تھے لیکن اب دیگر مقامیوں کی طرح مکانوں میں رہتے ہیں اور درّی بانی، گلہ پروری اور اسپ فروشی کرتے ہیں۔ وہ اب بھی عربی نما زبان بولتے ہیں اور اپنے سخت سیاہ چہروں اور بالوں کی وجہ سے آسانی سے پہچانے جاسکتے ہیں"۔ ایضاً۔ ص ؟۔

آپ کو تاجیک ہی کہتا ہے تو ہمیں بخاری تواجیک کو دو حصوں میں بانٹنا ہوگا۔ ایک حصہ وہ ہے جو پامیر کی وادیوں اور مشرقی بخاری پہاڑوں کے تواجیک پر مشتمل ہے جو قدیم حسبی ونسبی ایرانی ہیں کیونکہ وہ ازبکوں سے خلط ملط نہیں ہوئے اور نہ ہی اُن سے رشتوں ناطوں کے روادار ہے۔ دُوسرا حصہ نخلستان بخارا اور خطۂ ہموار کے تواجیک پر مشتمل ہے جو ترکوں اور ایران سے آور دہ کثیر التعداد غلاموں سے شیر و شکر ہوگئے اور اب ایرانی ہونے کے باوجود ان میں غیر نسلی عناصر موجود ہیں"۔

"عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اب نخلستان بخارا میں اصلی تواجیک آٹے میں نمک کے ہی برابر ہوں گے لیکن ازبک اب بھی تواجیک اور ایرانیوں میں تمیز کر سکتے ہیں"۔

پہاڑی تاجیک (اسے کبھی کبھی گلفتشہ بھی کہتے ہیں) موجودہ ایرانیوں سے بہت حد تک ملتا جلتا ہے جو بیضوی چہروں، تیکھے اور خوبصورت نقوش، بڑی سیدھی ناک، جو گاہے ملبے یہودی وضع کی معلوم ہوتی ہے۔ کالے بالوں اور گھنی داڑھیوں کے لوگ ہیں لیکن ان کے نقوش موجودہ ایرانیوں کی نسبت ذرا کھردرے ہیں۔ پہاڑی زندگی کی صعوبتوں نے اسے پھرتیلا، مضبوط اور مستقل مزاج بنا دیا ہے اور دُنیا کے تہذیبی مراکز سے دُوری کی وجہ سے وہ اُن بہت سی برائیوں اور غیر مستحسن خصوصیتوں سے بچ گئے ہیں جو میدانی تواجیک میں سرایت کر گئی ہیں۔ پہاڑی تواجیک بہت پُر امن کسان ہیں۔ ضرورت پڑنے پر وہ نیم خانہ بدوش ہیں لیکن عموماً وہ صرف زراعت پر بسر اوقات کرتے ہیں۔ وہ بہت مہمان نواز ہیں اور ہر وقت مدد کے لئے کمربستہ رہتے ہیں اور ہر بڑے خانہ دار کے ہاں (جو عموماً قاسی یعنی قاضی یا اکسکل ہوتے ہیں) ایک خاص کمرہ مہمان خانہ ہوتا ہے جہاں وہ نوواردوں کی پذیرائی کرتا ہے۔ بعض مصنفین کے مطابق اُن کے ہاں کبھی غلامی کا وجود نہیں رہا لیکن یہ غلط ہے کیونکہ لفظ کُول المعنی غلام یہاں موجود ہے گو یہاں غلامی اتنی شدید کبھی نہیں رہی جتنی بخارا کے دُوسرے حصوں میں رہی۔ قرآن حکیم کی تعلیمات کے باوجود یہاں غلامی کا رواج رہا حتےٰ کہ رُوسیوں نے

وَسطِ ایشیا کو فتح کر لیا۔ پہاڑی تواجیک عموماً واحدالزّوجہ لوگ ہیں اور اس کی ایک وجہ ان کی عدمِ استطاعت ہے۔ عورتیں پردہ نہیں کرتیں۔ وہ کٹّر قسم کے مسلمان نہیں ہیں اور خاص طور پر یہاں اوستائی مذہب کی رسمیں اب بھی جاری و ساری ہیں۔"[1]

مَیدانی تواجیک اپنے پہاڑی بھائیوں سے ملتے جُلتے ہیں۔ وہ موٹے تازے ہیں۔ طویل الکاسہ ہیں اور سیاہ بال اور آنکھوں کے مالک ہیں۔ ناک، مُنہ اور آنکھیں بہت خوشنما ہیں۔ ناک شاذ و نادر خمدار ہوتی ہے اور عموماً سیدھی اور اوزبکوں کی نسبت زیادہ نمایاں۔ اُن کا مُنہ، آنکھیں اور پاؤں بڑے بڑے ہوتے ہیں اور اُن کے سارے جسم پر بال ہوتے ہیں۔ میدانوں کی ایرانی نسل غیر نسلی عناصر بالخصوص ترکوں سے خَلط مَلط ہو ئی ہے لیکن پھر بھی ایرانی

---

[1] "ہم یقینی طور پر جانتے ہیں کہ قدیم ایرانی مذہب نار و نور کے اہم مراکز بخارا میں تھے اور زردشت یا بِرّاق کے پہلے پیرو اس کے ممکنہ وطن اُترا پیتے نل (موجودہ آذربائیجان یا آذر بائیگان = محافظ نار) سے نکلنے کے بعد زرفشاں کے کناروں پر ہی کے لوگ تھے"۔۔۔۔ "بخارا کی موجودہ پارسی رسموں میں بہاراں اور نوروز کے جشن شامل ہیں اور الگ الگ ستونوں کو گلدستہ ہائے خوشہ سے تاجپوش کرنا بھی جو پامیر کی وادیوں میں رائج ہے۔ سال میں ایک دن تشار شمبے سُنّی آگ جلائی جاتی ہے جس پر سے لوگ کودتے ہیں اور ظروف توڑے جاتے ہیں تاکہ بدرُوحیں دُور ہوں اور گناہ اور بیماری سے نجات ہو۔ یہ صرف دُور اُفتادہ خطّوں میں رائج ہے کیونکہ علما و فقہا ء اس کے مخالف ہیں اور ہر بخاری استفسار پر اس سے انکار کرتا ہے گویا یہ رسم خفیہ طور پر جاری ہے۔ پہاڑی تواجیک قندیل کو مٹّی سے بُجھانا پسند کرتے ہیں تاکہ شعلۂ مقدّس انکے سانس سے آلودہ نہ ہو۔ بیماروں کو آگ کے گرد گھماتے ہیں یا قندیل جلا کر ان کے چہرں کے سامنے کرتے ہیں۔ نوزائیدہ کے جھُولے پر ۴۰ دن تک قندیل جلتی ہے تاکہ بھُوت پریت دُور ہوں۔ مزاروں پر بھی قندیلیں جلائی جاتی ہیں۔۔۔۔۔۔ اور بخارا میں اب بھی پارسی مذہب کے اَن گِنت جنّوں بھُوتوں کا راج ہے"۔ ایضاً، ص ۳۶۵ و ۳۶۷۔

خصائص اتنے واضح ہیں کہ تاجیک اور ازبک میں صاف طور پر تمیز ہو سکتی ہے کیونکہ اوّل الذکر آخر الذّکر سے زیادہ شستہ ہوتا ہے۔ وہ ازبک سے زیادہ شائستہ، ستائش گو اور موقعہ شناس ہے لیکن اس سے زیادہ چالباز اور ناقابل اعتبار ہوتا ہے۔ وہ بہت زیادہ زمانہ ساز ہوتا ہے اور اپنی گفتگو میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتا ہے تاکہ وہ تصفیہ طلب مسئلہ سے پہلو تہی کر سکے۔ اُس کے ساتھ داد و ستد کا معاملہ خوشگوار نہیں ہوتا۔"

"میدانی تاجیک کا کوئی خاص ملک نہیں اور پہاڑی تاجیک بخارا کو اپنا وطن نہیں سمجھتے۔ وہ اپنے آپ کو قراتگینی، دَرواسی، شغنانی وغیرہ کہتے ہیں لیکن ان علاقوں کا بخارا سے گہرا رابطہ ابھی حال ہی میں قائم ہوا ہے۔ میدانی تاجیک کی زبان ایک فارسی بولی ہے جو موجودہ فارسی سے صرف اتنی ہی مختلف ہے کہ اس کے ذریعے ایک آدمی تھوڑے ہی عرصہ بعد تاجیکی سیکھ لیتا ہے گو اس میں ازبکی لغت کی بھی خاصی آمیزش ہے۔ تاجیکی بخارا کی سرکاری زبان ہے اور علما و فضلا، اور معزّز و مہذّب طبقوں کا ذریعۂ اظہار ہے جبکہ ازبکی بخارا کے نچلے طبقوں اور سوداگروں کی زبان ہے۔ جُوں جُوں قراتگین کے جنوب میں پامیر کے صوبوں میں جائیں، دُوں دُوں زبان زیادہ پرانی فارسی ہوتی جاتی ہے۔ شغنان اور وخان میں قدیم فارسی بولیاں بولی جاتی ہیں جنہیں مہذّب بخاری تاجیک بھی بمشکل سمجھ پاتا ہے۔ عملاً تاجیک میں کوئی قبائلی رَوایات نہیں ہیں اور علم الانساب میں تو انہیں برائے نام ہی دلچسپی ہے۔"

"تاجیک کی گھریلو زندگی ازبکوں کی نسبت زیادہ خوشگوار ہے۔ مرد اکثر لاڈ پیار سے اپنی بیویوں کو اتنا بگاڑ دیتا ہے کہ وہ اشیائے تعیّش بن جاتی ہیں[1]۔ لیکن ازبک عورتوں کو عموماً بہت محنت کرنا پڑتی ہے۔ تاجیک بچّوں کو والدین سے حجاب اور ان کا احترام سکھایا جاتا ہے لیکن ازبک بچّے اکثر اپنے والدین پر برس پڑتے ہیں اور میں نے بچشم خود امیر بخارا کے

---

[1] دیکھئے حصّہ چہارم، باب اوّل۔

فرستادہ ایک اوزبک کو بیگ، روشان وشغنان پر گرم ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ تاجیک بحث مباحثہ، دھواں دھار تقریروں اور مذاکرات کا رسیا ہے۔ اکثر لعن طعن بھی ہوتی ہے۔ لیکن وہ شاذ و نادر ہی ہاتھا پائی کرتے ہیں۔ وحشیانہ حملے اور قتل تاجیک میں معدوم ہیں"۔

"ان کی خواتین بخارا کی حسین ترین خواتین میں شمار ہوتی ہیں۔ اوزبکوں کی طرح انکے قد بھی مردوں سے چھوٹے ہوتے ہیں۔ اُن کے چہرے بیضوی، آنکھیں بڑی بڑی، سیاہ اور بادام صورت، بال کوئلے کی مانند کالے اور جلد زرد (کیونکہ وہ خانہ نشین ہوتی ہیں یا چہرے پر نقاب اوڑھتی ہیں) ہوتی ہے اور وہ ایرانی عورتوں کی طرح جلد ہی موٹی ہو جاتی ہیں۔ بہت سی پہاڑی تاجیک مستورات اپنے نفیس و دلرُبا خدوخال کی وجہ سے واقعی حسن وجمال کا پیکر ہیں۔ بخارا میں شغنانی عورتیں بجا طور پر حسن کا مثالی پیکر سمجھی جاتی ہیں کیونکہ وہ بخاری نظریۂ حسن پر پوری اُترتی ہیں"۔

اقتباس از "امیر بخارا اور اس کا ملک" از او۔ اولف سین، لندن، ولیم ہائن مین، ۱۹۱۱، باب پنجم۔

ضمیمہ چہارم

عراق و شام کے جاٹ

ضمیمہ چہارم

عراق وشام کے جاٹ

مشہور و معروف مستشرق ایم ۔ جے ۔ ڈی ۔ گوئیجے نے مُسلمان مصنّفین سے جواٹ (زط) کے متعلّق نہایت دلچسپ اور عجیب وغریب معلومات جمع کی ہیں جو ایمسٹرڈم کی اکیڈمی کے جریدہ ۱۸۷۵ء میں بہ عنوان "تاریخِ جپسیان پر ایک مضمون" چھپی ہیں۔

۷۶۸ء میں خلیفۃ المنصور کے دورِ حکومت میں میدڈا کو بحیرۂ قلزم سے گذر کر مکۂ معظمہ کی بندرگاہ جدّہ پر قابض ہو گئے۔ اُس وقت بحرین میں اَلقطر کے مقام پر ایک جاٹ (زط) بستی تھی جو ساحلِ سمندر پر واقع تھی۔ بلاذری کے ہاں ایک اور ہندی قبیلہ سیاہ بیجا کا ذکر ہے جو ورودِ اسلام سے پہلے سواحل پر آباد تھا اور زط اپنے مویشی طفوف میں چراتے تھے، جو بابل کے گرد و نواح میں فرات کی نشیبی زمینیں تھیں۔ بابل کے قریب ہی بطحا (فرات کی دلدلی زمین) میں ایک قدیم نہر مدّتوں تک نہر زط کہلاتی رہی۔ خوزستان میں بھی ان لوگوں کی ایک بستی یا نوآبادی تھی۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ (۶۳۵-۴۴ء) میں مفتوحہ ممالک میں بلاذری کے مُطابق ملک زط بھی شامل تھا۔ یہ علاقہ رام ہرمزا اور ارّاجان کے درمیان واقع تھا۔ اور جاٹوں کے اخراج کے بعد بھی یہ بہت دیر تک اسی نام سے مشہور رہا۔ استخری اور ابنِ حوقل اسے وسیع، گنجان آباد اور زرخیز بتاتے ہیں۔

بلاذری بیان کرتا ہے کہ خلیفہ معاویہ نے ۶۶۹ یا ۶۷۰ء میں جاٹوں اور سیاہ بیجا کے کئی خاندانوں کو بصرہ سے انطاکیہ اور شام کے دیگر ساحلی قصبات میں منتقل کر دیا۔ تیسری صدی ہجری کے انطاکیہ کا ایک حصّہ 'جاٹوں کا حصّہ' کہلاتا تھا اور ان لوگوں کی اولاد بُوقا میں بھی رہتی تھی۔ ولید اوّل اور یزید دوم نے شام میں انہی کی دوسری اور تیسری بستی بھی بنوائی۔

ہارون الرّشید کے بیٹوں، الامین اور المامون کے درمیان خانہ جنگی کی وجہ سے جو لاقانونی پھیلی اس کے دوران کسکر کے نشیبی علاقوں کے جاٹوں نے زیریں دجلہ کے خطّوں پر قبضہ کر لیا۔ اُنہوں نے بحری اور برّی شاہراہوں پر بھی اپنا تصرّف جمالیا اور جہازوں، کاروانوں اور کسکر کے غلّہ گوداموں کو لوٹنا شروع کیا۔ ۸۲۰ء تک یہ حالت ہوگئی کہ لوگ اُن کے علاقہ سے گذرتے ہوئے ڈرنے لگے اور بغداد کے لئے لدے ہوئے جہاز بصرہ کی بندرگاہ سے نکلنے کی جرأت نہ کر سکے۔

۸۲۰ اور ۸۲۱ میں جاٹوں کے خلاف مہمّات روانہ کی گئیں جو ناکام ہوگئیں اور وقارِ خلافت کو دھچکا لگا۔ یہ صورت حال ۸۳۴ء تک برقرار رہی جب المامون کے جانشین نے بالآخر ان سے نمٹنے کا فیصلہ کر لیا۔ دلدلوں میں نو ماہ کی کاروائیوں کے بعد ان قانون شکنوں نے اس شرط پر ہتھیار ڈال دیئے کہ ان کے جان و مال محفوظ رہیں گے۔ اُن کی تعداد ۲۷۰۰۰ بتائی گئی ہے جن میں سے ۱۲۰۰۰ جنگ آزما تھے۔ اُنہیں پہلے خانقین اور پھر شمالی سرحدِ شام پر واقع اُناذربہ (عین الفرب) میں منتقل کر دیا گیا۔

بلاذری لکھتا ہے کہ اُن کی زیادہ تر تعداد عین الفرب میں بھیج دی گئی لیکن کچھ حصّہ خانقین اور شامی سرحد کے دیگر مقامات پر بھی رکھا گیا۔

۸۵۵ء میں (طبری اور ابن الاطہر کے مطابق) جب بازنطینیوں نے عین الفرب پر حملہ کیا تو سب جاٹ قیدی پکڑ لئے اور انہیں ان کی عورتوں، بچّوں، بھینسوں اور مویشیوں

سمیت اپنے ملک کو لے گئے۔

سندھ میں بلاذری 'بدھا کے جاٹوں' کا ذکر کرتا ہے۔ وہ دریائے سندھ کے مغرب میں رہتے تھے اور شتر بانی ان کا پیشہ تھا۔ وہ اپنی پیداوار قند ابیل (موجودہ گنداوا) کی منڈی میں لاتے تھے۔ مید ملتان سے سمندر تک دریائے سندھ کے کناروں پر آباد تھے اور وہ اور جاٹ ایک ہی جیسے تھے۔ اندرونِ ملک کے مید بھیڑ پالتے تھے لیکن ان کے ساحلی بھائی قزاق تھے۔ وہ کورک (کُرک) کہلاتے تھے اور وہ دریا نورد لوگ تھے۔

عربوں نے جاٹ کو زط میں بدل دیا۔ عربی لغت 'القاموس' میں درج ہے:۔
"زُط جٹ کا معرّب ہے جو ہندی الاصل لوگ ہیں۔ اس لفظ کو زَط کہنا بھی صحیح ہے"۔ لغت "محیط" میں درج ہے: "زط' ہندوستان کی ایک نسل 'جٹ' کا معرّب"۔ وُلرز نے اپنی فارسی ڈکشنری میں ایک مقامی فارسی لغت سے مندرجہ ذیل اقتباس دیا ہے:۔

"جاٹ نامی قبیلہ ہندوستان کے صحرائی باشندوں میں سے ہے جو بدنام ہیں"۔

(ہندوستان کے جپسی؛ از ڈیوڈ میک رِشی۔
کیگن پال، ٹرینچ اینڈ کمپنی،
لنڈن ۱۸۶۶ء)

نساء ٹریڈرز
جناح کلاتھ مارکیٹ ۰ کوئٹہ

بلوچستان، سندھ، صوبہ سرحد و ملحقہ علاقوں میں اٹھارھویں صدی اور اس سے بھی پہلے ادوار کے تاریخی، جغرافیائی، سماجی، ثقافتی اور قبائلی حالات اور واقعات سے متعلق ہم نے انگریزی زبان میں متعدد کتب شائع کی ہیں۔ ان کتب کے اُردُو تراجم کا کام بھی ہم نے شروع کر دیا ہے۔ اس پروگرام کے تحت جون سنہ ۱۹۸۰ء تک ہماری مندرجہ ذیل کتب شائع ہو جائیں گی۔

- بلوچستان تاریخ کے آئینے میں ... مصنفہ ... جسٹس میر خدا بخش بجارانی مری ... ترجمہ ... پروفیسر سعید احمد رفیق
- بلوچ قبائل .... مصنفہ ... ایم۔ لونگ ورتھ ڈیمز .... ترجمہ ... کامل القادری
- شمال مغربی پاکستان اور برطانوی سامراج .. مصنفہ ... لفٹیننٹ جنرل سر جارج میکمن .. ترجمہ .. پروفیسر ایم۔ انور رومان
- بلوچ قوم کی تاریخ .... مصنفہ ... محمد سردار خان بلوچ ..... ترجمہ ... پروفیسر ایم۔ انور رومان
- سیستان .... مصنفہ ... جی۔ پی ٹیٹ ..... ترجمہ .. پروفیسر ایم انور رومان
- سوانح حیات سر رابرٹ سنڈیمن .. مصنفہ .. تھامس ہنری تھارنٹن .... ترجمہ ... پروفیسر خلیل صدیقی
- قلات اٹھارہویں صدی میں .. مصنفہ .. گورنمنٹ ریکارڈ سے انتخاب .. ترجمہ ... پروفیسر ایم۔ آر۔ حق
- وسط ایشیا میں روس کے عزائم ... مصنفہ .. جوزف پوپوسکی .... ترجمہ .. ... نذیر حق
- سفر نامہ سندھ، بلوچستان .... مصنفہ ... ہنری پوٹنجر. ... ترجمہ ... پروفیسر ایم انور رومان
- مشرقی افغانستان کے خانہ بدوش .. مصنفہ .. کیپٹن جے اے رابنسن .. ترجمہ .. پروفیسر

سول ڈسٹری بیوٹرز:- میسرز گوشہ ادب، سرکلر روڈ، کوئٹہ
(پاکستان) فون ۷۵۰۰۳